ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

جولائی-اگست ۲۰۱۸ء | جلد ۱۰ | شمارہ ۱-۲ | ذی قعدہ-ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9808850029
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	اللہ کو کیسے لوگ مطلوب ہیں	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	فکری زوایے:	مدیر	۳
۴۔	گوشۂ ترکی	ترکی ماضی، حال اور مستقبل کے آئینہ میں	مولانا سید سلمان حسینی ندوی	۱۶
۵۔	//	نورسی تحریک اور ترک معاشرہ پر اس کے اثرات	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۵
۶۔	//	امریکہ و یورپ اردوغان کو کیوں روکنا چاہتے ہیں؟	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن (پاکستان)	۲۹
۷۔	//	عالم اسلام کی موجودہ صورت حال میں ترکی قیادت	مجیب الرحمٰن عتیق ندوی	۳۳
۸۔	//	ترکی میں اسلامی اقدار کی بحالی	محمد نفیس خاں ندوی	۴۰
۹۔	//	ترکی میں ہم جنس پرستوں کا جلوس؟	شیخ اسماعیل کرخی ندوی	۴۹
۱۰۔	//	ترکی میں جسم فروشی، پروپیگنڈہ اور حقائق	//	۵۲
۱۱۔	//	ترکی کا نمونہ اور ہندوستانی مسلمان	محمد فرید حبیب ندوی	۵۴
۱۲۔	//	ترکی میں موجودہ تبدیلی کے اسباب	ابوطالب ندوی	۵۷
۱۳۔	//	اردوغان، ترقیات، گولن اور عالمی میڈیا کے پروپیگنڈے	سمیع اللہ خان	۶۱
۱۴۔	//	معاہدہ لوزان	انجینئر شفیع اللہ خان	۶۶
۱۵۔	//	خلافت عثمانیہ اور ترکی	محسن خان ندوی	۷۱
۱۶۔	//	ترکی کی اسلامی تحریک-ایک تجزیاتی مطالعہ	عنایت اللہ وانی ندوی	۷۵
۱۷۔	//	کامیاب اردوغان	ترجمہ: مفتی محمد اجمل ندوی	۷۸
۱۸۔	//	عربوں میں اردوغان کی محبوبیت کے اسباب	ترجمہ: محمد عالم ندوی	۷۹
۱۹۔	//	اردوغان کی کامیابی مخالفین کی نظر میں	ترجمہ: فیض الاسلام ندوی	۸۱
۲۰۔	"رجب طیب اردوغان"	اردو میں ایک نئی کتاب	مولانا نذر الحفیظ ندوی	۸۳
۲۱۔	//	تاثرات	مولانا علاء الدین ندوی	۸۴
۲۲۔	//	مرد بیمار ترکی کو مدمقابل لانے والا مرد آہن	حنیف خان	۸۷
۲۳۔	//	کیا طیب اردوغان کا سفر جاری رہے گا	شکیل رشید	۹۱
۲۴۔	المیہ	عالم اسلام پر نفاق کے گہرے بادل	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۹۵
۲۵۔	شکوہ	یونیورسٹی کے مسلم اساتذہ.....	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۰۵
۲۶۔	اسلامی تعلیمات	حج بیت اللہ	ابوالفضل عبداللہ	۱۱۱
۲۷۔	تعلیم وتربیت	تربیت اولاد-چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۱۱۴
۲۸۔	تعارف و تبصرہ	عصر حاضر اور نظریہ جہاد	//	۱۲۰
۲۹۔	//	آسان ترجمہ وتفسیر قرآن	//	۱۲۳
۳۰۔	//	ختم نبوت کا قرآنی تصور	محمد فرید حبیب ندوی	۱۲۷
۳۱۔	//	تضمین بر کلام اقبال	رہبر تابانی	

[نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

نوٹ: پہلے سے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر جولائی کا شمارہ اگست کے ساتھ ضم ہوگا، پھر بھی ہم دو ماہ کا شمارہ ایک ساتھ نکالنے پر قارئین سے معذرت خواہ ہیں، امید ہے کہ ہماری انتظامی اور مالی پریشانیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قارئین معذرت قبول فرمائیں گے۔

خیال ہوا کہ جب دو ماہ کا شمارہ مشترک ہے تو کیوں نہ اسے ''ترکی نمبر'' کے طور پر نکالا جائے، چنانچہ عناوین کی ایک فہرست بنا کر متعدد اہل قلم حضرات کو ارسال کی گئی، مگر ایک ''نمبر'' کو جیسا ہونا چاہیے اس کے مطابق مضامین موصول نہ ہو سکے، وجہ شاید اس کی قلت وقت تھی، کیوں کہ صرف ۱۵ دن کا وقت دیا گیا تھا، بہر حال جو کچھ موصول ہوا اس کو ہم ''گوشۂ ترکی'' سے معنون کر کے شامل اشاعت کر رہے ہیں، یہ گوشہ ۹۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں اگر چہ ایک خاص نمبر کے معیار کا مواد نہ ہو مگر ترکی کے ماضی و حال اور مستقبل کے سلسلہ میں خاطر خواہ مواد موجود ہے، ساتھ ہی صحیح موقف کی مدلل ترجمانی ہو گئی ہے، اس میں رمضان سے پہلے شائع ہونے والی کتاب ''رجب طیب اردوغان'' پر بھی کئی تبصرے کر دیے گئے ہیں جس سے اس گوشہ کی اہمیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے، اس کے علاوہ بھی جو مضامین ہیں وہ اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔

امید ہے کہ قارئین پسند فرمائیں گے اور اپنے تاثرات سے ضرور مطلع فرمائیں گے، نیز ہمارے ادارے اور اس رسالے کو اپنے تعاون کے مصارف میں اولین مصرف سمجھیں گے۔ والسلام۔ (ادارہ)

ملک کے حالات اور ہمارا رویہ:

وطن عزیز ان دنوں جس تشویشناک صورت حال سے گزر رہا ہے، اس کا اندازہ ہر کس و ناکس کو ہے، رونا تقریباً سبھی لوگ رو رہے ہیں، لیکن سچ پوچھیے تو حل کسی کے پاس نہیں ہے، کس کس پوشاک میں سنگھ کے ہرکارے ہمارے درمیان ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں اس کا ہمیں اندازہ بھی نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا، کیوں کہ جو قوم اندھ بھکتی پر آمادہ ہو جائے اور تجزیہ و تحقیق سے کوسوں دور ہو جائے وہ بآسانی مخالفین کا لقمۂ تر بن جاتی ہے، حالانکہ ہمیں تو حکم دیا گیا تھا تحقیق و تجزیے کا یا ایها الذین آمنوا إن جاء کم فاسق بنبإ فتبینوا أن تصیبوا قوما بجهالة فتصبحوا علی مافعلتم نادمین، (سورہ حجرات:۶) (ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر متقی (جو احکام شریعت کی خلاف ورزی کرتا رہتا ہے) کوئی خبر لے کر آئے، تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ (اس کی بات اور بے بنیاد اطلاع پر اعتماد کر کے) تم کچھ لوگوں کے خلاف نادانی میں کوئی اقدام کر بیٹھو، اور پھر اپنے کئے پر پشیمانی کا سامنا کرو)۔ میڈیا کی کرم فرمائی پہلے ہی کیا کم تھی، اب تو سوشل میڈیا نے ظلم و ستم، جنگ و جدل اور مکر و فریب کی ساری حدیں پار کر دی ہیں، ایسے ہی نیوز پورٹل ہیں کہ خدا کی پناہ، جن میں بعض تو نمایاں طور پر ننگِ ملت اور ننگِ دین ہیں، وہ ما یلفظ من قول إلا لدیه رقیب عتید سے بالکل بے پروا ہو کر اپنی ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں، مسلم گھرانے

میں پیدا ہوئے ہیں لیکن پیٹ کی خاطر ان کی ہمدردیاں مسلم دشمنوں کے ساتھ ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے تیر ونشتر اور جن کے تخریبی ذہن وقلم سے نہ کوئی شخصیت محفوظ ہے اور نہ تنظیم، نہ کوئی جماعت بچی ہے اور نہ کوئی جمعیت۔

ایسے دور میں جب دیواریں بھی سننے لگیں اور پھر بات کو بتنگڑ بنایا جانے لگے، ہمارا رویہ بہت محتاط اور منصوبہ بند ہونا چاہیے، بدقسمتی سے جب سے مودی حکومت آئی ہے تب سے مسلمان مختلف بحثوں میں الجھے رہے ہیں، بلکہ اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ وہ موضوع بحث بھی بنے ہیں اور باہم دست وگریباں بھی رہے ہیں، جب سے یہ حکومت بنی تب سے خوف وہراس کا ماحول پیدا کیا جانے لگا، ناامیدیوں کے چرچے ہونے لگے، ان کی طرف سے کم ہماری طرف سے زیادہ فرقہ پرستی اور فسطائیت کا ڈھول پیٹا جانے لگا، البتہ اس خوفناک صورت حال سے نکلنے کی تدبیر اور منصوبے کے طور پر ہمارے پاس کوئی روڈ میپ نہیں، جو کچھ کوششیں ہوئیں وہ کارآمد وثمرآور ہونے سے پہلے ہی طشت از بام کی گئیں، اس کے نتیجہ میں انھیں اغوا کرلیا گیا یا ان کا رخ تبدیل کردیا گیا، ہمارے یہاں زمینی سطح کی محنت وکوشش کا کوئی رواج ہی نہیں، جلسوں اور کانفرنسوں سے کم میں ہمارا کوئی کام نہیں چلتا، ہماری دس پانچ افراد پر مشتمل میٹنگ بھی میڈیا کی شاطر نظروں سے محفوظ نہیں رہ پاتی، ہم جو کام کرتے بھی نہیں یا مستقبل میں ان کے ہونے کے امید بھی نہیں ہوتی ان کا تذکرہ بھی میڈیا میں کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کیا ہندو تنظیمیں بھی ہماری طرح اپنی میٹنگوں کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں، کیا ان کے یہاں بھی کانفرنسوں کا دور چلتا ہے، کیا وہ بھی قومی سرمایہ جلسوں کی نذر کرتی ہیں، کیا وہ بھی خوش کن نعروں پر جینے اور مرنے کی قسمیں کھاتی ہیں، کیا آر ایس ایس کی خاموش زمینی محنت ہمارے لیے مثال نہیں، کس طرح اس نے خاموشی کے ساتھ پورے ملک کے سسٹم پر قبضہ کرلیا جس کی وجہ سے اب پورے ملک کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ ''دستور بدل دیا جائے گا''، ''اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو ختم کردیا جائے گا''، ''ملک کو ہندوراشٹر بنادیا جائے گا''، ''ملک کو ہندو پاکستان بنایا جارہا ہے''، ''ملک میں ایک دوسرا ماحول پیدا ہورہا ہے''، ظاہر ہے یہ جملے عام لوگوں کے نہیں ایم، ایل اے، ایم پی، بیوروکریٹس اور نائب صدر جمہوریہ جیسے لوگوں کی زبان سے نکلے ہیں، سپریم کورٹ کے ججوں کو یہ خطرات محسوس ہوئے ہیں تو آخر کیوں؟ اس لیے کہ اب پورے سسٹم میں اس نظریے کے لوگ شامل ہوچکے ہیں، کمالِ خاموشی اور طویل جدوجہد کے بعد شامل ہوئے ہیں۔

افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہم نے اس تقریباً ساڑھے چار سالہ مدت میں صرف خطرات کا ذکر کیا مگر خطرات سے نمٹنے کی تیاری کبھی نہیں کی، البتہ اپنی نادانیوں سے خطرات کو مزید تقویت دینے کا سبب ضرور بن گئے، ہم نے کبھی گھوٹالوں اور حکومت کی دھاندلیوں کو موضوع نہیں بنایا، ہم نے کبھی بھوک مری اور کسانوں کی خودکشی کو موضوع نہیں بنایا، ہم نے کبھی موب لنچنگ جیسے حساس مسئلہ پر احتجاج درج نہیں کرایا، سوامی اگنی ویش جیسے سچ بولنے والے اور انسانیت کے لیے کام کرنے والے اور ظلم کے خلاف لڑنے والے ضعیف العمر کو بھیڑ نے پیٹ دیا تو قبل اس کے کہ اس کو میڈیا میں موضوع بنایا جاتا، اس کو دبانے کے لیے ہمارے ہی ایک شخص نے دوسرا موضوع فراہم کردیا، اور چینل پر لائیو ڈبیٹ میں وہ کام کردیا جس سے لاکھوں غیر کیا اپنے بھی یہ سوچنے لگے کہ مسلمان عورت پر ہاتھ اٹھانے میں یہ مسلمان کتنے غیر محتاط ہیں، یہ کام اس شخص نے کیا جو یہ اسلامی تعلیم بیان کرتا ہے

کہ جنگ کے دوران بھی عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، ایک گھسے پٹے موضوع پر بحث میں حصہ لے کر جو نادانی کی گئی اس کے نتیجہ میں میڈیا نے عنوان قائم کیا ''دے دیا اسلام نے عورت کو اس کا اصل مقام''، ہم نے شریعت پر عمل کرنے کے بجائے شریعت کے تحفظ کا بیڑا اٹھالیا جبکہ وعدۂ الٰہی اور بشارت نبوی اس کے برعکس تھی ان تنصروا الله ينصركم ويثبت اقدامكم اور نبی پاکؐ نے فرمایا تھا احفظ الله يحفظلك، احفظ الله تجده تجاهك (ترمذی ج۴، رقم ۲۵۱۶)۔

حکومت گھوٹالوں پر گھوٹالے کرتی رہی، قتل وخون کے واقعات ہوتے رہے، دستور میں تبدیلی کی تیاری ہوتی رہی دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان پر فسطائی طاقت کا بھگوا پرچم لہرانے لگا اور ہم غفلت کا شکار رہے، ہماری حکمت وبصیرت جانے کب اور کس کام آئے گی، حکومت ہمیں الجھا کر، ہمارے مسائل کو چھیڑ کے، ہمارے قتل کے واقعات کی مدد سے آئندہ انتخابات کی تیاری کرتی رہی اور ہم اس کے دام میں پھنستے رہے، وہ الجھاتی رہی اور ہم الجھتے اور نعرے لگاتے رہے، کبھی ہم نے پلٹ وار کے بارے میں نہیں سوچا، کبھی ہم نے روایتی انداز فکر سے دامن بچا کر مسائل کے حل کی کوشش نہیں کی، حکومت نے کمال عیاری کے ذریعہ ہمیں الجھا کر اور ہمارے جزئی مسائل چھیڑ کر اپنی قوم کو متحد کرلیا، جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ کانگریس کے نادان صدر نے یہ کہہ کر پوری کردی کہ ''ہاں کانگریس مسلمانوں کی پارٹی ہے'' وہ بھی عین انتخابات سے قبل اس بیان سے ہمیں اس کی ایک اور دلیل فراہم کردی کہ کانگریس بھی آر ایس ایس کا ہی ایک مکھوٹا ہے، جن لوگوں نے بھی اس کو سیکولر سمجھنے کی خطا کی ہے انھیں اب تو ہوشیار ہوجانا چاہیے، کانگریس کے ایک سابق وزیر نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا کام یہ کہہ کر کیا کہ ''بی جے پی ملک کو ہندو پاکستان بنانا چاہتی ہے''، ان بیانات کی روشنی میں راقم دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ Polarization ہو چکا ہے، ہندو متحد ہو چکے اور آئندہ میدان بھی بھاجپا ہی کا ہے، یہ بات سمجھنے کی ہے کہ کوئی بھی فکری تنظیم کبھی بھی اپنا ایک چہرہ نہیں رکھتی بلکہ اس کے کئی چہرے ہوتے ہیں، کانگریس بھی اس کا ایک چہرہ تھا، اس نے طویل عرصہ تک اپنی ڈیوٹی کی اور اب اس کے یہ بیانات ہندو پولرائزیشن کے لیے کام کررہے ہیں، الیکشن سے عین قبل اس کی تیاری اور اس کی مہم دیکھ کر کہیں یہ لگتا ہی نہیں کہ وہ پھر سے برسر اقتدار آنا چاہتی ہے۔

پھر ہونا کیا چاہیے اس پر ہم چند سطروں کے بعد گفتگو کریں گے، پہلے یہ اور برداشت کرلیجئے کہ اس پورے دور حکومت میں ہماری پالیسیاں کہیں نہ کہیں ان کے لیے سودمند رہی ہیں، ہمارے یہاں کی یہ عجیب روایت ہے کہ نقد واحتساب سے آنکھیں بند کرلی جاتی ہیں، یا تو کسی کو معصوم ومقدس سمجھا جاتا ہے یا ادنی سی بات کو لے کر کسی کو بھی گمراہ قرار دے دیا جاتا ہے اور اس کے جہنمی ہونے کا فیصلہ کرلیا جاتا ہے، حالانکہ مسلک اعتدال کی داعی اس قوم کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ ہر چیز کا تجزیہ کرے، صحیح بات کی بھرپور تائید کرے اور غلط بات کی سخت نکیر کرے، نقد واحتساب سے کسی کو بالا سمجھنا اور کسی بھی طرح کی نکیر سے دامن بچانے کا نتیجہ نہ صرف ہندوستان میں انتہائی بدتر نظر آرہا ہے بلکہ پوری دنیا میں ملت اسلامیہ بدترین خمیازہ بھگت رہی ہے۔

ذرا سوچیے کہ دارالقضا اس ملک میں کب سے قائم ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی تاریخ کئی دہائیوں پر محیط ہے، خود مسلم پرسنل لا بورڈ تین دہائیوں میں متعدد دارالقضا قائم کرچکا ہے اور کررہا ہے، یہ دارالقضا اپنے اپنے علاقوں میں خدمات انجام دے رہے

ہیں، اس طرح کی نازک صورت حال میں ایک پرانی اسکیم کو جاری رکھنے کے لیے میڈیا کا سہارا لینا، اپنے ہر ایجنڈے کا میڈیا میں اعلان کرنا کہاں کی بصیرت اور کیسی دانشمندی ہے، کیا اگر اس فیصلے کا تذکرہ نہ کیا جاتا کہ ہم دارالقضا ہر جگہ قائم کریں گے تو ان کا قیام عمل میں نہ آتا، یہ الگ بحث ہے کہ دارالقضا کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی یا شرعی عدالتوں کی، اگر شرعی عدالتوں کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی تو یہ اور بھی بے بصیرتی کی دلیل ہے، فسطائی طاقتوں اور اس کے غلام میڈیا کو بہانہ مل گیا، ایک ہفتہ سے یہی موضوع چل رہا ہے، اس کا سہارا لے کر پورے ملک میں مسلمانوں کو علٰحدگی پسند اور سیکولرزم کے دشمن اور وطن دشمن ثابت کرنے کی مہم جاری ہے، ان بحثوں کے ذریعہ ان کا مقصد پورا ہو رہا ہے، ان کے لوگ متحد ہو رہے ہیں، ذرا سوچیے کیا جلتی آگ پر ہم نے تیل چھڑکنے کا کام نہیں کیا، کیا بیٹھے بٹھائے ہم نے بحث کا موضوع نہیں دے دیا، ضرورت تھی کہ ہم خاموشی سے یہ کام کرتے اور کرنا چاہیے، جو پہلے سے موجود ہیں انھیں فعال بنانا چاہیے، ان کی کارکردگی پر غور کرنا چاہیے، عوام کو ان میں اپنے مقدمات لے جانے کی ترغیب دینا چاہیے اور اس صورت حال کو بھی زیر بحث لانا چاہیے کہ بسا اوقات فریقین عالم دین ہوتے ہیں، دونوں دار القضا کے بانی وسرپرست اور اس کے پرزور داعی ہوتے ہیں مگر وہ اپنے آپسی تنازعات کو حل کرنے کے لیے دارالقضا کا رخ نہیں کرتے بلکہ سیکولر عدالتوں میں جاتے ہیں، تو پھر عوام پر کیا اثرات مرتب ہوں گے، بہرحال اس سے قطع نظر اب لوگ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ بھائی یہ شرعی عدالت نہیں کاؤنسلنگ سینٹر ہیں، مگر لوگ خود اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھ رہے ہیں کہ جو جاگ رہا ہو اسے جگانا ممکن نہیں، جگایا اس کو جاتا ہے جو سو رہا ہو، وہ جانتے ہیں کہ انگریزی دور میں قاضی کا فیصلہ تسلیم کیا جاتا تھا، پھر اس کا یہ حق ختم کر دیا گیا، مگر اپنے مذہب کے مطابق اپنے مسائل حل کرنے اور فیصلہ کرانے کا حق ہندوستان کے تمام باشندوں کو حاصل ہے، ان کو یہ بھی معلوم ہے اور خوب معلوم ہے کہ ان دارالقضا کو شرعی عدالت نہیں کہا جاسکتا، یہ کورٹ کے متوازی نہیں ہوسکتیں، اس لیے کہ ان کے پیچھے کوئی قوت نافذہ نہیں ہے، وہ سب جانتے ہیں تو پھر صفائی دینے سے کیا حاصل، ان کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو رہا ہے اور وہ اپنے کام میں مست ومگن ہیں، سوچیے کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک چھوٹی سی میٹنگ سے متعلق خبر مقررہ تاریخ سے ایک ماہ قبل ہی میڈیا کی زینت بن گئی، الگ الگ بیانات آنے لگے اور پھر سوشل میڈیا پر موجود ہماری پوشاک میں سنگھ کے ہرکاروں نے آگ لگانے کا جو کام کیا اس سے اگر اب بھی ہمیں تنبہ نہ ہوا تو ماتم کرنے کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔

رہی بات ان حالات میں کیا کیا جائے تو ہمارے ایک دوست کی یہ بات ہمیں بڑی اچھی لگی کہ ''مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے عنوان پر گفتگو فسادات کے بعد کی جانچ کمیٹیوں اور کمیشن سے زیادہ کچھ نہیں'' کیوں کہ اب تک ہم نے اس سلسلہ میں صرف رپورٹ پیش کی ہے، لفاظی کی ہے، جلسے کیے ہیں، ہنگامہ کیا ہے، دوسروں پر بھروسہ کیا ہے، دوسروں کے دست نگر رہے ہیں، اس تکثیری ملک میں خاص طور پر صرف اپنی کمیونٹی کا ذکر وہ بھی سیاست میں زہر بیچنے کے اعلان واشتہار سے کم نہیں، مگر ہم نے بار بار یہ کام بھی کیا ہے، ضرورت ہے کہ اچھی طرح سوچیں، منصوبہ بندی کریں، حکمت عملی تیار کریں اور سب کو ساتھ لے کر یعنی کسی ایک کے نام کی غلامی کا طوق نہ پہن کر اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں، اس سلسلہ میں ہم بار بار ندائے اعتدال کے صفحات پر

اظہار خیال کر چکے ہیں، اس لیے یہاں پھر ان تفصیلات کا ذکر تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں، فی الحال تو جو صورت حال ہے وہ ہمیں خاموش رہنے، خاموشی کے ساتھ اپنے منصوبوں پر عمل کرنے اور اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے متحدہ لائحہ عمل تیار کرنے کی دعوت دے رہی ہے، ہم اپنے گریبان میں جھانکیں کہ کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں؟ یہاں ہم اپنے ایک دوست کی فیس بک پوسٹ نقل کر کے اپنی گفتگو ختم کرتے ہیں جو انھوں نے ۱۳ جولائی کو لکھا، اس میں ہمارے مسائل کے حل کے لئے بڑے مفید اشارے موجود ہیں:

''جماعت اسلامی کا تنظیمی طریقہ، مولانا سلمان اور مولانا سجاد کی پر جوش روح، پرسنل لا بورڈ جیسا اتحادی فارمولہ، دیوبند کی دینی حمیت، ندوۃ العلماء کا اعتدال، سرسید کا جذبہ تعلیم، اقبال اور مودودی کے سوچنے کا طرز، اردوغان جیسی متبادل حل دینے کی صلاحیت، اربکان کی طرح غالب قوت کو سیاسی طریقوں سے شکست دینے کی حکمت، اخوانیوں جیسا آزمائشوں میں ٹکے رہنے کا ہنر، تبلیغیوں جیسا اصلاح حال کا جنون، شبلی جیسی خود احتسابی کی فکر، مولانا آزاد کی سیاسی دوراندیشی جیسی صفات کو ایک جگہ جمع کرنا اور اپنی اپنی تنظیموں میں پیدا کرنا ہی ہمارے مسائل کا واحد حل ہے۔

ملت اسلامیہ کی بہترین خوبیاں صرف اس لیے بے نفع ہو جاتی ہیں کیوں کہ وہ سب کسی بھی مقام پر آ کر ایک دوسرے سے سنگم نہیں کرتیں، اختلاف کے ساتھ کہیں توافق بھی ہونا چاہیے، متعدد ریل گاڑیاں الگ الگ چلنے کے باوجود مختلف بڑے اسٹیشنوں پر مسافروں کو ایک جگہ جمع بھی کرتی ہیں''۔

''مسلمان اور مغربی تہذیب'':

عرصہ سے ہندوستان کے بعض علمائے عزیمت نے ایک مہم چھیڑ رکھی تھی، کلمہ حق ادا کرنے کی ذمہ داری ادا کر رہے تھے اور پوری امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے تھے، بظاہر ان کی بات بہت بری لگ رہی تھی، لہجہ بھی تلخ محسوس ہوتا تھا، لوگوں کے مفادات پر بھی زد پڑتی تھی، لیکن سطحی فکر و نظر کی وہاں تک رسائی ممکن نہ تھی جہاں تک اصحاب عزیمت کی نظریں دیکھ رہی تھیں، ایک طبقہ تو مسلکی عصبیت بلکہ دنیاوی اور رکیک ترین مقاصد کی خاطر منکر کی نکیر کے بجائے حق کو ناحق اور فساد و باطل کو صلاح و اصلاح ثابت کرنے پر آمادہ تھا، ایک طبقہ ایسے اصحاب علم و دانشوروں کا تھا جو سچائیوں سے خوب واقف تھا، اس کی نظر میں سب کچھ واضح تھا مگر بعض ملی مصالح انھیں زبان کھولنے سے روکتے تھے یا یہ کہیے کہ یہ طبقہ رخصت پر عمل کر رہا تھا، ندائے اعتدال کے صفحات بھی مسلسل شہادت حق دے رہے تھے اور عربوں بالخصوص سعودیہ و امارات کے متعلق اس موقف کی ترجمانی کر رہے تھے جو وقت کی ضرورت بھی تھا، الدین النصیحة کا ترجمان بھی تھا اور دینی فریضہ بھی، شہزادے بہادر کے برسر اقتدار آنے کے بعد جن رنگ رلیوں کا آغاز ہو، شہر بہ شہر رقص و سرور کے اسٹیج سجائے جانے لگے بلکہ سر سر محفل بوس و کنار کے مناظر بھی دیکھے گئے، گویا پورے جزیرۃ العرب کو مغربی و صہیونی رنگ میں رنگ دینے کے لیے تیزی کے ساتھ تبدیلی کا عمل شروع ہوا، صراحت کے ساتھ یہود نوازی کے مظاہرے ہونے لگے اور فلسطینیوں کو اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کے مشورے دیے جانے لگے، عربوں کے ذریعہ

فلسطینیوں سے جائیدادیں خرید کر یہودیوں کو فروخت کرنے کی پرانی روش منظر عام پر آ گئی تو وہ لوگ جو خاموش تھے وہ بھی بول پڑے، ادھر چند مہینوں میں لکھنے والوں نے کھل کر لکھا اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حفظہ اللہ نے تو حق ہی ادا کر دیا۔

سعودیہ و امارات استبداد کی مکروہ کہانی لکھ ہی رہے تھے کہ اسی درمیان اس میں ایک اور باب کا اضافہ ہو گیا، ڈاکٹر سفر الحوالی جو سعودیہ کے ایک متدین و پرہیز گار عالم اور حق گو دانشور و داعی ہیں، ان کی کتاب "المسلمون والحضارة الغربية" یعنی مسلمان اور مغربی تہذیب منظر عام پر آئی، کتاب آنے کے بعد شیخ کو بیماری کی حالت میں قید کر لیا گیا، سیکورٹی کے افراد ایمبولینس میں آئے اور شیخ کو نامعلوم مقام پر پہنچا دیا، یہی نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے شیخ کے چار بیٹوں کو گرفتار کر لیا، دو بیٹوں کو تو ایک شادی کی تقریب سے اٹھا لیا اور سب کو نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا، شیخ کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے مغرب کے فکری، سیاسی اور تہذیبی تسلط کو قبول کرنے کے خلاف آواز بلند کی، شیخ نے ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر تنقید کی، شیخ نے عربوں کی بے راہ روی اور ان کے سیاہ کارناموں کا پردہ چاک کیا، شیخ نے اس کتاب میں ایسے تضادات پر تبصرہ کیا جو قابل افسوس اور حیران کن تھے، شیخ نے لکھا کہ یہ کیا تضاد ہے کہ ایک طرف ائمہ مساجد کو حلب کے لیے قنوت نازلہ پڑھنے کے احکام دیے جاتے ہیں اور دوسری طرف روس کو ملینوں ڈالر صرف اس لیے ادا کیے جاتے ہیں کہ اس کے جنگی طیارے حلب کو تباہ و برباد کر دیں، شیخ نے لکھا کہ دورہ ٹرمپ پر اس کو ملینوں ڈالر دیے گئے اور جو تحفے تحائف دیے گئے وہ اس کے علاوہ تھے، اگر یہ خطیر رقم مسلم مسائل پر خرچ کی جاتی یا مسلمان قیدیوں کی رہائی کے لئے خرچ کی جاتی تو یہ بہتر ہوتا، دنیاوی سیاست میں بھی اس کے اچھے اثرات مرتب ہوتے، شیخ نے اس دوغلے پن پر بھی تبصرہ کیا کہ ایک طرف تو خامنہ ای سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے کی بات کی جاتی ہے اور دوسری جانب عراق میں اس کے ہرکاروں اور نمائندوں کے استحکام کے لئے کوششیں کی جاتی ہیں، شیخ نے انتہائی سخت تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ جو کچھ حالات ہیں محض اس لیے ہیں کہ عرصہ سے ہم نے منکر کی نکیر کرنا چھوڑ دیا ہے اور ہم دنیا کے عیش و عشرت پر قانع و راضی ہو گئے ہیں، اب بچا ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ عرب حکومتیں یہودیوں کے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے اخراجات بھی برداشت کر لیں، کیا امارات اس کے لیے تیار ہے، کیوں کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ فلسطینیوں کے مکانات خرید کر یہودیوں کو دیتا ہے، شیخ نے مستقبل کے لیے مشورے دیے، شیخ نے یہ سب کچھ ناصحانہ اور خیر خواہانہ اسلوب میں کیا، انھوں نے حضور ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کیا کہ دین نام ہے خیر خواہی کا، مگر ظالم نے کہا کہ نصیحت و خیر خواہی نام ہے جیل کی سلاخوں کا، شیخ نے خود ہی لکھا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو لکھنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو شہادت کے لیے تیار کر لیا تھا، ظاہر ہے کہ وہ راہ شہادت پر چل پڑے ہیں اور علمائے عزیمت کی فہرست میں ایک اور نمایاں نام کا اضافہ ہو گیا ہے، خلیج کے سوشل میڈیائی گروپوں میں ایسی بھی خبریں آئی ہیں کہ بیماری کی حالت میں تین چار گھنٹوں تک ایجنسیاں ان سے تفتیش کرتی رہی، اسی دوران ان کو اٹیک پڑا اور اللہ کو پیارے ہو گئے، خدا کرے کہ یہ محض افواہ ہو، بہر حال اس خبر کی تادمِ تحریر نہ توثیق کی جا سکتی ہے نہ تردید، البتہ شیخ کام آ گئے تو منهم من قضى نحبه کی بشارت عظمی کا مصداق بنے اور سلامت ہیں تو یقیناً ان کی کتاب نے انھیں منهم من ينتظر کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

شیخ کی یہ کتاب صدی کی سب سے بہترین اور نمایاں دستاویزی کتاب قرار دی جائے گی، اگر ان کی اس جرأت و عزیمت کے ساتھ روشنی دکھانے کے عمل کو بھی مسلمانوں نے ضائع کر دیا تو پھر صدیوں وہ اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے، راقم سطور نے ابھی جستہ جستہ ہی دیکھا ہے مگر دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اگر حسن البنا، سید قطب، علامہ اقبال، مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسے اصحاب علم وعزیمت اور حساس دل رکھنے والے علماء اور مغرب کی بالادستی کا انکار کرنے والے داعیان و مفکرین موجود ہوتے تو وہ سفر الحوالی کے قلم کو چومتے اور انھیں خراج عقیدت پیش کرتے، مجھے کہنے دیجئے کہ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین اور الصراع بین الفکرۃ الإسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ اس ضخیم ترین کتاب کا مقدمہ ہے اور یہ کتاب ان جیسی کتابوں کا تکملہ ہے، اس میں معاصر تاریخ کے دستاویزی ثبوت جمع کر دئے گئے ہیں، اس میں مسلم حکمرانوں کو آئینہ دکھایا گیا ہے، اس میں مسلمانوں کے مواقف، عربوں کی روش اور مغرب کے دام میں گرفتار ہونے کی حقیقت بیان کی گئی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کے بہت سے مندرجات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ معاصر اسلامی مسائل اور عالمی سیاست پر گفتگو کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کتاب کا بغور مطالعہ کریں۔

اس کا مقدمہ نہایت طاقتور ہے، پھر ایک طویل تمہید ہے، پھر تہذیب کی تعریف وحقیقت پر گفتگو ہے، پھر یہ پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیا اس وقت مغرب کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف مہم جوئی صلیبی جنگ کا حصہ ہے۔

بعد ازاں اسلامی تہذیب کے تفوق پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے مراجع کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی بعض خصوصیات پر گفتگو کی گئی ہے اور پھر شریعت الٰہی کی حکمرانی پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، اس کے بعد عقائد کے باب میں گفتگو ہے جس سے یقیناً برّصغیر کے علماء کو اختلاف ہوگا، بعد ازاں تمدن اسلامی کی سلفی دعوت کے ذریعہ تجدید کے عنوان سے بحث ہے، جس میں بالخصوص شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت اور دنیا بھر میں اس کے اثرات سے بحث کی گئی ہے، شیخ البانی کو سلفی دعوت کا مجدد قرار دیا گیا ہے، پھر سلفی دعوت کے دشمنوں اور نفاق ومنافقین کے سلسلہ میں گفتگو کی گئی ہے۔

اگلا باب واقعی اہمیت کا حامل ہے، اس میں دینی فکر پر گفتگو کی گئی ہے، دین کی حقیقت، مغرب کے دین اور دینداروں کی اہل کتاب کے یہاں حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہود ونصاری کو خاص بحث کا موضوع بنایا گیا ہے اور پھر اقوام متحدہ اور اسکے حقوق انسانی کے منشور پر تبصرہ کیا گیا ہے، اس باب کے آخر میں کفار کے تشبہ اور گناہوں کے اثرات کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔

بعد ازاں جو باب ہے وہ اور زیادہ اہم ہے، یہاں اسلام کی سیاسی فکر، سیاسی فکر پر اس کے اثرات، اسلام میں سیاسی فکر کے مبادی ومعالم سے متعلق کی بحث کی گئی ہے، منصب امامت، مال میں آزادی وخودمختاری اور قضاء وقاضی کی خودمختاری اس باب کے آخری موضوعات ہیں۔

اس کے بعد اجتماعی یعنی معاشرتی (Social) فکر وڈھانچے کو موضوع بنایا گیا ہے، بعض اسلامی معاشروں پر گفتگو کے بعد مغربی تمدن کے نمائندہ معاشروں مثلاً امریکہ، روس اور چین کے معاشروں پر گفتگو کی گئی ہے، قضیہ عورت، حقوق وآداب اور

بعض دیگر اہم مباحث پر قیمتی آراء دی گئی ہیں، اس کے بعد تفصیل سے علمی فکر اور اس کے متعدد شعبوں سے بحث کی گئی ہے، اسی طرح تعلیم وتربیت اور ادارتی طرز کو موضوع بنایا گیا ہے۔

دسواں باب اس کتاب کا لب لباب قرار دیا جا سکتا ہے جو تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مغرب کے فریب سے نکلنے کے طریقے بتانے کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے کہ مسلمان تمدن انسانی کی کس طرح قیادت کر سکتے ہیں، اس بحث کے آخر میں ایک اہم عنوان اور دلچسپ بحث کا عنوان ہے ''مستقبل کس کا ہے''۔

کتاب کا آخری حصہ جو تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے وہ سب سے زیادہ اہم بلکہ اصل کتاب ہے، وہی ان کی قید کا سبب ہے، اسی میں انھوں نے راز ہائے سربستہ سے پردے اٹھائے ہیں، ناقابل انکار حقائق بیان کیے ہیں، مستقبل کی تعمیر کے مشورے دیے ہیں، تہذیب اسلامی کی حفاظت کے نسخے بتائے ہیں، اپنی ذات، اپنے دین اور اپنی تہذیب پر اعتماد کی دعوت دی ہے، منکر کی نکیر اور اصلاح احوال پر زور دیا ہے، اس آخری حصہ کی ایک بحث کا عنوان ہے علماء کو نصیحت، دوسری بحث داعیوں کے لیے نصیحت اور تیسری بحث آل سعود کے لیے نصیحت کے عناوین سے معنون ہے، آخری فصل میں بعض ان امور کا تذکرہ ہے جن کی اصلاح فوری طور پر ضروری ہے۔

شیخ سفر الحوالی سلفی عالم دین ہیں، بزرگ داعی ہیں، ام القریٰ میں عقیدے کے استاد رہے ہیں، درباری مزاج نہ ہونے اور اسلامی غیرت سے سرشار ہونے کے سبب ان کو پینشن بھی نہیں ملتی تھی مگر پھر بھی وہ تھکے نہیں، جھکے نہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً صحیح اسلامی مواقف پیش کرتے رہے اور اب بالآخر انھوں نے اپنی زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب میں پیش کر دیا، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے، ان کے ساتھ عافیت کا معاملہ فرمائے ان کو اور دیگر علمائے حق کو جلد رہائی نصیب فرمائے، ظالموں کے ظلم سے نجات عطا فرمائے، ہندوستانی علماء کو چاہیے کہ وہ براہ راست اس کتاب کے مطالعہ پر توجہ دیں، بالخصوص وہ طبقہ اس کتاب کا بغور مطالعہ کرے جواب بھی سعودیہ کو مملکت کتاب وسنت کہتے نہیں تھکتا اس لیے کہ بفضل الٰہی یہ کتاب بڑے نازک وقت میں اسی طبقہ کے ایک بزرگ عالم کے قلم سے نکلی ہے۔

ترکی کے انتخابات پر دنیا کی نظر تھی:

ہم نے اپنی کتاب ''رجب طیب اردوغان'' میں جو ضمیمہ تحریر کیا تھا اس میں ایک تجزیاتی مضمون کا عنوان تھا ''کیا اردوغان ۲۰۱۹ء کے الیکشن میں کامیاب ہوسکیں گے'' کتاب پریس جا چکی تھی کہ اسی اثناء میں اردوغان نے قبل از وقت انتخابات کا اعلان کر دیا، حالانکہ وہ اس سے پہلے حزب مخالف کے قبل از وقت انتخابات (PreElection) کے مطالبہ کو سختی سے مسترد کر چکے تھے، اردوغان کی سیاست کے متعلق ماہر تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ وہ ریاضی کے اصولوں پر اپنی سیاست کو پرکھتے ہیں، چنانچہ مطالبہ مسترد کرنے کے بھی اہم اسباب تھے اور پھر اچانک انتخابات کا اعلان کرنے کے بھی اسباب تھے، پہلے بعض ایسے منفی اسباب

تھے جو خدشات کا اظہار کر رہے تھے، مگر کچھ ہی دنوں بعد وہی اسباب فتح کی نوید بن گئے، اس میں سب سے اہم عفرین آپریشن میں کامیابی، معیشت کو گرنے سے بچانا، امریکی سفارت خانے کی منتقلی پر کمالسٹوں کا اردوغان کی ہاں میں ہاں ملانا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ترکی میں موجود سیکولر معاندین اسلام کی جانب سے اسلام مخالف مہم کے بجائے اسلامی شعائر کو انتخابی سیاست کے لیے اس طرح استعمال کرنا جیسے ہمارے ملک میں راہل ولالو کا رومال اوڑھنا، ٹوپی لگانا، وغیرہ، راقم سطور کو خارجی عوامل کے علاوہ داخلی اسباب میں سے ایمرجنسی وغیرہ کے سبب جو خدشات تھے وہ ان مظاہر کو دیکھ کر دور ہو گئے تھے، کہ یہ اسلامی فکر کی بالادستی اور معاشرہ میں موجود اردوغان کی مقبولیت تھی جس نے مصطفیٰ کمال کے نمائندوں کو وہ کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا جن کے وہ سب سے بڑے مخالف اور وکیل تھے اور جن کی مخالفت کی ایک سیاہ تاریخ ان کی پشت پر تھی۔

گویا اس موقع پر کہا جا سکتا ہے کہ اردوغان نے بڑی کامیابی کے ساتھ قوم کی فکری تبدیلی کی اس عمارت کو بڑی حد تک تعمیر کر لیا ہے جس کی بنیاد ان سے بہت پہلے ان کے پیش رو بزرگوں نے رکھی تھی، ۲۴/جون ۲۰۱۸ء کو ہونے والے ترکی کے صدارتی اور عام انتخابات پر دنیا بھر کی نظریں لگی ہوئی تھیں، اپنے بیگانے، دوست دشمن، عرب وعجم، مسلم وغیر مسلم سب ٹکٹکی باندھے نتائج کا انتظار کر رہے تھے، مجبور و بے بس فلسطینی دعاؤں میں مصروف تھے، شامی مہاجرین حزب مخالف کی بھگا دیے جانے کی دھمکیوں سے خوفزدہ ہو کر رب کریم کے حضور میزبان کی کامیابی کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے، اردوغان کی کامیاب سیاسی پالیسیوں اور حکمت وبصیرت کے ساتھ اسلامی بنیادوں کو مضبوطی فراہم کرنے والے ان کے اقدامات سے واقف لوگ بھی امید لگائے بیٹھے تھے، مسلمانوں کو پھلتا پھولتا دیکھنے، اسلام کو قید وبند سے آزاد دیکھنے، اسلامی حمیت کا مظاہرہ دیکھنے اور کسی مسلم ملک کی غیر معمولی ترقی دیکھنے کی خواہش رکھنے والے بھی کسی بشارت کے منتظر تھے، اس کے برخلاف امریکہ ویورپ اور صہیونی ریاست اردوغان کے سفر کو ختم کر دینے کی کوششوں میں مصروف تھے، ان کے عربی ہرکارے دولت کے انبار نچھاور کر رہے تھے اور حزب العدالہ والتنمیۃ کو قصۂ پارینہ بنا کر پھر سے ترکی کو ماضی کی تاریکیوں میں دھکیل دینے کے خواہاں تھے، مگر ہائے افسوس کہ ان کی امیدوں پر تیمموں اور بے کسوں کی لاج رکھنے والے خدا نے پانی پھیر دیا اور حزب العدالہ والتنمیۃ نیز اردوغان دونوں نمایاں طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوئے، حزب مخالف نے فریق مخالف کی فتح اور اپنی شکست کو بڑے اچھے انداز میں قبول کیا، دشمنان اسلام کو سانپ سونگھ گیا اور عرب میڈیا آخر تک شکست وریخت کی سرخیاں لگاتا رہا، جیسے کہ انتخابات سے قبل پوری انتخابی مہم میں اس نے یورپ کے ساتھ مل کر اردوغان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور مدمقابل کو نجات دہندہ ثابت کرنے پر پورا زور صرف کر دیا تھا، حیرت تو اس وقت ہوئی جب وہ لوگ انتخابات کی شفافیت پر سوال اٹھانے لگے جنہوں نے کبھی بیلٹ باکس کی شکل تک نہ دیکھی، وہ شفافیت پر سوال کیوں نہ اٹھاتے؟ وہ غلامی اور آمریت کے دلدادہ ہیں، ان کو مصر کے وہ انتخابات شفاف نظر آتے ہیں جن میں عرصہ سے بار بار فوجی ڈکٹیٹر ۹۰-۹۵ فیصد ووٹوں سے کامیاب قرار دیا جاتا ہے، اور جو واقعی شفاف مقابلہ میں جیت کر آتا ہے اس کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے، اس کی حکومت کو اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اس مہم میں بادشاہ، وزیر، مشیر اور پیادے سب

ایک ہی طرح کا کردار ادا کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے ہر میدان میں مقابلہ آرائی سے بہت دور جا چکے ہیں، ان کے یہاں اپنے عوام کو غلام بنا کر اور عوامی دولت پر قبضہ کر کے مغرب کی غلامی اختیار کرنے کا چلن ہے، بلکہ کون کتنا بڑا غلام ہے اس کی مقابلہ آرائی جاری ہے، انتخابات کی شفافیت پر سوال اٹھانا اس لیے بھی حماقت تھی کیوں کہ حزب مخالف کو یہ حق سب سے زیادہ تھا مگر اس نے نہیں اٹھایا، پھر عالمی مبصرین، تجزیہ نگار اور ماہرین وہاں براہ راست انتخابی عمل کا جائزہ لینے کے لیے موجود تھے، قصہ مختصر یہ کہ جس طرح پوری دنیا اس الیکشن پر نظریں جمائے ہوئے تھی اس سے ترکی اور اردوغان کی اہمیت اور مستقبل میں ان کے اہم کردار کا اندازہ لگانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

نتائج آنے کے بعد دنیا بھر میں ایک بھونچال آ گیا، مثبت و منفی تبصروں کی باڑھ آ گئی، جنھیں کچھ علم ہے وہ بھی کود پڑے اور جو علم و عقل سے کورے ہیں وہ بھی بحث میں حصہ لینے لگے، کسی نے اس جیت کو ''فتح مبین'' قرار دینے کی خطا کی تو کوئی خلافت اسلامیہ کے قیام کی بشارتیں سنانے لگا تو کسی کو اگلے ہی دن امریکہ مغلوب ہوتا نظر آیا، سبھی حامی اور جذبہ ایمانی رکھنے والے لوگ خوش تھے، مگر خوشی کے اظہار کے طریقوں میں بے بصیرتی اور ناواقفیت یا جذباتیت صاف جھلک رہی تھی، دوسری طرف منافقین و معاندین کا ٹولہ تھا جس نے طنز و تعریض اور استہزاء میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ایسے ایسے مطالبات اور ایسے ایسے الزامات کہ اللہ کی پناہ، جنھوں نے کبھی اردوغان اور ان کی سیاست کو موضوع نہیں بنایا تھا وہ بھی دھڑلے سے حقائق کو بالائے طاق رکھ کر مضامین پر مضامین کی بارش کرنے لگے، ایسے موقع پر کتاب وسنت کی رٹ لگانے والے یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ منہ سے نکلی ہوئی ہر بات اور قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ کا حساب بھی دینا ہے۔

الیکشن کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی اس کا تجزیاتی مطالعہ بڑا تفصیل طلب ہے (اسی لیے اس شمارے میں ہم نے متعدد مضامین شامل کیا ہے)، مگر ہم اختصار کے ساتھ یہاں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اردوغان سے ہماری محبت صرف اور صرف اس لیے ہے کہ اس نے ترکی کی اہمیت کو سمجھ کر از سر نو اس کی عظمت رفتہ کی بحالی کی ٹھوس کوشش کی، اس نے ترک قومیت کے ساتھ ساتھ اسلامیت اور ملی غیرت کے ثبوت فراہم کیے، اس نے مناسب وقت پر مناسب اقدامات کیے، ہم اردوغان کو اس کی اسلام پسندی کی بنیاد پر پسند کرتے ہیں، اس کی اسلام پسندی کے دلائل بکھرے ہوئے ہیں بلکہ ہمارے پاس ترک افراد کی شہادتیں بھی موجود ہیں، ہم اس کو اس لیے چاہتے ہیں کہ وہ ظلمتوں میں امید کی کرن ہے، صحرا کے اندھیروں میں بہت دور ٹمٹماتا ہوا ایک چراغ ہے جس سے روشنی کی امید ہے، ہم اس کی ٹھوس اور تدریجی سیاست کو اس کی کامیابی کا راز سمجھتے ہیں، ہم قطعاً اردوغان کو خلیفہ یا امیر المومنین اور امام معصوم نہیں سمجھتے، یہ بھولے بھالے لوگوں کی حماقت یا طنز و تعریض کے دلدادہ لوگوں کی سازش تو ہو سکتی ہے کہ اردوغان کو اس حیثیت سے پیش کیا جائے تاکہ مغرب اور شدت سے اس کے سفر کو روکنے کی کوشش کرے، البتہ تجزیہ کے ساتھ کسی فرد پر یقین کرنے والے اسلام پسندوں کی طرف سے یہ خطا نہیں ہو سکتی، یوں بھی یورپ و امریکہ اور دوست نما دشمنوں نے اس کی سیاست کیا حیات مستعار ہی ختم کرنے میں کون سی کسر چھوڑی تھی، ۲۰۱۶ء کی فوجی بغاوت پر اب تو ڈھیروں تحقیقات و مقالات

آ چکے ہیں اور مفاقین و دشمنان اسلام اور دو غلے جمہوریت پسندوں کے چہرے بے نقاب ہو چکے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ ہم اردوغان کو ماضی کے عظیم ترکی اور عظیم سلطنت کا وارث سمجھتے ہیں، وہ بھی اس لیے کہ بارہا وہ اپنی قابل افتخار تاریخ کا تذکرہ کرتا ہے، عثمانی اقدار کی بحالی کا دعوی کرتا ہے، اس کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے اور اس نے ہی خلافت عثمانیہ کی تاریخ کو اسکولی نصاب میں یہ کہہ کر داخل کیا ہے کہ ہماری تاریخ صرف ۹۰ سال پر محیط نہیں بلکہ ہماری تاریخ صدیوں پرانی ہے، ہمیں حیرت ان بے چاروں پر ہے جو ترکی کے حالات سے یکسر ناواقف ہیں مگر مطالبہ کرتے ہیں کہ اردوغان خودکش بمبار بن کر تل ابیب میں کود جائے، کاش کوئی یہ سمجھائے کہ اردوغان کو وراثت میں اسرائیل سے اسٹراٹیجیکل شراکت داری ملی تھی، جسے اردوغان نے ختم کر کے برابری کی سطح پر لا کھڑا کیا، پھر اپنے وبیگانے سبھی اس کے محافظ ہیں تو اکیلا چنا کیسے بھاڑ پھوڑے گا، کون اسرائیل کا مخالف ہے اور کون دوست؟ القدس میں امریکی سفارت خانہ منتقل کرتے وقت سب واضح ہو گیا، صہیونی میڈیا نے غبار صاف کر دیا اور علی الاعلان ان کے نام ظاہر کر دیے، یقیناً اردوغان نے اسرائیل سے تجارتی تعلقات باقی رکھا ہے مگر وہ تعلقات نہ صرف اردوغان کی مجبوری اور ضرورت ہیں بلکہ اسرائیل کی بھی مجبوری ہیں، ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کس طرح غلط تصویریں اور غلط بیانی کے ذریعہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں، اب تو سوشل میڈیا اس کا بڑا میدان فراہم کر رہا ہے، ہم نے تقریباً ۸ سال قبل مسلم یونیورسٹی کے کینڈی ہال میں ایک کانفرنس کے دوران بچشم خود مشاہدہ کیا تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کی ایک غیر مسلم خاتون پروفیسر نے مسلم معاشرے میں عورت کی مظلومیت پر مقالہ پیش کیا، اور دعویٰ کیا کہ ان پر جو تشدد ہوتا ہے اس کے نتیجہ میں وہ بسا اوقات ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو جاتی ہیں، بطور دلیل پروجیکٹر پر انھوں نے تصاویر دکھائیں، مگر درحقیقت وہ تصاویر اسرائیل سے لوہا لینے والی فلسطینی خواتین کی تھی، چنانچہ اسی طرح اس موقع پر یہ سوال اٹھایا گیا کہ اب تک ہم جنسی کا دستوری حق کیوں باقی ہے، اس سلسلے میں یکسر یک رخے پروپیگنڈے سے کام لیا گیا اور کئی سال پرانے مظاہروں کی تصویریں بھی عام کی گئیں، حالانکہ اردوغان کے دور حکومت میں اس سلسلہ میں جو اقدامات کیے گئے جو ضمنی قوانین بنائے گئے جو حصار کھینچے گئے وہ بہت ہیں، یہ لوگ ترکی کے استبدادی نظام اور سیکولر استبدادی قانون سے واقف ہی نہیں، انھیں معلوم نہیں کہ ترکی میں استبدادی نظام کی محافظ سیکولر فوج تھی، اسی کا تسلط تھا، اسی کی مرضی چلتی تھی، وہی اصل قوت (Supreme authority) تھی، اردوغان کو ایک دہائی صرف فوج پر قابو پانے میں گزر گئی، نہایت حکمت و بصیرت اور تدریج کے ساتھ قانونی ترمیمات کے ذریعہ وہ فوج کی مداخلت کو ختم کرنے اور اسے بیرک میں واپس بھیجنے میں کامیاب ہوئے، لیکن پھر بھی وہ کس قدر مضبوط تھی ۲۰۱۶ء کا واقعہ اس کا گواہ ہے، لیکن شاید یہ واقعہ بھی اردوغان کو حتمی صفائی کا موقع فراہم کرنے کے لیے رونما ہوا تھا، اگر اردوغان اس حکمت و تدریج پر عمل نہ کرتے اور معاشی ترقی اور جمہوری اقدار کی بحالی کو اپنی سیاست کی بنیاد نہ بناتے تو شاید اب تک وہ سیاست میں باقی نہ رہتے، اس موقع پر ایک اور حیرت انگیز پہلو سامنے آیا کچھ لوگوں نے کانگریسی سیاست داں ششی تھرور کے مضمون کو خوب اچھالا جس میں اس نے اردوغان کا موازنہ مودی جی سے کیا تھا، افسوس لکھنے والے پر نہیں تھا، اس نے تو ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی تھی، افسوس اس پر خوش ہونے والوں پر تھا جو یہ بھی فرق نہ کر سکے کہ ایک طرف گھوٹا

لے ہیں، غربت سے مرنے کے واقعات ہیں، موب لنچنگ کے واقعات ہیں، گرتی ہوئی معیشت ہے، کسانوں کی خودکشی ہے، اسپتالوں کی دہلیز پر دم توڑنے والی عورتوں کی داستان دلخراش ہے، جہالت کا چلن ہے، اکثر شہر فضائی آلودگی کی زد میں ہیں، رہائشی علاقے بجلی اور پانی کی قلت سے جوجھ رہے ہیں، دوسری طرف اپنے ملک کو دنیا کی سولہویں بڑی معیشت بنانے والا واقعہ ہے، تعلیمی ترقی اور ملک کے ہر شخص پر گریجویشن تک کی مفت تعلیم کو لازم کرنے والا حکمراں ہے، صنعت وتجارت کے میدان میں اپنی حیثیت کو تسلیم کرنے والا نمائندہ ہے، غریبوں کو مفت علاج فراہم کرنے والا اور آئی ایم ایف کے قرضوں سے نجات پانے والے ملک کا حکمراں ہے، حیرت واستعجاب کے ایسے بہت سے اسباب اس موقع پر نظر آئے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مگر اس سے اتنا تو ظاہر ہوگیا کہ اردوغان میں کچھ تو ہے جس کے سبب دنیا بھر میں اس کی حمایت کرنے والوں اور اس کے معاندین دو خیموں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔

ترکی کو ہر طرح برباد کرنے کی کوشش کی گئی اور ہر طرح گھیرنے کی کوشش کی گئی، ترکی اس وقت جس عسکری اقتصادی اور سیاسی پوزیشن میں ہے، اس پوزیشن میں اگر اسکے سربراہ مرحوم نجم الدین اربکان ہوتے تو عراق وشام میں ترکی آمنے سامنے کی جنگ لڑ رہا ہوتا، لیکن اردوغان ابھی مستقبل میں اور مضبوطی کے ساتھ سامنے آنے کے لیے حکمت کے ساتھ بتیس دانتوں کے درمیان تنہا زبان کی حیثیت سے بچ بچا کر آگے بڑھ رہے ہیں، اس کا اندازہ اپنا گھر تک بھی نہ سنبھال پانے والوں کو کیا ہوسکتا ہے، ترکی اس وقت نازک مرحلہ میں ہے، یورپ وامریکہ ۲۰۲۳ء میں معاہدہ لوزان کی مدت پوری ہونے کے بعد ترکی کی آزادیوں سے خائف ہے، کیوں کہ ترکی اس سے پہلے ہی مادی ترقی کی معراج پر جا پہنچا ہے، اور جس دینی فکر کی آبیاری وہاں کے بزرگوں نے بڑی قربانیاں دے کر کی تھی اردوغان کی حکمت عملی سے وہ نہ صرف پنپی بلکہ ثمر آور درخت بن گئی ہے، مضبوط معیشت، طاقتور صنعت وعسکری قوت اور دینی بیداری کے اجتماع سے اگر دشمن خائف ہو تو تعجب کیسا، ماضی کی داستان یہ امت بھول گئی تو کیا، یورپ نہیں بھولا، اس کے لیے ابھی یہ کل کی ہی بات ہے جب وہ ترکی کا باج گزار تھا، اردوغان ۲۰۲۳ء سے قبل اپنی قوت کو کسی بھی طرح ضائع نہیں کرنا چاہتے اگرچہ اپنے اور غیر سبھی ان کا خاتمہ چاہتے ہیں، اپنوں کو تعصب وغلامی نے اندھا کر دیا ہے، لارنس آف عربیہ نے قومیت کا جو بیج بویا تھا وہ اس وقت بڑے تن آور درخت کی صورت میں نظر آرہا ہے، امریکی غلامی نے گلے میں طوق ڈال دیا ہے، اس لیے ترکی کی ترقی، کامیاب سیاست اور قائدانہ شان سے آگے بڑھنے میں ۲۰۲۳ء کے بعد اپنوں کو بھی خطے میں اپنی گرتی ہوئی ساکھ بچانے کی فکر ہے، سوچیے ذرا میری ناقص معلومات کے مطابق اردوغان کی کامیابی پر خلیجی ممالک میں سے صرف قطر وکویت کے سربراہوں نے فوری طور پر مبارکباد پیش کی، اس کے علاوہ سب نے سفارتی روایات کو بھی بالائے طاق رکھا اور مکمل خاموشی اختیار کی۔

ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ اردوغان کی سب سے بڑی کامیابی بلکہ کامیابیوں کی تفصیلات کو اگر ایک جملے میں ملخص کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی جدوجہد کے سبب ترکی کفر اجباری سے ''کفر اختیاری'' کے مرحلہ میں داخل ہوگیا ہے، کیا بعید ہے کہ آئندہ مرحلہ میں وہ گلشن اسلام اور اسلام کا محافظ بن جائے، لیکن افسوس ان لوگوں پر ہوتا ہے جو ترکی اور مرکز اسلام مملکت سعودیہ عربیہ کا موازنہ کرنے پر ہمہ وقت کیل کانٹے سے لیس رہتے ہیں، عقل کے ماروں کو یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ دونوں کے درمیان موازنہ کی کوئی

شکل ہی نہیں، اس لیے کہ ترکی پستیوں سے نکل کر، گناہوں کے دلدل سے نکل کر بلندیوں کی راہ پر عازم سفر ہے۔ جبکہ سعودیہ محمد بن سلمان کی سربراہی میں بلندیوں سے اتر کر پستیوں کے دلدل میں پھنستا اور ڈوبتا جارہا ہے، سب جانتے ہیں کہ نیچے جانے والا ڈول خالی ہے، اور اوپر آنے والا ڈول بھرا ہوا ہے، جب یہ ایک خالی اور ایک بھرا ہے تو دونوں میں تقابل، توافق، تناسب اور موازنہ کی گنجائش کہاں؟ ترکی کا ماضی، اس کے مستقبل کے روشن امکانات اور ترکی کی اہمیت ہی ہے کہ سب کے سب اردوغان کی شکست کی خبر سننے کو بے تاب تھے، اردوغان اگر شکست کھا جاتے تو کیا ہوتا، ترکی کی قیادت کے امکانات ختم ہوجاتے، وہاں بھی اسلامی تحریکات کے لیے عرصۂ حیات تنگ کردیا جاتا، شامی مہاجرین کو وہاں سے نکال دیا جاتا، بحال ہوتی ہوئی اسلامی شناخت پر قدغن لگا دی جاتی، مدارس ائمہ پر تالے پڑ جاتے، ترکی کو پھر صنعتی، معاشی، اقتصادی اور سیاسی طور پر دوسروں کا دست نگر بنادیا جاتا، مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کی کمر توڑ دی جاتی اور ایک طویل مدت کے لئے عالم اسلام کے باغیرت اسلام پسند لوگوں کو مایوسی کے اندھیروں میں چھوڑ دیا جاتا، اس الیکشن کے بعد اردوغان مزید قوت ومضبوطی کے ساتھ منظر عام پر آئے ہیں، صدارتی نظام کے نفاذ سے اب ترکی میں اتاترک کے بعد دوسرے سب سے طاقتور و بااختیار حکمراں بن کر ابھرے ہیں، وزیر اعظم کا عہدہ ختم کردیا گیا ہے، وزارتوں کی تعداد کم کردی گئی ہے، ظاہر ہے کہ اگر ان کی قوت اور ان کے اختیارات میں اضافہ ہوا ہے تو آزمائشوں کا حصار بھی سخت ہوگیا ہے، اب ان کو پہلے سے زیادہ چیلنجز کا سامنا ہے، مقابلہ سخت ہے اور وقت کم ہے، امیدیں بھی بہت ہیں اور امکانات بھی خوب ہیں، مگر تقدیر الٰہی کیا ہے اس کے ظہور کا انتظار کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ ان کا حامی و ناصر ہو، انھیں صراط مستقیم پر قائم ودائم رکھے بھنور میں ہچکولے کھاتی ملت اسلامیہ کی کشتی کو ساحل سے ہمکنار کرنے کی انھیں قوت وہمت دے، انھیں کے اجداد تھے جنھوں نے اپنے عہد کا سب سے بڑا بحری بیڑا تیار کرکے استنبول کی فتح کے لیے خشکی کے راستے سمندر میں اتار دیا تھا، انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آج اردوغان حکومت ہتھیاروں کی کامیاب صنعت وتجارت میں اپنی شناخت قائم کرچکی ہے، اللہ تعالیٰ کو ان سے کتنا کام لینا ہے یہ تو اسی کو معلوم ہے، ہم تو طلوعِ صبحِ روشن کی امید میں جیتے اور اسی کے دعا گو رہتے ہیں۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

گوشۂ ترکی

ترکی- ماضی- حال- اور مستقبل کے آئینہ میں

مولانا سید سلمان الحسینی ندوی

دنیا میں جن بڑے خاندانوں نے حکومتیں کی ہیں، ان کی تاریخ سے عالمی تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، لیکن ختم نبوت کے ساتھ اسلام کا جو آخری ایڈیشن حضرت محمد ﷺ کو عطا فرمایا گیا، اس میں ایک عالمی، فکری، سماجی، سیاسی، معاشی، اور عسکری انقلاب کی دعوت تھی، اس نے ۲۳ سال کی مدت میں یہ انقلاب جزیرۃ العرب کی ۱۰ لاکھ مربع کیلومیٹر سرزمین میں برپا کردیا، اور پھر آئندہ بیس سال میں دنیا کی دو سپر پاورز کے خاتمہ کے ساتھ اس انقلاب کو اس وقت کی آباد اور متمدن دنیا کے مشرق ومغرب میں پہونچادیا۔

وہ ایک انسانی اور عالمی دعوت وفکر تھی، اس میں خاندانوں کی اجارہ داری، اور موروثی حکمرانی کی گنجائش نہیں تھی، خلافت راشدہ کے دور تک اس پر عمل ہوتا رہا، اور اسی دور میں اصلاً عالمی انقلاب برپا ہوا، اس کے بعد بنوامیہ کا دور حکومت شروع ہوا، جو خاندانی اور موروثی بنیادوں پر قائم ہوا، جس کی فطرت میں ظلم وسفا کی تھی، ایک طرف اسلام اور ایمان پر مبنی بنیادی عقیدہ اسے آگے بڑھاتا تھا، اور فتوحات سے ہمکنار کرتا تھا، تو دوسری طرف جاہلیت کا خاندانی اور موروثی نظام اسے اندر سے گھن کی طرح کھا رہا تھا، یہاں تک کہ وہ کسی طرح اپنے سو سال بھی پورے نہ کرسکا اور جاں بہ لب ہوگیا۔

اس کے بعد اس کے ردعمل میں جو دوسرا خاندانی حکمرانی کا نظام عباسی خلافت کے نام سے قائم ہوا، اس نے سفا کی، خوں ریزی، اور ظلم وبربریت سے اپنی ابتداء کی، اس کا پہلا حاکم ''سفاح'' کے لقب سے مشہور ہوا، اموی دور کی خصوصیات کے ساتھ ایمانی اور مادی کش مکش کے ساتھ یہ دور عباسی جلد ہی خانہ جنگیوں کا شکار ہوا، اور پھر خاندان سے باہر اس کو ایرانی، ترکی، اور دیگر عناصر سے مدد لینی پڑی، اور کسی نہ کسی طرح برائے نام خلافت کے ساتھ یہ دور تقریباً پانچ سو سال پر محیط رہا، لیکن درمیان میں ایسے وقفے آتے رہے کہ ایسا لگا کہ اب اس کا دم واپسیں ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا ابتدائی سو سالہ دور بڑی فتوحات اور ترقیات کا رہا، لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کا زوال اس حد تک پہونچا کہ ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کا حملہ روکنا تو درکنار یہ نظام اس کا ایسا نوالۂ تر بنا، جس کو چباچبا کر اور بھوسا بنا کر تاتاریوں نے ہاتھی والوں کے انجام سے دوچار کردیا۔

ساتویں صدی ہجری- تیرھویں صدی عیسوی- میں ایک قبیلہ ''قابی'' نامی جو اپنی نسبت ترکی الاصل قبیلہ ''اوغوز'' کی طرف کرتا تھا، اپنے علاقوں سے منتقل ہوکر سلطان علاء الدین کی قیادت میں سلجوقی لشکر میں شامل ہوگیا، جو اس وقت رومی لشکر سے برسر پیکار تھا۔ اس قبیلہ کے افراد کی کامیاب کارکردگی کی بنیاد پر سلطان علاء الدین نے انہیں ایک بڑا علاقہ سونپ دیا، اور ''ارطغرل'' کو اس کا ذمہ دار بنادیا۔

''ارطغرل'' کا ۶۸۷ھ مطابق ۱۲۸۸ء میں انتقال ہوگیا، اس کا بیٹا عثمان اس کا وارث ہوا، عثمان نے عادلانہ حکومت کا بہترین نظام قائم کیا، عثمان نے بازنطینیوں کے قلعہ حصار پر قبضہ کیا، اور رومی سلطنت کے ایک بڑے شہر ''بروصہ'' پر قبضہ کیا، عثمان کا انتقال ۷۲۶ھ مطابق ۱۳۲۶ء میں ہوا۔

آگے چل کر اس کے جانشینوں اورخاں، مراداول، بایزید اول یلدرم، محمد اول، مراد ثانی، محمد فاتح (۸۵۵-۸۸۶ھ) (۱۴۵۱-۱۴۸۱ء) وغیرہ کی حکومت، عثمانی سلطنت اور پھر عثمانی خلافت کہلائی، یہ حکومت اپنی ترقی اور فتوحات کے ساتھ چھ سو سال کسی نہ کسی حد تک استحکام کے ساتھ چلتی رہی، اس نے یوروپ کے قلب کو فتح کرکے یوروپ کے مشرق وجنوب کے مختلف علاقوں میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔

عباسی حکومت کی صلیبیوں سے مسلسل لڑائی رہی، اور انہیں کے دور میں بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ ہوا، اور صلاح الدین ایوبی کے ذریعہ پھر اس کی بازیافت ہوئی، لیکن عثمانیوں نے اور اس کے فاتح جلیل محمد الفاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کرکے، صلیبیت کا اصل قلعہ فتح کرلیا، اس لئے اس دور سے یوروپ کی صلیبیت نے اور پھر ۱۹ویں صدی کی صہیونیت نے عثمانی خلافت کو اصل نشانہ بنانا طے کیا۔ انہوں نے ۱۵ویں صدی میں اندلسیوں سے جو انتقام لیا، اس میں عثمانیوں کے خلاف ان کی دشمنی کی آگ کے شعلے بھی بھڑک رہے تھے، سولھویں صدی سے اسپینی حملہ آوروں اور پرتگالیوں، اور پھر جرمنی، فرانسیسی، اور برطانوی صلیبیوں نے عالم اسلام کو فتح کرنے، اور مسلمانوں کو ہر جگہ سے نیست ونابود کرنے کا جو بیڑا اٹھایا، اس نے ہر جگہ ان کو عثمانیوں سے معرکہ آرائی پر آمادہ کیا اور تمام مسلم ریاستوں، ہندوستان سے ملیشیا، انڈونیشیا تک انہوں نے صلیبی کارروائیاں کیں، اور ان کے خلاف حملوں کا ایک سلسلہ شروع کردیا۔

سترھویں صدی سے ان کے عملی دجل کا جو دور ہندوستان میں شروع ہوا، جس نے ۱۸۵۷ء میں اسلامی وجود کو کچل کر صلیبی حکومت کا جھنڈا بلند کیا، اس نے اسی دور میں عثمانی سلطنت یا خلافت کے خلاف جال بننے میں، اور اس کی طاقت توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

سلطان سلیم اول نے ۹۲۰ھ میں ایران میں گھس کر اسماعیل صفوی کے مظالم کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے تبریز پر قبضہ کرلیا، اس دور میں شام ومصر میں مملوکوں کی حکومت نے ایک خانہ جنگی کی صورتحال پیدا کررکھی تھی، سلطان سلیم نے ۹۲۲ھ میں حلب کو فتح کیا، اور پھر پورا شام اس کے زیرنگیں آ گیا، اسی سال سلطان کی فوجوں نے مصر فتح کیا، مصر وشام کے بعد حجاز بھی سلطان کے زیرنگیں آ گیا، اور وہاں سے مملوکوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا، سلطان سلیم پہلا وہ مسلم حکمراں ہے جس نے اپنے لئے ''خادم الحرمین الشریفین'' کا لقب اختیار کیا۔ سلطان سلیم نے ۹۲۲ھ مطابق ۱۵۱۷ء میں جب مصر فتح کیا، تو یہ اعلان کیا کہ یہودیوں کو جزیرہ نمائے سینا میں داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔

سلطان سلیم کا بیٹا سلیمان القانونی ۹۲۶ھ مطابق ۱۵۲۰ء میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا، اس نے بڑے رعب وداب کی حکومت کی، اور صلیبیوں اور صہیونیوں کو ہر جگہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا، ۱۵۲۹ء تک عثمانی سلطنت Vienna ویانا تک پہونچ چکی تھی، اور ۱۵۲۱ء میں آسٹریا اور ہنگری کو فتح کرلیا گیا تھا، اور بلقان کی ریاستیں اس کے زیرنگیں آ گئی تھیں۔

یہ عثمانی سلطنت کا دور عروج تھا، سلیمان اعظم کے بعد سلیم ثانی کا دور بھی فتوحات کا تھا، لیکن اس کے بعد مراد ثالث کے دور ۱۵۷۴-۱۵۹۵ء سے ترکوں کا زوال شروع ہوا، بغداد ہاتھ سے نکل چکا تھا، دوبارہ اس پر ۱۶۳۸ء میں اقتدار بحال ہوا، اور ایرانیوں سے صلح ہوئی، ابراھیم (م ۱۶۴۸ء) کے دور میں روس

سے آویزش شروع ہوئی، محمد رابع کے دور میں الجزائر اور تونس عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گئے، پھر احمد ثالث ۱۷۳۰ء کے دور میں روس سے جنگ شروع ہوئی، عبدالحمید اول ۱۷۷۱ء کے دور میں روسیوں کو سخت شکست سے دوچار ہونا پڑا، سلطان سلیم ثالث ۱۷۸۷ء کا دور فتنوں اور بغاوتوں کا رہا، اور روس سے پھر جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

سلطان محمود ثانی ۱۸۳۹ء کے دور میں حجاز میں وہابیوں نے بغاوت کی، جن کی سرزنش کیلئے مصر کے حاکم محمد علی پاشا کو تعینات کیا گیا، اس نے حجاز پر بھی قبضہ بحال کیا، اور درعیہ کو ابراھیم پاشا کے حوالہ کرایا، سلطان عبدالمجید خاں ۱۸۶۱ء کے دور میں روس اور برطانیہ نے سلطنت عثمانیہ- جس کو مرد بیمار قرار دیا گیا- کی تقسیم کی تجویز طے کی، ۱۸۵۸ء میں جدہ میں فرانسیسی کونسلیٹ پر حملہ کے جواب میں جدہ پر گولہ باری کی، جس کا مقابلہ اسماعیل پاشا کے بحری بیڑہ نے کیا، سلطان عبدالعزیز ۱۸۷۶ء کے دور میں بلقانی ریاستوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔

سلطان عبدالحمید ثانی (۱۲۹۳-۱۳۲۷ء) مطابق (۱۸۷۶-۱۹۰۹ء) کا عہد سازشوں سے بھرا رہا، ۱۸۷۷ء میں روس سے جنگ چھڑی، روس اور برطانیہ کا خفیہ معاہدہ طے پایا، ۱۸۷۸ء میں برلن میں یوروپین طاقتوں کی کانگریس منعقد ہوئی، ۱۸۹۷ء میں یونان نے جنگ چھیڑ دی، ۱۸۷۸ء سے آرمینیا میں بغاوتیں شروع ہوئیں، ۱۸۹۵ء تک پہونچتے پہونچتے شورشیں سخت قتل وقتال تک پہونچیں، ۱۸۸۱ء میں فرانسیسیوں نے تونس پر حملہ کر دیا، ۱۸۸۴ء میں مصر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

بہرحال یہ حالات تھے کہ صلیبی اور صہیونی طاقتوں نے ۱۸۹۱ء میں انجمن اتحاد ترقی کی بنیاد رکھوادی، ۱۹۰۹ء میں سلطان کی معزولی کا فیصلہ ہوا، سلطان کو گرفتار کر کے ''سالونیکا'' روانہ کر دیا گیا، جہاں ۱۹۱۸ء میں اپنی وفات تک سلطان قید وحبس میں رہا، ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان چھڑ گئی، اور سلطنت عثمانیہ کو مسلسل شکستوں سے دوچار ہونا پڑا، آخر جنگ عظیم میں شرکت اور جرمنی کی شکست سے ترکی پوری طرح ٹوٹ کر رہ گیا، یہ وہ حالات تھے، جن میں ''صلیبی اور صہیونی ایجنٹ'' نے ترکی سے اسلام کو کھرچ کر پھینک دینے کی پوری کوشش کی۔

سلطان عبدالحمید ثانی سے ہرزل نے مطالبہ کیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کو آباد ہونے کا موقعہ دیا جائے، اور یہودیوں کی طرف سے بڑی مالی امداد کی پیش کش تھی، لیکن سلطان نے پائے حقارت سے اسے ٹھکرا دیا۔

یہ انیسویں صدی کا آخری دور تھا، اب صلیبیوں اور صہیونیوں نے ترکی میں رہنے والے ''دونمہ یہودیوں'' سے جو ظاہر میں مسلمان بن گئے تھے، اور در پردہ صہیونیوں کے لئے کام کر رہے تھے، ایک بیباک، سخت مزاج، سازشی، ملحد اور بدقماش شخص مصطفیٰ کمال کا انتخاب کیا، اور خفیہ اور پراسرار مشوروں کے بعد ''انجمن اتحاد وترقی'' کے فراڈی نام سے ایک صہیونی تنظیم قائم کی، اس تنظیم کا قیام، ترکی عثمانی خلافت کے خاتمہ، ترکی اسلامی تشخص کی بیخ کنی، ترکی کو مغربی طرز تمدن کے نمائندہ اور در پردہ ایک صہیونی ملک بنانے کیلئے عمل میں لایا گیا تھا، لیکن روسی کمیونسٹوں کی طرح مزدوروں اور مظلوموں کے حقوق کے نام سے، جس طرح ایک درندہ صفت، سفاک اور لاکھوں کے قتل عام کی ذمہ دار تنظیم ''کمیونسٹ'' اور ''سوشلسٹ'' کے القاب سے قائم کی گئی تھی، بالکل اسی طرح شروع میں علماء، دانشوروں اور عوام کو ''اتحاد وترقی'' کے نام سے دھوکہ دے کر ایک سفاک، قاتل اور اسلام دشمن صہیونی تنظیم قائم کر دی گئی، اس کا قیام اصلاً ۱۸۶۴ء میں ہوا تھا، ان کو جو اس کے قیام میں شریک تھے ''جدید عثمانی'' اور ''عثمانی

نوجوانوں'' کے ناموں سے متعارف کرایا گیا،انہوں نے ''آزادی'' کے نام سے لندن سے ایک اخبار بھی نکالنا شروع کیا، اور سلطنت عثمانی سے ایک دستوری جمہوری حکومت کا مطالبہ کیا،اوران کے مطالبہ کے دباؤ میں ۱۸۷۶ء میں سلطنت کی طرف سے ایک دستور جاری کیا گیا، ۱۸۷۷ء میں جب روس سے جنگ چھڑی تو سلطان عبدالحمید نے پارلیمنٹ تحلیل کردی،تو ان سازشیوں کی طرف سے سلطان کے خلاف تحریک چھیڑ دی گئی، آخر کار ۱۹۰۸ء میں اس تنظیم کی حکومت کا قیام عمل میں آیا،اور سلطان کو معزول کردیا گیا۔

اس صہیونی تحریک نے بڑی شدت سے ترکی قومیت کا نعرہ لگایا، یادرہے کہ یہی وہ صلیبی اور صہیونی طاقتیں تھیں جنہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف محاذ آرائی کیلئے عربی قومیت کا نعرہ لگایا، اور پھر اسی کے ذریعہ ان کے دین وایمان ،علم وثقافت، حکومت وسیاست، عدلیہ اور انتظامیہ پر شب خون مارا، اور پھر انہیں کہیں کا نہ چھوڑا، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ترکی کو توڑ کر رکھدیا جائے ،اس کے اسلامی وجود کے حصے بخرے کردیئے جائیں، اس انجمن اور تحریک کے بانی مصطفیٰ کمال کو جو صہیونیت کا ایجنٹ تھا، جب مکمل اختیار حاصل ہوگیا تو علماء اور اسلامی دانشوروں کیلئے جیل خانوں اور سولی کے تختوں کا انتظام پورے ملک میں کردیا گیا۔ ہزاروں علماء شہید کئے گئے جو جان بچا کر ہجرت کر سکے ہجرت کر گئے ،اسی ملعون ومجرم نے ترکی کے شیخ الاسلام کے سر پر قرآن کا نسخہ پٹخ کر مارا تھا ،کہ لے جا اپنا قرآن اور اپنی شریعت، اس اسلام دشمنی کے جو شاہد عینی تھے وہ اکثر بچ نہیں سکے۔

شیخ سعید پیراں نے اس کے خلاف انقلاب کی کوشش کی تو ان کو اور ان کی پوری جماعت کو تہہ تیغ کردیا گیا، شیخ سعید نورسی نے اس مجرم کی اسلام دشمنی ، درندہ صفتی ، اور قساوت قلبی کے نظارے دیکھے تھے، اور اس کی جیلوں میں سالوں کاٹے تھے، وہ شیخ سعید پیراں کا انجام بھی دیکھ چکے تھے، اس لئے انہوں نے اس وقت کے حالات میں اور ذہنی وثقافتی ارتداد کے سیلاب میں ایک ایمانی اور قرآنی تحریک کا سہارا لیا، اور چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ کر اور قلموں سے ان نقلیں تیار کرا کر اس ارتداد کے خلاف پشتہ باندھنے کی کوشش کی۔

ایک طرف صہیونی منافق ،اور اسلامی ترکی کے جانی دشمن کی اندرونی کارروائیاں تھیں، تو دوسری طرف پہلی جنگ عظیم کے حالات نے ترکی کو یورپین الائنس کے خلاف جرمنی کے پالے میں ڈھکیل دیا، اس کی شکست کے بعد جرمنی سے زیادہ ترکی کی تکہ بوٹی کردی گئی، اور بلقان کا بڑا حصہ اس سے چھین لیا گیا، بلکہ ''عربی قومیت'' کے سحر سامری نے ، اور ترکی قومیت کے ردعمل اور عربی قومیت کے جنون نے عرب ممالک کو ترکی کا باغی بنادیا، اور چالاک انگریز اور مکار فرانسیسیوں نے ان کی کمر میں خنجر بھونک کر اور ترکی کے ٹکڑے کرکے، اس کو نیم جان کردیا۔

صہیونیوں اور صلیبیوں کی عالمی سازشوں نے جن کا مرکز توجہ اور نشانہ ترکی تھا، بلکہ خلافت عثمانیہ اور اسلامی وجود تھا، ترکی پر پے در پے وار کرکے اس کو زخموں سے چور کردیا، صہیونیت کے بانی ہرزل کی مراد پوری ہوگئی، ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ بالفور نے فلسطین یہودیوں کے حوالے کرنے کا وعدہ کرلیا، سلطان عبدالحمید ثانی کو یہودیوں کے ہاتھوں گرفتار کروا کر وملعون مصطفیٰ کمال نے جیل بھجوادیا، اور ۱۹۲۳ء میں خلافت کے خاتمہ کا اعلان کردیا گیا۔

ترکی کے بیسویں صدی کے اس دور کی خوفناک سازشوں کو جن دو بڑی شخصیتوں نے بڑی گہرائی سے سمجھا، ان میں ایک شیخ سعید نورسی کی شخصیت ہے، جنہوں نے سازشوں کے تانے بانے کیسے بنے جارہے ہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور اس

سفاک اور دردناک دور میں فکری اور ایمانی، انقلاب پر ساری توجہ مرکوز کی، دوسری شخصیت نجم الدین اربکان کی ہے، جنہوں نے کمال اتاترک کے انقلاب کے پیچھے صلیبی اور صہیونی سازشوں کا اتنی گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کا ایسا ادراک کیا، پھر اس کو اس طرح طشت از بام کیا، کہ ترکی میں کیا، عالم اسلام میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے، لیکن ان کو وہ دور ملا جب ۱۹۳۸ء میں انقلاب کا ملعون بانی مر چکا تھا، اور ہزار کوششوں اور قتل وسولی کی وارداتوں کے باوجود ترکی سے اسلام کا خاتمہ نہیں کرسکا تھا، قوم کا ضمیر بیدار تھا، اہل دل تعلق مع اللہ اور اصلاح میں مشغول تھے، اہل فکر ودانش اور علماء ذہن سازی کا کام پوری تندہی سے کررہے تھے، چین اور روس میں جس طرح مسلمانوں نے علماء اور صوفیاء کی زیر نگرانی وقت کے سفاکوں اور کمیونسٹ قاتلوں کے مہیب سائے میں اپنے دین کا تحفظ کیا، اسی طرح ترکی کو بھی خون کی ندیوں سے نکل کر اسلام کے کلمہ کی سربلندی کے سفر میں کوئی طاقت روک نہیں سکی۔

جنگ عظیم دوم کے بعد آزادی کی لہر اور متعدد پارٹیوں کے نظام نے سیاسی حالات بدلنے میں بڑا کردار ادا کیا، لیکن اسلام کی بیخ کنی، اور ہر اسلام پسند تحریک کو کچلنے کیلئے صہیونیت کی تیار کردہ فوج، پولیس، عدلیہ، پریس پل پل پر نظر رکھتی رہی اور ہر وقت اسلام کا گلا گھوٹنے کیلئے تیار رہی۔

اس صہیونی ایجنٹ کی موت کے بعد، اس کے فوجی رفیق عصمت اینونو کو صدر بنادیا گیا، جو اسی روش پر چلتا رہا اور ظلم وجبر کی داستان لکھتا رہا۔

۱۹۴۶ء میں حزب مخالف ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کو انتخابات میں جلال بایار کی قیادت میں کامیابی ملی، ۱۹۴۷ء میں بعض اسلامی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۱۹۵۰ء کے عام انتخابات میں عدنان مندریس کو کامیابی ملی، انہوں نے عربی مین اذان پر پابندی کو اٹھالیا، اور اسلامی رجحانات کا ساتھ دیا، ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۷ء تک ۱۵۰۰ نئی مساجد تعمیر کی گئیں، لیکن اسلام سے دلچسپی کے جرم میں ۱۹۶۰ء میں صہیونی فوج نے عدنان مندریس کے خلاف انقلاب برپا کرکے ان کو جیل کے حوالے کیا، پھر سولی پر چڑھادیا، فوج میں جمال جورسیل، مصطفیٰ کمال کا نمائندہ اور اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ یہ انقلاب اسی ملعون نے برپا کیا تھا، اور وہ ۱۹۶۳ء تک ترکی کا صدر رہا، ۱۹۶۰ء کے بعد الیکشن میں سلیمان دیمیریل کی پارٹی ''جسٹس پارٹی'' کو زبردست کامیابی ملی تھی، جس کی بنیاد پر عصمت اینونو کو ان کے ساتھ مل کر حکومت بنانی پڑی تھی، ۱۹۶۳ء میں عصمت اینونو نے استعفادے دیا، اور جمال جورسیل اپنی موت مرا، تو جنرل جودت کو ۱۹۶۶ء میں صدر بنادیا گیا، اس کے مرنے کے بعد دیمیریل نے اسلامی رجحانات کا کھل کر اظہار کیا۔

رجب طیب اردوغان ۱۹۵۴ء میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد، ائمہ وخطباء کے ثانوی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، پھر مرمرہ یونیورسٹی کے شعبہ تجارت واقتصادیات میں داخلہ لیا، اسی زمانہ میں وہ نجم الدین اربکان کی حزب السلامۃ الوطنی الاسلامی National Islamic Peace (Party) کی یوتھ ونگ کے رکن بن گئے، آگے چل کر وہ استانبول کی یوتھ ونگ کے صدر منتخب کئے گئے۔

نجم الدین اربکان استانبول یونیورسٹی میں آٹو موبائل انجینئرنگ کے استاد تھے، وہ سلیمان دیمیریل کی جسٹس پارٹی کے سرگرم رکن تھے، نجم الدین اربکان اپنی اسلامیت اور ترکی کی اسلامیت کا کھل کر اظہار کرتے تھے، ۱۹۶۹ء کے الکشن میں سلیمان دیمیریل نے احتیاطاً ان کا نام نمایاں نہیں کیا، یہاں سے نجم الدین اربکان کی ان سے علیحدگی ہوگئی، اور

وہ قونیہ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے،۱۹۷۰ء میں انہوں نے اپنی الگ پارٹی ''قومی نظام پارٹی'' کے نام سے قائم کی لیکن اس پارٹی کے واضح اسلامی رجحانات کی وجہ سے ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب میں اس کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔

۱۹۷۲ء نجم الدین اربکان نے ''حزب السلامۃ الوطنی'' کے نام سے دوسری پارٹی کی تشکیل کی ،اور سلیمان عارف امرہ کو پارٹی کی کمان سونپی،۱۹۷۳ء کے الکشن میں پارٹی کو کامیابی ملی، اور ریپبلکن پارٹی کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت قائم کی گئی،جس میں اربکان نائب وزیراعظم تھے،اس دوران ائمہ وخطباء کے مدارس میں بڑا اضافہ ہوا،اربکان صاحب نے کھل کر اسلامی نظام کی دعوت دینا شروع کی،انہوں نے مسئلہ فلسطین پوری قوت کے ساتھ اٹھایا، اور اسرائیل سے تعلقات منقطع کرنے کی بات کہنا شروع کی،سودی نظام کے خاتمہ کا مطالبہ بھی کیا،آخر ستمبر ۱۹۸۰ء میں پھر فوجی کریک ڈاؤن ہوا، پارٹیوں اورخاص طور پر اربکان صاحب کی پارٹی پر پابندی لگادی گئی، جنرل کنعان اس انقلاب کا محرک تھا،بعد میں وہ ترکی کا صدر بنا۔

۱۹۸۳ء میں نجم الدین اربکان نے'' رفاہ پارٹی'' قائم کی،اس وقت اردغان اس پارٹی میں شامل ہوگئے،وہ نجم الدین اربکان کو مرشداوراستاد مانتے تھے،اور اربکان انہیں بہت عزیز رکھتے تھے،آگے چل کراردغان حزب الرفاہ کی استانبول شاخ کے صدر بن گئے۔

۱۹۸۹ء میں حزب الرفاہ کو زبردست کامیابی ملی ،اردغان استنبول سے کامیاب ہوئے،۱۹۹۱ء میں وہ پارٹی کی طرف سے پارلیمانی انتخاب میں شریک ہوئے ۱۹۹۴ء میں استنبول کے میئر منتخب ہوئے،انہوں نے استنبول کے قدرتی حسن میں اپنی کارکردگی سے چار چاند لگائے،۱۹۹۷ء میں اردغان کو ایک تقریر میں اسلامی جذبات کے اظہار کی وجہ سے گرفتار کرلیا گیا، وہ ایک سال جیل میں رہے،انہوں نے گرفتاری کے ان دنوں میں اس پر غور کیا کہ استاد محترم کی صریح پالیسوں کی وجہ سے دشمن کو جو موقعہ مل رہا ہے اس کا سلسلہ بند کرنا چاہیے،اور'' Tit for Tat''جیسے کو تیسا'' کی پالیسی اختیار کرنی چاہئے،ان کے ذہن میں نئی پارٹی کا نقشہ گھومنے لگا،جو دشمنوں کا جواب انہی کی سیاست سے دے۔

ادھر ۱۹۹۷ء میں اربکان صاحب کی کھلی اسلامی پالیسیوں کی وجہ سے حزب الرفاہ پر پابندی لگا دی گئی ،اور اربکان صاحب پر عدالت کی طرف سے یہ پابندی لگادی گئی کہ وہ کسی سیاسی سرگرمی میں شریک نہیں ہوں گے،۱۹۹۸ء میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ نجم الدین اربکان صاحب نے حزب الفضیلہ نامی پارٹی کی تشکیل کی،۱۹۹۹ء کے انتخابات میں پارٹی کو سبقت حاصل ہوئی اور رجائی قوطان پارٹی کے صدر منتخب ہوئے،لیکن عبداللہ گل اور اردغان نے پارٹی میں یہ مطالبہ شروع کیا کےٹکراو کی پالیسی ختم کی جائے،لیکن پارٹی اپنے رخ پر آگے بڑھتی رہی،آخر ۲۰۰۰ء میں فوجی بغاوت ہوئی، پارٹی کو تحلیل کردیا گیا،اور اربکان صاحب کو گرفتار کرلیا گیا،ان حالات میں اردغان صاحب نے اپنی ایک نئی پارٹی'' جسٹس اینڈ ڈبولپمنٹ پارٹی''''حزب العدالۃ والتنمیۃ'' کی تشکیل کی ،نجم الدین اربکان صاحب نے حزب الفضیلۃ کی تحلیل کے بعد حزب السعادہ قائم کے نام سے پارٹی قائم کی۔

۲۰۰۲ء کے الیکشن میں رجب اردغان کی پارٹی کو زبردست کامیابی ملی،وہ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری،اور نجم الدین اربکان کی پارٹی کو دس فیصد وٹ بھی نہ ملے،وہ پارلیمنٹ سے خارج ہوگئی۔

۲۰۰۰ء سے یعنی ہزارۂ سوم کے آغاز سے ترکی کی سیاست میں ایک گہری تبدیلی آئی، سیاست کا مقابلہ دینی نعروں اور محض قومی خدمات سے کرنے کے بجائے ٹھوس ترقیاتی پالیسیوں کے ساتھ سیاست کی بساط کو سیاست سے الٹنے کا عمل شروع ہوا، سیکولرسٹوں کے منہ سے ہر تبدیلی پر صاد کروایا گیا، سیکولرزم کے جابرانہ استعمال پر ڈیموکریسی سے پابندیاں لگائی گئیں، یوروپین یونین کے تعلقات کا مطالبہ پوری قوت سے کیا گیا، اور یوروپی یونین کے قوانین اسی بہانہ نافذ کئے جانے لگے، جن کا مقصد یوروپی کلچر اور تمدن نہیں تھا، اس کی مثبت چیزوں کو اختیار کیا جاچکا تھا، اب ان قوانین کے ذریعہ ترکی کے جابرانہ اور استبدادی سیکولر نظام کے ناخن تراشنے تھے، صہیونی فوج کے پر کاٹنے تھے، عدالتی نظام کو اپنے حدود میں رہنے پر مجبور کرنا تھا، حقوق انسانی کے تحفظ کے انتظامات کرنے تھے۔

رجب طیب اردوغان کی یہ وہ ڈپلومیسی تھی، جس سے عوام خوش تھے، کہ وہ ان کے حقوق کی ضمانت کررہی تھی، فوج اور عدلیہ خاموش تھی، کہ اس کو کوئی حیلہ ہاتھ نہیں آرہا تھا، مذہب کی آزادی، حجاب کی آزادی، دینی تعلیم کی آزادی، جمہوریت اور سیکولرزم کا بنیادی تقاضہ تھا، اور یہ سب بظاہر یوروپ کے دوش بہ دوش کھڑے ہونے کے لئے ہورہا تھا، اس کا تقاضہ تھا کہ خارجہ پالیسی وسیع ہو، نرم ہو، اس میں کھلا پن ہو۔

آخری عثمانی دور میں جو رشتے عالم عربی سے اور شرق اوسط سے توڑ دیئے گئے تھے، اور اس کاروائی میں اندر کے صہیونی اور باہر کے صہیونی دونوں شامل تھے، اب دوبارہ ان کو جوڑا جارہا تھا، مسئلہ فلسطین اقوام متحدہ کی قراردادوں کی بنیاد پر حل کرنے کا مطالبہ کیا جارہا تھا۔

ترکی کو معاشی طور پر صہیونیوں نے کنگال بنایا، یوروپ نے اس کو ننگا بچا کیا تھا، اور ترکی کو مرد بیمار کا لقب دیا تھا، ظاہر ہے کہ یہ ترکی کے دشمنوں کی کاروائیاں تھیں، نجم الدین اربکان تو عالمی نظام کو اسلامی نظام سے بدل دینے کے داعی تھے، بات ان کی سو فیصد برحق تھی، لیکن ماحول کے منافقین اسے چلنے نہیں دے رہے تھے، **رجب طیب اردوغان نے ''میاں کا جوتا میاں کے سر'' کی پالیسی اپنائی تھی، عنوانات کچھ ہوں، لیکن خط کا مضمون کچھ، راز داری کہ یہ وہ قسم تھی جو ماسونیت کا ترکی بہ ترکی جواب تھی، جس میں لفاظی نہیں تھی، صرف اور صرف عمل تھا، تمدنی ترقیاں معاشی ترقیوں اور معاشی استقلال اور آزادی کی متقاضی تھیں، دھیرے دھیرے قدم ادھر بڑھ رہے تھے جس سے عوام کا اعتماد بڑھتا جارہا تھا، یہاں تک کہ محض ۱۰-۱۵/سال میں اردوغان کی معاشی پالیسوں نے ترکی کو قرضوں سے آزاد کردیا، اور برآمد کرنے والوں ملکوں میں ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں لاکھڑا کیا۔**

بہرحال ۲۰۰۷ء کے الیکشن میں اردوغان کی پارٹی کو پہلے سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی، انہیں ۳۴۱- پارلیمانی سیٹیں حاصل ہوئیں، اور ۴۷٪ فیصد ووٹ حاصل ہوئے، اردوغان کی صدارتی مدت ختم ہورہی تھی، انہوں نے عبداللہ گل کو صدارتی عہدہ کے لئے نامزد کردیا، جو اپنے اسلامی رجحانات میں ترکی میں معروف ہیں، اور اردوغان کے پرانے رفیق۔

اس دور حکومت میں ترکی کی برآمدات کی شرح (۱۱۷) ارب ڈالر تک پہونچ گئی، اور یہ کہا جانے لگا کہ ۲۰۲۳ء تک ترکی دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ معیشتوں میں بلندترین پوزیشن پر ہوگا، اس دور میں اردوغان نے عدالتی نظام میں بنیادی اصلاحات کیں، اور فوجی کارروائیوں کے پس پشت خفیہ صہیونی تنظیم ''ارجنکون'' پر ہاتھ ڈالا، اور متعدد جنرلوں، اور سازشیں تیار کرنے والے افراد کا پردہ فاش کرکے ان کو گرفتار کیا، ان کی تعداد (۸۴) تھی، ''دوجان'' نامی میڈیا گروپ کی

۳ہزارارب ڈالرٹیکس چوری کی بنیاد پرسخت گرفت کی،اوراس کے تانے بانے بکھیر دیئے۔

اسی دورمیں رجب طیب اردوغان نے دستور میں بنیادی تبدیلیوں کے لئے ریفرنڈم کرایا،جس میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی،اور وہ ترکی کے سب سے زیادہ بااختیار اور صاحب اقتدارصدربن کرابھرے۔

۲۰۱۱ء کے پارلیمانی انتخابات سے پہلے رجب طیب اردوغان کے استادومرشد نجم الدین اربکان کا انتقال ۲۷/فروری ۲۰۱۱ء میں ہوگیا،ان کی پارٹی ''حزب السعادۃ'' مزید کمزورہوگئی،اب ان کے بعداس کے پاس کوئی ان جیسا قائد نہ تھا،۲۰۱۱ء کے انتخابات میں اردوغان کو زبردست کامیابی ملی، ان کو ۵۰٪ووٹ ملے،جب کہ ووٹنگ ۸۶ فیصدتھی۔

لیکن ۲۰۱۱ء کا سال عالم عربی میں عوامی انقلابات کا ہنگامی سال تھا،جس میں تونس کا حکمراں ملک سے فرار ہوا،لیبا کا حکمراں مارا گیا،مصرکا حکمراں جیل کے حوالہ ہوا،یمن کا حکمراں خانہ جنگی کی آگ میں جھلسا،شام کا حکمراں خفیہ اسرائیلی ایجنٹ کی حیثیت سے سامنے آیا،یہیں سے ترکی ایک نئے عالمی دورمیں داخل ہوگیا،اس نے عالم عربی میں عوامی انقلابات کا ساتھ دیا،اوراس کے نتیجہ میں تونس میں راشدالغنوشی،اورمصر میں ڈاکٹرمرسی کی جمہوری حکومتوں کی کھل کرتائید کی،ساتھ ہی ساتھ''غزہ'' کی حکومت اورتنظیم حماس کی کھل کرتائیداورمدد کی، شام کے مہاجرین اور عالم عربی کے تمام مہاجرین کا ترکی میں فیاضانہ اور برادرانہ استقبال کیا،انصارومہاجرین کی تاریخ ایک مرتبہ ترکی میں پھر دہرائی گئی،برما کے مظلومین کے لئے اس نے قوت سے آواز اٹھائی،وہاں کے مہاجرین کی نصرت کے وعدہ کے ساتھ بنگلہ دیش کی حکومت سے ان کو اپنے ملک میں جگہ فراہم کرنے مطالبہ کیا۔

دنیا کے مسلمانوں اور پوری ملت اسلامیہ کوترکی کے اس کردارمیں عثمانی خلافت کی جھلک نظرآنے لگی،انہیں ایسالگا کہ وہ دورپھرواپس آرہا ہے جب ترکی عالم اسلام کا مرکز تھا،۳۰-۴۰لاکھ شامی مہاجرین کوترکی نے نہ صرف اپنے ملک میں رہائش دی، بلکہ سیرین آرمی اوردیگر جہادی تنظیموں کی کھل کرمدد کی۔

شام کا جو چہرہ اس دور میں سامنے آیا،اس میں ایران سنیوں کی دشمنی میں پوری طرح ننگا ہوگیا،امریکا کے جھوٹ،جعلسازی،اورآخری درجہ کی بے غیرت سیاست کے سارے پردے فاش ہوگئے،روس اپنے ۱۹۱۷ء کے فاشسٹ، کمیونسٹ،قاتلانہ،درندہ صفت نظام کا جامہ پھاڑکراسلام دشمنی کے جنون کے ساتھ میدان میں اپنے جہنمی ہتھیاروں کے ساتھ کودپڑا،عالمی سیاست کے ایسے ایسے کھیل،ایسی ایسی گند،اورایسی ایسی دجالیت دیکھنے کوملی،جس کا غالبًاماضی میں کبھی اتنا کھل کرتجربہ نہ ہوا ہوگا۔

ترکی اکیلا میدان میں تھا،اسے سب سے نمٹنا پڑرہا تھا،اگر نجم الدین اربکان ہوتے تو غالبًا آرپارکی لڑائی میں ترکی کود جاتا،لیکن یہ بساغنیمت تھا کہ اردوغان کی داخلی سیاست نے خارجہ پالیسیوں میں بھی امریکا،روس اوراسرائیل کو مات دے دی۔

یہ وہ منظرنامہ جس میں اب امریکا اوراسرائیل اوران کی دوست عرب منافق حکومتوں کے پاس غنڈہ گردی،مافیا گروپ کی ماردھاڑ،اورعلاقہ کے گندے اوباشوں کے ہتھیاروں کے علاوہ کچھ نہیں بچا،یہ غنڈہ گردی تونس سے شروع ہوئی،جس کا بھگوڑا حاکم ریاض میں پناہ گزین تھا،اورابھی بھی ہے،پھرلیبیا کی خانہ جنگی تک پہونچی،مصرمیں جمہوری حکومت پراس نے

شب خون مارا، اسرائیل کی ایجنٹ حکومت وہاں قائم کی، یمن میں اس خطرہ سے کہ کہیں اخوانی نہ آجائیں، حوثیوں کی مدد کی، پھر خانہ جنگی کروائی، اور اب یمن کو ملبوں کے ڈھیر میں تبدیل کیا جارہا ہے۔

یہی وہ مافیا گروپ تھا، جس میں امریکہ کی سرپرستی اور گہری سازش میں مسلمانوں کا **''مذہبی پادری''** فتح اللہ گولن داخلی سازش کے تانے بانے بن رہا تھا، اور جس میں خارجی دنیا میں اسرائیل، امارات عربیہ اور مصر وسعودی عرب پیسے اور میڈیا اور سازشوں کے ذریعہ شریک تھے، ۲۰۱۶ء میں جولائی کے مہینہ میں راتوں رات چوروں، ڈکیتوں، اور مافیائی مجرموں کی طرح ناپاک فوجی انقلاب برپا کیا گیا، جو خدانخواستہ اگر کامیاب ہوجاتا، تو ترکی دوبارہ ۱۸-۱۹۱۷ء کے دور میں واپس چلا جاتا، لیکن اللہ کو یہ منظور نہ تھا، عالم عربی کے مظلوموں کا خون، ان کی چیخیں اور سسکیاں اس کو سہارا دے رہی تھیں، انقلاب ناکام ہوا، اور اردوغان کو عوامی طاقت کے ساتھ، اسی انقلاب نے قانونی اور سیاسی طاقت سے مالا مال کیا، اور ترکی خون کے کنویں میں غوطہ لگا کر نکلا، اور اس نے ۲۰۱۸ء کے بڑے عوامی اور سیاسی انقلاب کی تیاری شروع کردی، جس میں اب مکمل اختیارات کے ساتھ صدارتی نظام کی بنیاد پر اردغان اور ان کی پارٹی کو اقتدار ملنا تھا، اور ۲۰۲۳ء تک انہیں پہونچنا تھا، تاکہ ترکی کا سوسالہ ذلت آمیز معاہدہ اپنے اختتام کو پہونچے۔

جن مافیاز نے انقلاب برپا کیا تھا، وہ پوری طاقت سے اردوغان اور ان کی پارٹی کو اس فیصلہ کن الیکشن میں ناکام کرنے پر تل گئے، جو غلاف کعبہ کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے، وہ بھی اسرائیل دوستی میں ننگے ہوگئے، پوری دنیا کے سازشی لاؤلشکر، اور ملک کے اندر کمال کے صہیونی ایجنڈے کے محافظ ایک طرف تھے، دوسری طرف اردوغان تھے، اور ترکی کے مخلص اور وفادار مسلمان، عالم اسلام کے عوام اور پوری ملت کے خورد و بزرگ، مرد و خواتین اردوغان کے ساتھ تھے۔

۲۴/ جون ۲۰۱۸ء کی تاریخ بڑی فیصلہ کن اور تاریخ ساز ہونے جارہی تھی، پورے رمضان فرزندان ملت منافقوں اور دشمنوں کے خلاف بدعا کررہے تھے، قنوت نازلہ پڑھ رہے تھے، اور اردوغان کے حق میں دعا کررہے تھے، ایسا لگتا تھا کہ اردوغان اس دور کے صلاح الدین ہیں، یا محمد الفاتح، یا کم از کم سلطان عبدالحمید ہیں، لوگ امیدوں کی دنیا میں ان کو خلافت عثمانیہ کا پرتو، عالم اسلام کا ہیرو، ملی غیرت وحمیت کی آبرو سمجھ رہے ہیں، بہرحال مظلوموں اور کمزوروں کی دعاؤں سے جون ۲۰۱۸ء کے الیکشن میں وہ کامیاب ہوگئے، انہیں مبارکبادیں دی گئیں، ان سے توقعات قائم کی گئیں، اب مستقبل کی طرف لوگ ٹکٹکی لگائے ہیں۔

بڑے قابل مبارکباد ہیں ڈاکٹر راغب السرجانی کہ انہوں نے وقت کے اس موضوع پر قلم اٹھایا، اور اردوغان کی کہانی میں ترکی کی کہانی سنادی، حال کو مستقبل سے جوڑ دیا۔

ہمارے برادر عزیز طارق ایوبی بھی دوہری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ ۲۰۱۱ء سے اپنے قلم سے حق کی جنگ لڑ رہے ہیں، ''ندائے اعتدال'' کے صفحات پر انہوں نے منافقوں کی بخیہ دری بھی کی، مغفلوں اور نادانوں کی دبیز عینک بدلنے کی بھی کوشش کی، اور اخیر میں اردوغان کے الیکشن میں اپنے قلم سے شریک ہوگئے، اور اب الحمدللہ فتح کی خوشخبریاں لئے ہوئے اردو قارئین سے مخاطب ہیں، اللہ تعالیٰ ہی ان کو جزائے خیر سے نوازے، اور زبان وقلم کی طاقت میں روزافزوں اضافہ کرے، آمین۔

☆☆☆

گوشۂ ترکی

نورسی تحریک اور ترک معاشرہ پر اس کے اثرات

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند

کسی خطۂ زمین میں اسلام کے عروج، زوال اور پھر عروج کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کی بہترین مثال ترکی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب پوری دنیا پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سلاطین بڑے کرّ وفر کے مالک تھے۔ ایک بڑے خطۂ زمین پر اس کی حکم رانی قائم تھی۔ دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں اس کے سامنے لرزاں و ترساں رہتی تھیں۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ اس کی حدودِ مملکت سکڑتی اور سمٹتی چلی گئیں، دیگر ممالک اس پر شیر ہو گئے، یہاں تک کہ انھوں نے عسکری طاقت کے بل پر اس کے حصے بخرے کر دیے۔ اس عرصے میں اس کے ایک فوجی جرنل نے کچھ دم خم دکھایا۔ اس نے ترکی کے دشمنوں سے لوہا لیا اور مملکت کو بچا کر جدید ترکی کی تعمیر کی، لیکن اس نے غضب یہ کیا کہ اپنی حدودِ مملکت سے اسلام کو دیس نکالا دے دیا۔ اس نے خلافت کی قبا چاک کر دی، اسلام کا نام لینے کو جرم قرار دیا، اتنا سنگین جرم کہ اس کی سزا موت قرار پائی، اذان پر پابندی عائد کر دی، مساجد کو میوزیم اور گوداموں میں تبدیل کر دیا، دینی مدارس و مکاتب پر تالے ڈال دیے، شرعی عدالتوں کو بند کر دیا اور اوقاف کو ختم کر دیا، اسلامی کلینڈر کی جگہ مغربی کلینڈر جاری کیا، ترکی زبان کے رسم الخط کو عربی سے بدل کر لاتینی کر دیا، خواتین کے لیے حجاب پر پابندی عائد کر دی۔ الغرض اس نے سیکولرازم یعنی لادینیت کو اپنا قبلہ و کعبہ بنا لیا اور اسلام کو کھرچ کھرچ کر مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن یہ تمام کوششیں ترک عوام کے دلوں سے اسلام کو محو کر دینے میں کام یاب نہ ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ بندوں کو توفیق دی کہ وہ اسلام کی شمع جلاتے رہیں اور شدید طوفانوں کے باوجود اس کی لَو کو بجھنے نہ دیں۔ انھوں نے اس راہ میں بے مثال قربانیاں پیش کیں، قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں، جلاوطنی کی زندگی گزاری، دار و رسن کو چوما، حکومت و اقتدار سے بے دخل کیے گئے، پابندیوں پر پابندیاں قبول کیں، لیکن نہ بکے، نہ تھکے، نہ اپنی راہ کھوٹی کی۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں دھیرے دھیرے ترکی میں اسلام کا کلمہ بلند ہونے لگا، مساجد کے میناروں سے اذانیں سنائی دینے لگیں، مدارس و مکاتب پھر آباد ہونے لگے، خواتین اپنی مرضی سے حجاب اختیار کرنے لگیں اور اس پر روک ٹوک باقی نہ رہی، غرض ترکی میں اسلام کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

ترکی میں اسلام کے احیاء کے میدان میں اللہ کے جن بندوں نے غیر معمولی خدمات انجام دیں ان کی طویل فہرست ہے۔ ان میں ایک نمایاں نام شیخ بدیع الزماں نورسی کا ہے۔ ترکی ادبیات کے ماہر جناب ثروت صولت نے انھیں درج ذیل الفاظ میں خراج پیش کیا ہے:

"ترکی میں تجدید و احیائے اسلام کے فرض کو گزشتہ نصف صدی میں جس عظیم ہستی نے انجام دیا وہ استاد بدیع الزماں نورسی کی ذات ہے۔۔۔ وہ بلاشبہ اس صدی کی عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی کوششوں سے ترکی میں جس طرح اسلام کا احیاء ہوا ہے اس کی مثال شاید آسانی سے نہ پیش کی جا سکے۔ ان کی اصل

اہمیت اور عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ناسازگار حالات میں اسلام کی شمع روشن رکھنے کی کوشش جاری رکھی اور پچیس سال کی جدو جہد کے بعد ترکی کو مذہب دشمنی کی راہ سے ہٹا کر ایک بار پھر خادمِ اسلام ملک کی حیثیت میں تبدیل کر دیا۔'' (ثروت صولت، ترکی کا مردِ مجاہد، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی۔۱۹۹۶ء، ص ۹۔۱۰)

سعید نورسی ترکی کے صوبے 'تبلیس' کے ضلع ہیزان کے گاؤں 'نورس' میں ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے انھیں نورسی کہا جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد سے حاصل کی۔ بعد میں مختلف اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔ ان کا حافظہ بڑا غضب کا تھا۔ جو کچھ پڑھتے تھے سب یاد ہو جاتا تھا، ابھی سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے تھے کہ مختلف علوم کی اسّی (۸۰) کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان کی قوت حافظہ اور غیر معمولی ذہانت کی خبر وقت کے علماء کو ہوئی تو انھوں نے ان کا امتحان لینا چاہا۔ انھوں نے مختلف سوالات کیے جن کے نورسی نے صحیح صحیح جوابات دیے۔ یہ دیکھ کر علماء بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ نوجوان تو 'بدیع الزمان' (یعنی نادرِ روزگار) ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ لقب ان کے نام کا جز بن گیا۔

شیخ نورسی نے دینی تعلیم عام کرنے کی غرض سے مصر کی جامعۃ الازہر کے طرز پر جامعۃ الزہراء قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ پر ۱۹۵۱ء میں اس وقت عمل ہو سکا جب ترکی کے وزیر اعظم عدنان مندریس کی جانب سے ان کو مالی امداد فراہم کی گئی۔ اس جامعہ میں عربی، ترکی اور کردی تینوں زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی، البتہ سب سے زیادہ زور عربی زبان پر دیا جاتا تھا اور روایتی علوم کے ساتھ جدید علوم کو بھی شاملِ نصاب کیا گیا تھا۔

مغربی فکر سے متاثر ترک نوجوانوں نے انجمن اتحاد و ترقی قائم کی، جس کا مقصد ترکی سے خلافت کا خاتمہ اور مغربی افکار و اقدار کی بالادستی قائم کرنا تھا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ۱۹۰۹ء میں انجمن اتحاد محمدی کی تشکیل کی گئی۔ اس کے بانیوں میں شیخ سعید نورسی کا بھی نام ملتا ہے۔ اس انجمن کا مقصد اسلام کی بنیاد پر خلافت کی تشکیلِ نو کرنا اور اتحادِ اسلامی کو فروغ دینا تھا۔ اس انجمن کی تشکیل کے کچھ ہی عرصہ بعد بغاوت پھوٹ پڑی، جس میں انجمن کے متعدد افراد سمیت سعید نورسی بھی ماخوذ ہوئے۔ انھیں جیل میں ڈال دیا گیا، ان پر مقدمہ چلا، لیکن عوامی دباؤ کے نتیجے میں جلد ہی انھیں رہا کر دیا گیا۔

جنگ عظیم اول کے دوران سعید نورسی نے فوج میں رضا کارانہ خدمت انجام دی۔ اس عرصہ میں بھی وہ نوجوانوں کی تربیت سے غافل نہیں ہوئے۔ وہ ان کے سامنے قرآن اور اسلامی علوم کا درس دیتے۔ اسی عرصے میں انھوں نے 'اشارات الاعجاز فی مظان الایجاز' تصنیف کی۔ دورانِ جنگ وہ روسیوں کے ہاتھوں قید ہو کر سائبیریا بھیج دیے گئے۔ ایک طویل عرصے تک انھوں نے وہاں کی تکلیفیں برداشت کیں، پھر وہاں سے فرار ہو کر جرمنی، ویانا اور بلغاریہ ہوتے ہوئے واپس استنبول پہنچے۔

استنبول آمد کے بعد ہمیں شیخ سعید کی زندگی میں زبردست تبدیلی نظر آتی ہے۔ انھوں نے سیاسی سرگرمیوں سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ وہ دریائے باسفورس کے کنارے ایک گاؤں منتقل ہو گئے اور وہاں قرآن مجید کے مطالعہ اور غور و تدبر میں مشغول ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں انھیں احساس ہوا کہ ان کے اندرون کی تاریکیاں چھٹ گئی ہیں اور قرآن مجید کے نور سے ان کا وجود منوّر ہو گیا ہے۔ اس تجربے نے شیخ کی آئندہ کی تحریروں اور بیانات کا رخ متعیّن کر دیا اور قرآن سے افادہ و استفادہ کی تحریک نے 'رسائلِ نور' کا قالب اختیار کر لیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے نے ترکی فوج کو منظّم کر کے بیرونی طاقتوں کے حملے کو پسپا کر دیا تھا اور ترکی قوم کے اندر بیداری اور خود اعتمادی کی روح پھونک دی تھی۔ اس کے پیش نظر ابتدا میں شیخ کے دل میں اس کا احترام پایا جاتا تھا۔ وہ اسے الحاد کی تاریکی سے نکال کر اسلام کی روشنی میں لانا چاہتے تھے۔ لیکن لادینی عناصر نے شیخ کے اس ارادے کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ مصطفیٰ کمال شیخ کی غیر معمولی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنا آلۂ کار بنانا چاہتا تھا، اسی لیے اس نے ان کو مشرقی اناطولیہ کا رئیس الواعظین مقرر

کیا اور دار الحکمۃ بورڈ کا رکن بنا دیا۔ لیکن شیخ سعید نے اپنی فراستِ ایمانی سے اس کی نیت تاڑ لی اور اس کی تمام نوازشوں کو ٹھکرا کر انقرہ سے وان چلے گئے۔ یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔ یہیں سے شیخ نے سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر خاموش دعوت و تبلیغ اور تربیت و تزکیہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی۔

۱۹۲۵ء میں الحادی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت سے شیخ نورسی کا کوئی تعلق نہ تھا، لیکن محض شک کی بنیاد پر انھیں گرفتار کیا گیا اور وہاں سے مشرقی اناطولیہ کے ایک گاؤں بردور میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کے بعد تو قید و بند، پولیس کی نگرانی میں نظر بندی، جلاوطنی، ایذا و تعذیب، عدالت میں پیشی، جھوٹے مقدمات اور بے بنیاد الزامات وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس سے شیخ کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔ لیکن ان کے پائے ثبات و استقامت میں ذرا بھی لرزش نہ آئی۔ انھوں نے رسائل نور کی تصنیف و تالیف اور ان کی خفیہ ترسیل و اشاعت کا کام جاری رکھا۔ بردور سے انھیں جلاوطن کر کے اسپارٹا کے ایک گاؤں بارلا بھیج دیا گیا، جہاں وہ آٹھ سال مقیم رہے۔ وہاں پولیس کا سخت پہرہ بٹھا دیا گیا اور کسی کو بھی ان سے ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن ان کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر ان کے پہرے دار ہی ان کے ہم نوا بن گئے۔ وہ وہاں جو رسائل تصنیف کرتے انہی پہرے داروں کے ذریعے وہ دوسرے لوگوں تک پہنچتے۔

۱۹۳۴ء میں شیخ نورسی پر خفیہ مذہبی تنظیم قائم کرنے اور ترکی کے سیکولرزم کے خلاف کام کرنے کا الزام لگا کر انھیں ان کے ڈیڑھ سو شاگردوں کو گرفتار کیا گیا۔ مقدمہ چلایا گیا، لیکن ان کے خلاف کوئی پختہ ثبوت نہ مل سکا، پھر بھی پندرہ دیگر افراد کے ساتھ انھیں چھ ماہ کی سزا سنائی گئی۔ رہائی کے بعد انھیں بحر اسود کے ساحل پر آباد ایک گاؤں 'کستامانو' جلاوطن کر دیا گیا۔ وہاں بھی انھوں نے رسائل نور کی تصنیف اور ان کی اشاعت کا کام جاری رکھا۔ ۱۹۴۳ء میں انھیں ایک بار پھر عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا اور ان پر حکومت کے خلاف سرگرمیاں انجام دینے کا الزام لگایا گیا۔ انقرہ یونی ورسٹی کے پروفیسرس پر مشتمل ایک ٹیم بنائی گئی جس کے ذمے ان کے رسائل کا جائزہ لینے کا کام سونپا گیا۔ کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ یہ رسائل خالص مذہبی نوعیت کے ہیں۔ اس کی رپورٹ پر انھیں بری کر دیا گیا اور انھیں رہائی مل گئی۔

۱۹۴۷ء میں شیخ نورسی کو ایک بار پھر افیون جلاوطن کر دیا گیا۔ وہاں پولیس کا سخت پہرہ بٹھا دیا گیا اور ان سے لکھنے پڑھنے کی آزادی بھی چھین لی گئی۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ متعدد افسران ان کی تقریروں اور تحریروں سے متاثر ہو کر ان کے معتقدوں میں شامل ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کے تعاون سے انھیں کارکنوں سے ملنے اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت مل گئی، ۱۹۴۷ء کے اواخر میں ایک بار پھر انھیں عدالت میں طلب کیا گیا اور پرانے الزامات دہرا کر بیس ماہ کی سزا سنائی گئی۔ ترکی کے مختلف مقامات سے شیخ کے ان عقیدت مند کارکنوں کو بھی پابندِ سلاسل کیا گیا جو رسائل نور کو تقسیم کرتے تھے۔ عدالتِ عالیہ نے یہ سزا منسوخ کر دی، لیکن انھیں دوبارہ اسی الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ دو سال کی نظر بندی کے بعد ستمبر ۱۹۴۹ء میں ان کی رہائی ہوئی۔

شیخ نورسی نے اب اپنی دعوت کا مرکز مشرقی اناطولیہ کے بجائے دیار بکر کو بنایا۔ اس سے حکومت کی جارحانہ کارروائیوں میں کچھ کمی آئی۔ اس عرصے میں رسائلِ نور کی توسیع و اشاعت میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ انقرہ اور استنبول کی یونی ورسٹیوں کے طلبہ میں یہ رسائل بہت مقبول تھے۔ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان کی تعلیمات و افکار سے کافی متعارف ہو چکا تھا۔

۱۹۵۰ء میں عدنان مندریس ترکی کے وزیر اعظم بنے تو انھوں نے اسلامی افکار و اقدار کے بارے میں کچھ نرمی کی پالیسی اختیار کی۔ لیکن پھر بھی شیخ نورسی کے ابتلا و آزمائش میں کچھ کمی نہیں آئی۔ ۱۹۵۲ء میں انھیں ان کے رفقاء کے ساتھ ایک بار پھر گرفتار کیا گیا اور استنبول میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان پر رسائلِ نور کی اشاعت اور تقسیم کے ذریعے حکومتی پالیسیوں کی مخالفت کی فردِ جرم عائد کی گئی۔ عدالت میں جرم ثابت نہ ہو سکا تو انھیں رہا کر دیا گیا،

لیکن استنبول چھوڑ کر امیر ڈاگ چلے جانے کی ہدایت دی گئی۔

۱۹۵۳ء میں شیخ اسپارٹا منتقل ہو گئے، جہاں انھوں نے زندگی کے باقی ایام گزارے۔ یہاں ان کے معتقدین کی ایک بھی بڑی تعداد بھی قیام پذیر تھی۔ اب تک رسائلِ نور کی نقلیں تیار کروا کے انھیں بڑے پیمانے پر عوام میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہاں بعض رسائل زیورِ طباعت سے بھی آراستہ ہوئے۔ زندگی کے آخری ایام میں بھی پولیس کی طرف سے تفتیش، دھمکی اور جانچ پڑتال جاری رہی۔ مارچ ۱۹۶۰ء میں شیخ اورفہ تشریف لے گئے، لیکن وہاں پہنچتے ہی حکومت نے فوراً شہر چھوڑنے اور اسپارٹا واپس جانے کے احکام صادر کر دیے۔ ابھی شیخ اورفہ ہی میں تھے کہ ان کا آخری وقت آ پہنچا اور ۲۴/ مارچ ۱۹۶۰ء کو ان کی وفات ہوگئی۔

نورسی تحریک میں رسائل نور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شیخ نے چھوٹے بڑے ایک سو تیس (۱۳۰) رسائل تصنیف کیے ہیں۔ ان میں آسان الفاظ اور دل نشین اسلوب میں قرآنی علوم و معارف کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی مکمل تفسیر لکھنے کے بجائے دینی اقدار و مفاہیم کو قرآنی آیات کی روشنی میں بیان کیا اور اعجازِ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ان رسائل میں ترکی کے سیکولر معاشرہ پر تنقید کی گئی ہے اور اصلاحِ حال کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان رسائل کا مقصدِ تصنیف یہ تھا کہ عوام کو غلط راہوں پر چلنے سے روکا جائے اور ان کے لیے صحیح سمتِ سفر کی نشان دہی کی جائے، تاکہ وہ صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کر سکیں اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ بعض رسائلِ نور میں سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقیات سے متعلق قرآن مجید کی پیشین گوئیوں اور معجزات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح شیخ نے اس پہلو کی جانب توجہ دلانا چاہا تھا کہ دورِ جدید کی ترقیات کے سلسلے میں قرآن مجید سے رہ نمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ نورسی نے اپنے رسائل میں سیاسی افکار سے بحث نہیں کی ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن ان رسائل میں آیاتِ قرآنی کی جو تعبیر و تشریح پیش کی گئی ہے ان کے سیاسی مضمرات ضرور تھے۔ ان رسائل کے ترک معاشرہ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ شیخ نورسی کی دعوتی جدو جہد اور ان کی تحریک کا جامع تعارف آج سے چار دہائیوں قبل (۱۹۷۵ء میں) مشہور دانش ور خاتون مریم جمیلہ نے ان الفاظ میں کرایا تھا:

''بدیع الزماں نورسی کی طاقت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انھوں نے اپنی مشکلات اور مجبوریوں کو سمجھ لیا تھا اور مسلمان جن حالات میں مبتلا ہیں ان کا حقیقت پسندانہ اندازہ کر لیا تھا۔۔۔ انھوں نے دانش مندی سے کام لے کر ایک سخت، بے لچک تنظیم قائم کرنے سے احتراز کیا، کیوں کہ اس قسم کی تنظیم پر ایک صاحبِ اقتدار آمر آسانی سے پابندی لگا سکتا ہے، اس کے رہ نماؤں کو قید کر سکتا ہے اور ان کو پھانسی دے سکتا ہے۔۔۔ سعید نورسی نے اس کے برخلاف تبلیغ و اشاعت اور اپنی کتابوں کے ذریعے ہزاروں ترکوں کے دلوں میں ایمان کی جڑیں مضبوط کر دیں۔ یہ ایسی تحریک تھی جس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی تھی اور ایک جابر ترین استبداد بھی اس کی تعلیمات کو پھیلنے سے نہیں روک سکتا تھا۔۔۔ نورسی تحریک کا طریق کار ایک استبدادی نظام کے تحت، جو مسلمان ملکوں کا مقدر بن چکا ہے، زندگی گزارنے والے مختلف طبقوں کے لوگوں میں کام کرنے کے لیے انتہائی موزوں ہے۔۔۔ اس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آج ترکی میں جو کچھ اسلام باقی ہے بدیع الزماں سعید نورسی کی انتھک اور بے لوث جدو جہد کا نتیجہ ہے۔'' (ترکی کا مردِ مجاہد، حوالہ سابق، ص ۱۳-۱۴)

شیخ سعید نورسی کی زندگی مثالی زندگی تھی۔ شدید مخالف ماحول میں انھوں نے بڑی حکمت اور دانش مندی سے اصلاحی سرگرمیاں انجام دیں اور ہر طرح کی آزمائشوں کا دیوانہ وار مقابلہ کیا۔ ان کی خاموش دعوت و تبلیغ کے ترک معاشرہ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کی جدو جہد ترکی کی جدید تاریخ کا روشن باب ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان کی کوششیں ثمر بار ہو رہی ہیں اور ترکی کی پیش رفت آہستہ آہستہ پھر اسلام کی جانب ہو رہی ہے۔

☆☆☆

گوشۂ ترکی

امریکہ و یورپ اردغان کو کیوں روکنا چاہتے ہیں؟

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن
ناظم وحدانی نظام تعلیم فورم، پاکستان

ترکی کے عام انتخابات میں رجب طیب اردغان اوران کی جماعت کی کامیابی کا چرچا جابجا نظر آرہا ہے۔اس بنا پر دنیا بھر کے الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کی نظریں ترکی پر مرکوز ہوچکی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ امریکہ و یورپ نے اپنی مکمل طاقت و قوت صرف کردی ہے کہ کسی طرح بادشاہت اور مذہبیت کا عنصر دنیا سے ختم ہوجائے۔چونکہ مغرب کا اس کے حوالے سے تجربہ اچھا نہیں رہا ہے کہ مغرب کو کنیسہ اور فادر نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا اور اس کا بدلہ لینے میں یورپ تعصب و تنگ نظر ہوچکا ہے۔اسی طرح مغرب نے دنیا میں لادینیت و سیکولرزم کو فروغ دینے پر بھی بے شمار محنت مالی و جانی اور وقتی صرف کی ہے۔اسی کا نتیجہ تھا کہ مغرب کے اعلیٰ کاروں کی سرکردگی میں صلیبی فوج ترکی کے غدار کمال اتاترک کی مدد سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے اعلان کے ساتھ ملک بھر میں شعائر اسلام کی ادائیگی کو ممنوع قرار دیا۔1923ء میں عربی وفارسی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم خط کو رائج کردیا،لغت کی کتابوں میں اجنبی اصطلاحات کو شامل کرادیا۔اسی کے ساتھ مملکت کا اصطلاحی نام بدل کر خلیفہ کے معزز منصب کو ترک کردیا۔جمعہ کے دن کی چھٹی ختم کرکے اتوار کے دن کو چھٹی کا حکم جاری کیا۔ترکی میں موجود مدارس دینیہ کو بند کردیا اور ہجری تاریخ کے استعمال کو چھوڑ دیا۔اسلام میں جرائم کی بیان کردہ سزاؤں کو معطل کردیا۔1926ء تک ترکی کے قانون کو نئی شکل دیدی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی سے اسلام کا رہا سہا تعلق بھی زائل کردیا گیا یعنی معاشرے میں رائج قوانین میں اسلامی تعلیمات سے ادنیٰ سا تعلق بھی باقی نہیں رہنے دیا اور دین کو ریاست سے جدا کرنے کا تصور دیا گیا۔ترکی میں اسلام و مسلمانوں سے تشابہ والی ہر چیز بدل دی گئی۔خلافت عثمانیہ کے زمانہ میں رائج ٹوپی کو مغربی کیپ سے بدل دیا۔نماز پنجگانہ کیلئے اذان دینے پر پابندی عائد کردی گئی۔اسی طرح عورت کی پردہ داری کو ممنوع قرار دیا گیا کہ وہ سر کو ڈھانپے۔اسی طرح کے بہت سے اصول اور فروع میں اسلامی تعلیمات کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔

یہ مختصر سا جائزہ سیکولر ترکی کا پیش کیا گیا ہے ورنہ داستان تو بہت طویل ہے۔ترکی میں سیکولرزم کو عروج مل گیا کہ اس سے قبل سالہا سال تک ترکی اسلامی ریاستوں کا منبع و مصدر اور میدان میں قیادت کرتا رہا تھا۔کمال اتاترک کی آمد کے بعد ترکی ایک ایسا ملک بنادیا گیا کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں،اس کا دین کے ساتھ کوئی رشتہ تھا ہی نہیں۔ایسے میں اگر کوئی ترکی کا دورہ کرتا تو اس کو ترکی میں سوائے مساجد (جن کو بند کردیا گیا تھا) و مقابر اور تاریخی مقامات کے اسلام سے کوئی تعلق نظر نہ آتا تھا۔کمال اتاترک کی تنظیم اتحاد و ترقی نے اسلام کے نقوش مٹانے میں کوئی

کسر نہیں چھوڑی۔اس زمانے میں جتنی بھی جماعتیں اور تنظیمیں وجود میں آئیں ان سب کی اساس و بنیاد لادینیت پر تھی اور وہ سیکولر تھیں اور دین کا کسی بھی طرح احترام نہ کرتی تھیں۔

ترکی میں اسلام فوبیا اس قدر پھیل گیا کہ سیاسی وعسکری اور کسی بھی ویلفیئر ادارہ کے افراد کا دین سے تعلق ظاہر ہوتا تو ان کو پھانسی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ان میں مشہور ترین واقعۂ قتل ترک وزیراعظم عدنان مندریس کا ہے جسے ۲۲ مئی ۱۹۵۰ء سے ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کے درمیان عوام نے اپنا سربراہ مقرر کیا۔وہ جمہوریت پسند جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔اس نے ترکی کی عوام کی بے پناہ خدمت کی اور کسانوں اور ملازمین کیلئے آسانیاں پیدا کرنے کے ساتھ ان کی ہر ممکن اشیاء خوردونوش اور دیگر امور میں مدد کی۔ علمی مراکز قائم کیے۔اور کمال اتاترک کی سوچ وفکر کے حاملین نے اس سے خطرہ محسوس کیا کہ یہ تو اسلام پسند کرتے ہیں اور اذان اور شعائر اسلام کو رواج دینے کی کوشش کررہے ہیں۔اس سب کے نتیجہ میں فوج نے اس کے اقتدار کا خاتمہ کردیا اور لوگوں میں اسلامی روح کو راسخ کرنے کے جرم میں پھانسی دیدی گئی۔

ترکی میں انتخابات کے نتیجہ میں ایک مرتبہ پھر رفاہ نامی جماعت کے لیڈر اربکان حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔مگر ان کے اقتدار کو بھی فوج نے اسلام پسند ہونے کی وجہ سے ختم کردیا۔جس کے بعد جتنی بھی حکومتیں آتی رہیں وہ فوج کی مرضی ومنشا کے مطابق لادینیت کو فروغ دیتی رہیں۔یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ ترکی کی حکومتوں اور فوج نے سیکولرزم کو اختیار کرکے اسلام کو تو چھوڑ دیا اور مغرب وامریکہ کی کاسہ لیسی میں شب وروز مصروف رہے کہ کسی طرح ترکی کو یورپ کے بلاک میں شامل کرلیا جائے۔مگر یورپ ایک لمحہ کیلئے بھی ترکی کو اپنے شانہ بشانہ بٹھانے کو تیار نہ ہوا؛ کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوچکی تھی کہ ترکی طویل زمانے تک اسلامی خلافت کا منبع ومصدر رہا ہے۔

ترکی کے خلاف بہت بڑی سازشیں گاہے بگاہے تیار ہوتی رہی ہیں۔یورپ لمحہ بھر کیلئے بھی اس بات کو فراموش نہ کرسکا کہ خلافت اسلامیہ عثمانیہ کا مرکز ترکی رہا ہے۔اب یہ بات بین ہے کہ ترکی کا نام اس لیے روشن ہے کہ یہ اسلامی خطہ میں موجود ہے باوجود اس کے کہ ترکی سیکولرزم کو دین وزندگی کے منہج کے طور پر قبول کرچکا ہے۔اسلام ان کا منہج وطریقہ نہیں رہا ہے۔۔۔۔کیونکہ ترکی کے اقتدار کی جانب پیش قدمی کرنے والی سیاسی جماعت وسیاست دانوں کو فوج کی جانب سے پابند کیا جاتا ہے کہ وہ ملک کا نظام سلطنت سیکولرزم کی بنیادوں پر ہی چلائیں گے اور اس کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کرینگے۔ترکی میں جو تبدیلی واقع ہوئی وہ صرف اور صرف نظام بادشاہت کا خاتمہ اور جمہوریت کا نفاذ واحیاء ہوا۔ماضی کے ترکی اور موجودہ ترکی میں صرف یہی فرق ہے۔اب جبکہ استنبول کے میئر رجب طیب اردغان ترکی کا اقتدار حاصل کرچکے ہیں۔اردغان استنبول شہر کی علامت بن چکے تھے اور یہاں کے میئر 1994ء سے 1998 تک رہے۔ان کی اقتصادی وملی اور قومی خدمات کے نتیجہ میں ترکی کی عوام نے انہیں 2003ء میں ملک کا وزیراعظم منتخب کیا۔2014 تک وزارت عظمی کے منصب پر فائز رہے۔اردغان عدل وانصاف اور ملک کو معاشی ترقی کی منازل پر گامزن کرنے والی جماعت العدالہ والتمنیہ کے سربراہ ہیں۔2014ء سے ابتک وہ صدر مملکت بن چکے ہیں اور ترکی کی 54 فیصد سے زائد آبادی نے انہیں اپنا صدر منتخب کرلیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ امریکہ ومغرب ترک عوام کی اس جمہوری رائے کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟؟!!۔

امریکا اور یورپ بڑی مدت سے جمہوریت کی بالادستی کی بات کرتا ہے۔اس کے باوجود متعدد بادشاہتوں کی بھی امریکہ و یورپ سرپرستی کررہا ہے۔امریکہ اور یورپ کی جانب سے جمہوریت وآزادی کا نعرہ بھی برابر جاری وساری رکھا جاتا ہے۔

جمہوریت ترکی میں کامیاب ہوگئی اور ترک عوام کی غالب اکثریت نے اردغان کو دوسری مدت کیلئے اپنا صدر منتخب کرلیا۔رجب طیب اردغان کوالیکشن میں واضح اکثریت میں فتح دلانے کے لئے عوام نے جس دلچسپی کا مظاہرہ کیا اس کی دو بنیادی وجہیں ہیں ۔ایک یہ اردغان نے ترکی میں ملی وقومی خدمات سرانجام دی ہیں اور ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ ترکی کی عوام یورپ اور امریکہ کے مکروہ عزائم و چہرہ سے نفرت کرتی ہے۔مغرب اپنے ملکوں میں جمہوریت کو اختیار کرتا ہے اور جمہوریت کی بالادستی کے نعرے و وعدے بھی کرتا ہے مگر جب جمہوری عمل مسلمان ملکوں میں مضبوط ہوتا ہے تو اس کے خلاف سازشیں کرنا شروع کردیتا ہے اور اس کو مشکوک بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ اور یورپ طیب اردغان سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں؟ پہلی بات تو واضح ہے کہ اردغان مسلم حکمران ہیں اور گذشتہ بیس سالوں سے دنیا بھر میں ان کا طوطی بول رہا ہے۔ترکی میں اسلامی شعائر کا احیاء کیا، باوجود اس کے کہ انہوں نے شریعت اسلامی کے نفاذ کا اعلان ابتک نہیں کیا ۔اس سب کے باوجود ترکی میں مظاہر اسلام جابجا دیکھے جاسکتے ہیں کہ لوگوں نے ازخود اسلام کے شعائر کی پابندی شروع کردی ہے اور مساجد کھل چکی ہیں۔اس کے ساتھ اہم ترین بات یہ ہے کہ اردغان مسلمانان عالم کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں۔طیب اردغان نے ملک کو معاشی طور پر اسقدر مستحکم کردیا ہے کہ بیرونی قرضے ختم کرائے اور ملک میں ملازمت پیشہ افراد کی تنخواہوں میں تین گنا اضافہ کردیا۔معاشی و اقتصادی ترقی کو عروج ملا۔ یہ سب اس وقت ہورہا ہے جب امریکہ اور یورپ کھلے عام ترکی کے خلاف سازشیں کررہے ہیں۔ترکی کی اشیاء کی بیرون ملک تجارتی طور پر منتقلی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوچکا ہے۔ملک خود کفیل ہوچکا ہے کہ بڑی حد تک دوسرے ممالک کی اشیاء کی آمد کا سلسلہ ختم ہوچکا ہے۔اسی طرح اردغان نے ترکی میں تعلیم گاہیں اور دانش کدے قائم کیے ،عالمی معیار کے ہسپتال تعمیر کرائے گویا کہ ترکی دنیا میں ترقی وعروج کی جانب رواں دواں ہے ۔اس حالت میں یورپ اور امریکہ انگشت بدنداں ہوکر مطالعہ کرنے میں مصروف ہوں کہ کیسے اردغان اس ملک کو اقبال مندی کی طرف لے جارہا ہے کہ یہ ملک اقتصاد، تعلیم وصحت اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے روز بروز پیش قدمی کررہا ہے۔مغرب اور امریکہ اس لئے بھی پریشان وغمگین اور خوف زدہ ہیں کہ یہ ترقی ایک مسلم ملک کررہا ہے۔

یہاں اس امر سے بھی صرف نظر نہیں کرنی چاہیے کہ امریکہ اور یورپ جہاں ہر مسلم ممالک کے خلاف صف آراء ہیں وہیں پر کچھ نادان مسلم ممالک بھی مغرب کی خود مسلمانوں کے خلاف صرف اس لیے مدد کررہے ہیں کہ کسی بھی طرح ان کا اقتدار قائم ودائم رہے۔ جیسے متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب مسلم ممالک کے خلاف امریکہ اور اسرائیل کی کاسہ لیسی کررہے ہیں جس کے سبب تونس اور مصر میں اسلام پسندوں کی حکومت کو ختم کرانے میں انہوں نے اپنا کردار ادا کیا، وہیں پر آج بھی یہ کوشاں ہیں کہ مسلم امہ کو ترکی کے گرد جمع ہونے سے بچائیں اور مسلمانان عالم کو ایک مرتبہ پھر دو ٹکڑے کردیں جیسے بیسویں صدی کے آغاز میں خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کیے تھے۔افسوس کی بات ہے کہ مسلم ملکوں کا مال ومتاع مسلمان بھائیوں کی تباہی و بربادی پر خرچ کیا جارہا ہے کہ ان کی سلطنت کو یہ مسلم امہ کی بیداری لپیٹ کر سمندر برد نہ کردے۔

ایسے میں دقت نظر کے ساتھ اپنے گردو پیش کے احوال کا جائزہ لینا ہوگا کہ مبنی بر انصاف اس امر پر سوچ وبچار اور غور وخوض کیا جائے کہ موجودہ حالات میں اگر ترکی زیر نگین ہوجاتا ہے تو اس کا فائدہ کس کو ہوگا؟ جب کہ ہم واقف ہیں کہ ماضی قریب میں مغرب نے چابکدستی کے ساتھ خلافت عثمانیہ کو تقسیم کیا برطانیہ اور

فرانس کے درمیان اور عرب کے خطے کو شریف حسین کی قیادت میں خلافت سے علیحدہ کرایا۔ جب مغرب مطمئن ہوگیا کہ اب خلافت عثمانیہ کمزور و ناتواں ہوچکی ہے تو اس نے عرب کے دل پر صہیونی ریاست اسرائیل کی بنیاد 1967ء میں رکھی اور آج وہی اسرائیل دنیا بھر کے مسلمانوں کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ لہذا بغیر کسی لیت ولعل اور جانبداری کے ہمیں جائزہ لینا ہوگا کہ آج کل کے دور میں ترکی کے زوال پر کون خوش ہوگا؟ عرب ملکوں کی اس میں کیا مصلحت ہے کہ وہ اپنے سے بہت دور ملک کو نقصان دینے کیلئے کوشاں ہیں؟! کیسا بھیانک ہوگا وہ وقت جب صلیبی مغرب کے مفادات عرب کے بادشاہوں اور ملکوں کے ساتھ منسلک و مرتبط ہوجائیں اور وہ متفق ہوجائیں کہ ترکی کو ختم کرنا ہے؟

امریکہ و یورپ کے زیر سایہ ترکی کے حاکم (اردغان جو ترک عوام کے محبوب لیڈر و قائد بن چکے ہیں) کے خلاف سازش کرنے والے مسلمان ملک دو حصوں میں منقسم ہیں پہلی قسم یہ ہے کہ وہ مسلم بادشاہ، امراء اور عرب ممالک کے حکام ہیں جن کا اپنا کوئی بھی مقام و مرتبہ نہیں ہے۔ مغرب کے سامنے سینہ سپر ہونے کی کوئی طاقت نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے اپنے عہدوں اور اقتدار کو بچانے کیلئے امریکہ اور مغرب کا ساتھ دے رہے ہیں۔ سوء اتفاق ہے یا کیا کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ امریکہ اور مغرب کے کہنے پر اردغان کی دشمنی اور عداوت کا پرچم تو بلند کیے ہوئے ہیں مگر ایسا کیوں کر رہے ہیں یہ انہیں معلوم ہی نہیں۔ ان کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ مغرب اردغان کا مخالف اور دشمن ہے تو وہ بھی دشمنی کر بیٹھے۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں کہیں بھی کوئی عزت و توقیر نہیں ہے۔ دوسری جانب شیوعی فکر کے حاملین بھی اردغان کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کو تکلیف اس بات کی ہے کہ وہ مسلم حاکم اور مسلم حکومت اقتصادی طور پر مستحکم ہو رہی ہے۔ اور ایسے میں مسلم حاکم ان سے صرف نظر کر کے ان کو بے وقعت کر رہا ہے۔ ایسے میں وہ کچھ نہ بن پانے پر یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ اردغان اسرائیل کا دوست ہے!! باوجود اس کے کہ اردغان اسرائیل کی سرکشی و عداوت کی بنا پر اس کی پالیسیوں کو مسترد کر چکا ہے اور بیریز کا واقعہ اہل حل وعقد کے سامنے بین دلیل ہے۔ اسی طرح کا نعرہ عرب کے دانشور بھی لگاتے ہیں کہ اسرائیل و ترکی باہم متفق و متحد ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ خود عرب حکام چھپ چھپ کر اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔ ایسے میں اردغان سے تکلیف صرف اس لیے ہے کہ عرب حکام اس کی ترقی و بلندی اور نیک نامی کی شہرت سے حسد کرتے ہیں۔

ایسے میں دنیا بھر میں اور بالخصوص ترکی میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو رجب طیب اردغان سے محبت کرتے ہیں اور ان کا سلیم قلب کے ساتھ احترام کرتے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردغان مسلمانان عالم کی ایک امید ہے اور اس کے افعال و حرکات اور جدوجہد ساری کی ساری اسلامی تعلیمات کے ساتھ مرتبط ہے اور وہ اسلامی دل اور جذبہ وحمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح طیب اردغان نے اپنے ملک کو غربت و افلاس کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نکال کر اقبال مندی اور اقتصادی و سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے مستحکم و طاقتور ملک بنا دیا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ امریکہ اور مغرب کی تقلید میں ترک حاکم رجب طیب اردغان سے جلنے والے مسلم حکام خواہ وہ سعودی ہوں یا اماراتی و ان کے پیروکار اور مصر یہ سب ہمیشہ ذلت و پستی اور ناکامی کا منہ دیکھتے رہیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس شخص یا اس ملک کو عزت و افتخار عنایت کرنے کا وعدہ کر چکا ہے جو اللہ کے احکام کی سربلندی کیلئے کوشاں رہے۔ اللہ تعالیٰ رجب طیب اردغان کے خلاف ہونے والی تمام سازشوں کو ناکام و نامراد بنائیں اور مسلمانان عالم کے مسیحا بننے کی توفیق بخشیں اور خلافت اسلامیہ کی از سر نو بنیاد رکھنے کے اسباب مقدر فرمائیں۔ آمین۔

☆☆☆

گوشۂ ترکی

عالم اسلام کی موجودہ صورت حال میں ترکی قیادت، خطرات وامیدیں

ترکی کا مرد دانا، اور خلافت کا خواب

مجیب الرحمٰن عتیق ندوی

خلافت اور جہاد دو ایسے لفظ ہیں جن کی حقیقی روح نظروں سے اوجھل ہوئی، اور دوسری طرف حقائق کو بدلنے میں چابکدستی رکھنے والے دشمنان اسلام نے ان کو وہ معانی پہنائے جو حقیقت کے بالکل خلاف ہیں، بلکہ اب تو حالت یہ ہوگئی کہ زخم خوردہ عیسائیت اور مکار صہیونیت نے خلافت کے مہیب سایہ سے پوری دنیا کو خوفزدہ کردیا ہے، دشمنان اسلام اور منافقین نے ہمیشہ اسلام کے خلاف سازشوں کے جال بچھائے ہیں، مگر آج کے دور میں مغربی استعماری طاقتوں نے جو سازشیں کی ہیں یا عالم اسلام کے خلاف کررہے ہیں وہ خطرناک کے ساتھ بہت پیچیدہ اور متنوع سازشیں ہیں، سیاست کی بساط پر جب مسلمان مات کھا گئے تو فکر، تمدن، تہذیب، تعلیم کوئی ایسا میدان نہ تھا جہاں ہزیمت وورسوائی ان کا مقدر نہ تھی۔

خلافت عثمانیہ اسلام کی عظمت وشوکت کا آخری نشان تھی، دشمنوں کو کب ٹھنڈے پیٹ گوارا ہوسکتا تھا کہ اسلام کی شوکت وجلال کے پھریرے عرب وعجم پہ لہراتے رہیں، یہ تو ان کا حق ہے کہ اپنے غرور وتمکنت اور غلبہ وتسلط کا پرچم لہرائیں، رعب ودبدبہ قائم کریں خواہ انسانیت کی کتنی ہی آبرو لٹ جائے، کشتوں کے پشتے لگ جائیں، ظلم وجور کا ننگا ناچ کیا جائے، ہم اس مضمون میں مختصر جائزہ لیتے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کیا تھی، اس کا زوال کیوں کر ہوا؟ اب عالم اسلام کے موجودہ خطرناک حالات میں ترکی کی بیدار مغز، بے باک وحق گو، انصاف پسند، باطل بیزار قیادت سے کیا امیدیں ہیں، پورا یورپ، عالمی استعماری طاقتیں، عالم عربی کے منافق حکمراں وامراء کیوں اس کو ختم کرنے کے درپہ ہیں؟

تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ خلافت عثمانیہ اپنے زمانی ومکانی وسیع وعریض رقبہ پر پھیلی ہوئی ایک عظیم اسلامی سلطنت تھی، جو یورپ کی گود میں قائم ہوئی، اور ۱۲۹۹ء سے ۱۹۲۲ء تک قائم رہی، سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں یہ مستحکم خلافت تقریبا تین بر اعظموں پر پھیلی ہوئی تھی، جنوب مشرقی یورپ، مشرق وسطی، اور شمالی افریقہ کا بیشتر حصہ اس کے زیر نگیں تھا، خلافت عثمانی کے چھ سو سالہ اس وسیع دور میں صرف عالم اسلام ہی نہیں بلکہ پوری دنیا پر اس کے سیاسی، تمدنی، تہذیبی، ثقافتی اثرات محسوس کئے جاتے تھے، اس طویل دور حکومت کا تجزیاتی مطالعہ تو ان مختصر سطور میں پیش نہیں کیا جاسکتا تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترکوں نے امن وامان، انصاف پروری، اور خود یہود ونصاری کے ساتھ رواداری کی جو مثالیں قائم کیں وہ عصر حاضر کی ظالمانہ جمہوریت کے لئے

نا قابل یقین نمونے ہیں،عثمانی ترکوں نے اپنی تاریخ میں جس ذہانت،سیاسی وعسکری تفوق،قوت وبے باکی،جرأت وحوصلہ مندی کا ثبوت دیا،اور قائدانہ صفات کا جوہر دکھایا،اسی نے دراصل ان کوعظمت وشوکت کی دہلیز پر بٹھایا تھا،اقبال مرحوم نے اسی کی جانب اشارہ کیا تھا:

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

خلافت عثمانیہ ایک ایسا سایہ دار درخت تھا جس کے گھنیرے سایہ میں پورا عالم اسلام چین کی نیند سوتا تھا،جس کے زیرنگیں خطہ ارض میں حدود وثغور کی پابندیوں کے بغیر خدا کی زمین پرایک بندہ مومن شمال سے جنوب ،اور مشرق سے مغرب تک امن وامان کے ساتھ سفر کرتا تھا،جس نظام خلافت میں پورا عالم اسلام ایک جسد واحد کی طرح تھا،ایک طرف مسیحی یورپ تھا جواس خلافت کو اپنے لئے آنکھ کا کانٹا سمجھتا تھا،دوسری طرف صہیونیت کی تحریک تھی جو اپنے مقاصد کی تکمیل میں خلافت کوسنگ راہ سمجھتی تھی،خلافت کی بقاء کے ساتھ نہ یورپ چین کی سانس لیکر اپنی تاناشاہی کے خواب کوشرمندۂ تعبیر کرسکتا تھا،اور نہ ہی یہودی اپنے انسانیت سوز عزائم پورے کرسکتے تھے،چنانچہ خلافت عثمانیہ دونوں کی عداوت وسازش کا نقطہ اتحاد تھی، جب بھی ان کوموقع ہاتھ آیا سازش وانتقام کی آگ میں دونوں ننگے حمام سے باہر آگئے،۱۹۱۴ء میں دنیا پر حکمرانی کی ہوس اور ملک گیری کی خواہش میں عالمی استعماری طاقتوں کے درمیان خطرناک جنگ کا آغاز ہوا،جس کی انسانیت سوز، المناک اور وحشت وبربریت کودنیا جنگ عظیم اول کے نام سے جانتی ہے،جس میں ایک طرف جرمنی،ہنگری،آسٹریا،بلغاریہ اور عثمانی ترک تھے،جن کومحوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا ہے،تو دوسری طرف برطانیہ،روس،سربیا،فرانس،اور امریکا کی اتحادی ومرکزی قوتیں (Centrel Powers) تھیں،دونوں قوتوں میں جنگ چھڑگئی،اس ہولناک وخوں ریز جنگ کے بھیانک نتائج سامنے آئے،کروڑوں افراد موت کے گھاٹ اتاردئے گئے،کروڑوں افراد لاپتہ ہوگئے، بڑے بڑے ممالک دیوالیہ ہوگئے،۱۹۱۸ء میں جنگ کے خاتمہ پر مرکزی طاقتوں کا پلہ بھاری رہا،اور جرمنی وترکی کواس کی بڑی بھاری قیمت چکانا پڑی،خلافت عثمانیہ کے بہت سے علاقے برطانیہ کے زیرتسلط آگئے،چوں کہ عالمی استعماری طاقتیں عثمانی ترکوں کے خلاف ایسے حالات کا انتظار کررہی تھیں جس میں خلافت کے قلعہ عظمت وجلال میں شگاف پیدا کرکے ترکوں کو بے دست وپا بنایا جاسکے،خلافت کوسبوتاژ کرکے اسلام کی قوت وشوکت کو روبہ زوال کیا جاسکے، جنگ عظیم اول کے ہولناک نتائج نے ترکوں کواس نازک موڑ پر لاکھڑا کیا، جہاں سے ان کی قوت وشوکت کونظر لگ گئی،اور مسیحیت وصہیونیت نے پھر کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا یہاں تک کہ اس خلافت کی بساط لپیٹ دی گئی جس نے چھ سوسال سے زیادہ قیادت کے فرائض انجام دئے،جس کے عسکری،جنگی،سیاسی،تمدنی امتیاز وتفوق کا دنیا نے لوہا مانا تھا۔

جنگ عظیم اول کے خاتمہ کے بعد ۳۰/اکتوبر ۱۹۱۸ء کو یونان کی بندرگاہ پر ترکوں اور اتحادی قوتوں کے درمیان جنگ بندی کے نام سے ایک معاہدہ ہوا،یہ ظالمانہ معاہدہ کیا تھا، دراصل خلافت کی آبرواور عظمت وشوکت کے زوال کا پہلا قدم تھا،اتحادی قوتوں کی جانب سے ایڈمرل ''سمرسیٹ آرتھر گف کالتھورپ'' (Somerset Arthur Gough Calthourp) اور ترکوں کی جانب سے ''رؤف بے'' نے

دستخط کئے، یہ معاہدہ تاریخ میں ''معاہدہ مدروس'' (Armistice of Mudros) کے نام سے مشہور ہے، اس کی بنیادی دفعات یہ تھیں،:

۱- آبنائے باسفورس جنگی وتجارتی جہازوں کے لئے کھلی رہیں گی، صرف یونانی جہاز نہیں گزر سکیں گے، عثمانی ترک ان آبناؤں کی حفاظت کریں گے،

۲- ملک کے داخلی انتظام اور سرحدوں کی حفاظت کے لئے محدود تعداد کے سوا باقی عثمانی فوج ملازمت سے سبکدوش کردی جائے گی،

۳- جنگی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کیا جائے گا۔

۴- تمام ترک جنگی جہاز اتحادیوں کے حوالے کردئے جائیں گے۔

۵- اتحادیوں کو یہ اختیار ہوگا کہ کسی قسم کا خطرہ محسوس کرنے پر کسی بھی اہم علاقہ پر قابض ہوجائیں۔

۶- عثمانی ریلوے اور تجارتی جہاز اتحادی ممالک کے زیر استعمال رہیں گے۔

۷- ایران اور قفقاز میں موجود عثمانی افواج کو بلالیا جائے گا۔

۸- سرکاری مقاصد کے سوا ذرائع مواصلات اتحادی قوتوں کے زیر کنٹرول ہوں گے۔

۹- فوجی بحری اور تجارتی سامان کو ترک حکام استعمال نہیں کریں گے۔

۱۰- فاضل کوئلہ، تیل، اور بحری نقل وحمل کا سامان صرف اتحادی طاقتوں ہی کو فروخت کیا جاسکے گا۔

۱۱- حجاز، یمن، شام، عراق میں عثمانی فوجیں اتحادیوں کے آگے ہتھیار ڈالیں گی۔

۱۲- طرابلس اور بنغازی میں عثمانی فوج اٹلی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے گی۔

۱۳- عثمانی سلطنت میں موجود اتحادی افواج کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری عثمانی حکومت پر ہوگی۔

۱۴- عثمانی سلطنت کے جنگی قیدی اتحادیوں کی قید میں ہی رہیں گے۔

۱۵- اتحادیوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اناطولیہ کے کسی بھی مشرقی صوبہ میں کسی بھی بغاوت کو کچل سکیں۔

اس معاہدہ ذلت کی ایک ایک شق کو پڑھئے، اور غور کیجئے کہ یہ ظالمانہ وسخت ترین شرائط اس عظیم خلافت کی بے بسی اور مقہوری ونکبت کی کیسی المناک داستان ہیں، کہاں وہ شکوہ ترکمانی تھا کہ پورا یورپ ملکر بھی آنکھ ملانے کی جرأت نہ کرسکتا تھا، اور کہاں یہ مظلومیت وتذلیل کا سامان!

حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونق محفل نہ رہا

جنگ عظیم اول میں چوں کہ ترکوں نے برطانیہ وفرانس کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا، اس کی پاداش میں مزید برطانیہ نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا، اور انہیں عرب خلافت کا خواب دکھایا، جس کے نتیجہ میں عربوں نے ترکوں سے بغاوت کا اعلان کردیا، یہودی سازشوں سے ترک وعرب قومیت کی زہریلی جڑیں پھر سے ہری ہوگئیں، برطانیہ کے مکر وبدیانتی اور ظلم وجبروت کے سیاہ صفحات کو سات سمندروں کے پانی سے بھی دھویا نہیں جاسکتا، ملکوں اور قوموں کے ساتھ اس کے استعمار وظلم اور بددیانتی سے تاریخ بھری پڑی ہے، ترکی سے انتقام لینے اور خلافت کے تابوت میں کیل ٹھونکنے کے لئے برطانیہ نے ۱۹۱۶ء میں شریف مکہ حسین بن علی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جو عرب برطانیہ معاہدہ (Arab Britian

Declaration) کے نام سے مشہور ہے، شریف مکہ حسین بن علی اور مصر میں برطانوی نمائندہ ''سر ہنری مکماہون'' (Sir Henry McMahon) کی خفیہ مراسلت کے ذریعہ یہ معاہدہ ہوا کہ اگر شریف مکہ ترکوں سے دست بردار ہوجائیں، اور ان کا ساتھ نہ دیں، تو برطانیہ عرب خلافت کے قیام میں ان کا تعاون کرے گا، یہ معاہدہ ایک سازش اور صرف دھوکہ تھا، اس کا مقصد عرب قومیت کو بیدار کرکے ترکوں کے خلاف انہیں میدان میں اتارنا تھا، ایک طرف جب برطانیہ عربوں کو ان کی حکومت وریاست کے خواب دکھا کر ان سے معاہدہ کررہا تھا، دوسری طرف برطانیہ اور فرانس میں مزید ایک خفیہ معاہدہ عربوں سے متعلق کیا گیا، جو برطانوی نمائندہ ''مارک سایکس (Marc Sykes) اور فرانسیسی نمائندہ ''جورج پیکوٹ'' (Georges Picot) کے ذریعہ پایہ تکمیل تک پہونچا، یہ معاہدہ بھی اسی سال ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوا، اس معاہدہ کی رو سے عرب ممالک کو برطانیہ وفرانس اور روس کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا، برطانیہ نے شریف مکہ حسین بن علی کو عرب خلافت کا جو خواب دکھایا تھا، وہ دھوکہ ثابت ہوا، ان کے ایک بیٹے کو عراق اور دوسرے بیٹے کو اردن کا بادشاہ بنا کر اس خلافت کے خواب کو ختم کردیا گیا، برطانیہ نہ عربوں کے حق میں مخلص تھا نہ انصاف وانسانیت کا نمائندہ، بلکہ وہ ترک خلافت کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ مشرق وسطی کی تقسیم اور شکست وریخت کا خواہاں تھا۔

ترکی کے ساتھ اتحادی قوتوں کے مظالم کا آئینہ دار ایک اور معاہدہ ''سیورے'' (Treaty of Sevres) ہے، جو ۱۰/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو اتحادی قوتوں اور ترکی کے درمیان ہوا، یہ معاہدہ بھی دراصل ترکی کی شکست کا ایک اور اہم ترین حصہ ہے، اس معاہدہ کی رو سے حجاز، اور آرمینیا آزاد ملک قرار دئے گئے، اس سے قبل برطانیہ اور فرانس کے مابین ''جورج پیکوٹ'' کے معاہدے کے مطابق شرق اوسط میں ممالک کو برطانیہ وفرانس کی عملداری میں تقسیم کیا جاچکا تھا، اور اب اس معاہدہ کے ذریعہ ترکی کے بعض علاقوں کو یونان اور اٹلی کے حوالہ کیا گیا، گویا برطانیہ عظمی ردائے خلافت کو آہستہ آہستہ کترنے کی سازش پر عمل کررہا تھا، دوسری طرف ان حالات میں ترکی میں ''ترک قومی تحریک'' کمال اتاترک کی زیر قیادت ابھر رہی تھی، اس نے ترکی میں عثمانی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا، اور بالآخر یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو خلافت کے خاتمہ کا اعلان کردیا:

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی اوروں کی عیاری بھی دیکھ

خلافت کا خاتمہ دراصل اسلام کی عظمت وسطوت کا خاتمہ تھا، عزت وشوکت کا خاتمہ تھا، جو عالمی استعماری قوتوں کی منصوبہ بندی اور سازش کا نتیجہ تھا، ان کی دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی، انہوں نے خوب بغلیں بجائیں، گھی کے چراغ روشن کئے گئے، اسلام کی اس بے آبروئی، اور ذلت ورسوائی پر جن کے قلب وضمیر میں زندگی کی رمق، اور آنکھ میں حیا تھی وہ دنیا میں جہاں بھی تھے، اس حادثۂ جانکاہ پر تڑپ کر رہ گئے، اعداء اسلام کو صرف خاتمہ گوارا نہ تھا، بلکہ وہ چاہتے تھے کہ اس خاکستر سے اب کوئی چنگاری پھر سے شعلہ نہ بن جائے، اور یہ ''مرد بیمار'' قوت وصحت کبھی حاصل نہ کرسکے، اس لئے مزید سازشیں کی گئیں، ترکی کو جمہوریت کی شراب پلائی گئی، بے دینی، بلکہ دین بیزاری کا سبق سکھایا گیا، اخلاق باختگی، بے حیائی اور حیوانیت کے دلدل میں دھکیل کر اتحادی قوتوں نے آرام کی

سانس لی، کہ اب ''خلافت'' کے قالب میں ان کی مکروہ روح حلول کرگئی ہے،اور یوں وہ اسلام کو بے آبرو کرنے میں کامیاب ہوگئے،

۲۴/ جولائی ۱۹۲۳ء کو مزید ایک سوسالہ معاہدہ سوئزرلینڈ میں تشکیل پایا جس کو معاہدہ ''لوزان''(Treaty of Lausanne) کہا جاتا ہے، بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ترکی خلافت کو ختم کرنے کے بعد آئندہ مستقبل میں اس کو پابند سلاسل کرنے کے لئے یہ معاہدہ یورپین اتحادی طاقتوں کا آخری تازیانہ تھا،اس معاہدہ کے ذریعہ بلغاریہ، یونان،اور ترکی کی سرحدیں متعین کی گئیں،عراق،شام اور قبرص پر ترکی کا دعوی ختم کرکے ترکی کو سمیٹ دیا گیا،خلافت کا صرف خاتمہ ہی نہ تھا بلکہ سرزمین خلافت کے حصے بخرے ایسے کردئے گئے، جیسے ذبیحہ کے اعضاء الگ الگ کئے جاتے ہیں،اس معاہدہ نے ترکی کو سیاسی،تمدنی،اقتصادی ہر لحاظ سے مقید کردیا تھا، یہ ایک طویل معاہدہ ہے،جس کے تجزیاتی مطالعہ کے ضرورت ہے،اس کی تفصیل اس مختصر مضمون میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

خلافت کے خاتمہ کے بعد تمام سازشی اژدہے اپنے اپنے بلوں سے باہر آگئے،معاہدات ہوتے رہے اور عالم اسلام کی آبرو لٹتی رہی، عالم اسلام کے جسم پر سب سے گہرا زخم اسرائیل کا قیام تھا، برطانیہ کی بددیانتی وخیانت کا شرمناک پہلو یہ بھی ہے کہ ۲/ نومبر ۱۹۱۷ء میں ایک اور معاہدہ یہودیوں کے ساتھ کیا،جس میں برطانوی وزیر خارجہ ''بلفور'' (Arthur Jemes Balfuor نے ایک یہودی نمائندہ ''والیٹر روتشیلڈ'' (Walter Rothschild) کے نام ایک مکتوب کے ذریعہ فلسطین میں یہودیوں کے لئے قومی وطن بنانے کی اجازت دی ہے، یہ معاہدہ برطانوی تاریخ کی بددیانتی وخیانت کا سیاہ نشان ہے،جس میں اس نے ایک عرب ملک فلسطین میں ایک ایسی قوم کو دینے کا وعدہ کیا ہے،جس پر نہ برطانیہ کا کوئی قانونی حق تھا،اور نہ ہی یہودیوں کا، اس طرح انسانی واخلاقی ہی نہیں بلکہ جمہوری بنیادوں کا خون کرتے ہوئے یہود کو فلسطین میں قومی وطن بنانے کی منظوری دے دی گئی، یہودیوں نے فلسطین پر قبضہ کرنے اور اپنی ریاست قائم کرنے کے خواب میں ہر حربہ استعمال کیا،اس وقت فلسطین برطانوی سامراج واقتدار کا حصہ تھا،اس لئے وہاں یہودیوں کو اور موقع تھا کہ ظلم وغنڈا گردی،لوٹ مار کے ذریعہ فلسطینیوں کو دہشت زدہ کرکے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کرتے تھے، ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ نے فلسطین میں یہودی حق تسلیم کرتے ہوئے اس کے ایک حصہ پر یہودیوں کو اپنی حکومت بنانے کی قانونی آزادی دے دی، جنگ عظیم دوم کے بعد استعماری ملکوں کی کمر مزید ٹوٹ چکی تھی،ادھر برطانیہ نے اپنے قبضہ وانتداب کو فلسطین سے ہٹایا ادھر برطانیہ کی سازش اور اقوام متحدہ کی سرپرستی میں یہود نے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کا باقاعدہ اعلان کردیا،اور عالمی استعماری طاقتوں نے اس ناجائز ریاست کو تسلیم کرلیا،اس کے بعد اسرائیل نے فلسطینیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑدئے، بستیاں کی بستیاں اجاڑ دی گئیں، بے رحمی سے قتل کردیا گیا،صابرہ وشتیلا،دیر یاسین کی انسانیت سوز کاروائی کی گئیں،جن کی ظلم وبربریت کے متحمل الفاظ وتعبیرات نہیں ہوسکتے،ظلم وبربریت کا وہ ننگا ناچ دنیا کی نگاہوں کے سامنے ہوا اور ہورہا ہے،خلافت کا خاتمہ کرنے کے بعد سرزمین فلسطین پر اسرائیل کا قیام یہودی سازش اور برطانوی استعمار کے فریب وظلم کا نتیجہ ہے،اس وقت سے آج تک یہ خنجر عربوں کے قلب میں پیوست ہے،اور اس سے خون

رس رہا ہے، پورے شرق اوسط میں بدامنی واضطراب، فساد وخوں ریزی کا بہت بڑا سبب اسی یہودی ریاست (Jewish State) کا قیام اوراس کا تحفظ ونیل سے فرات تک اس کی سرحدوں کی توسیع کا بدترین وظالمانہ خواب ہے،

میں حالات کے زیادہ گہرے تجزیہ وتفصیل میں جانا نہیں چاہتا اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ ان حالات کی کوکھ سے ایک طرف ترکی کی بیدار مغز، بے باک، باطل بیزار، قیادت وجود میں آئی، جو دراصل اللہ کے تکوینی نظام کے بعد کچھ قائدانہ ومصلحانہ کردار رکھنے والی تاریخ ساز شخصیات کی جد وجہد کا نتیجہ ہے، اور دوسری طرف غیرت فروش، بے ضمیر، حریص وہوس کے بندے، کفرنواز، منافق حکام وامراء کا ٹولہ وجود میں آیا، جن کے بارے میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے'' فزين لهم الشيطان أعمالهم ''انہوں نے دشمن سے مقابلہ آرائی کرنے کے بجائے ان کی سازشوں کی تکمیل کا حصہ بننے میں عافیت سمجھی، بلکہ عرش وکرسی، اور سلطنت ودولت کی ہوس نے دل کی دنیا بھی اجاڑ دی، اور قلب وضمیر کا سودا کر بیٹھے۔

ترکی کی بیدار، بیباک، حوصلہ مند، جرأت مند، شاہین صفت، عقابی نظر قیادت صرف یوں ہی منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہوگئی ہے، بلکہ یہ سحر خون صد ہزار انجم سے پیدا ہوئی ہے، حالات وسیاست کے تھپیڑوں نے اس کو بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، کتنے اہل اصلاح ودعوت اور فکر وتربیت نے اس کی نقش آرائی کی ہے، ترکی کے ماضی اور مظلومانہ تاریخ کے بعد صدر ترکی رجب طیب اردوغان کو دیکھتے ہوئے بے اختیار فانی کا یہ شعر زبان پر آتا ہے:

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

رجب طیب اردوغان نے اپنی حکمت وبصیرت، فراست وتدبر، عالمی سازشوں کے باوجود ترکی کے وقار کو بحال کیا ہے، سیاست، تمدن، اقتصادیات، نظم وانتظام کی اعلی ترین مثال پیش کی ہے، داخلی وبیرونی حملوں، سازشوں سے پنجہ آزمائی کرتے ہوئے ایک طرف ترکی کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لاکھڑا کیا، دوسری طرف اسلام کی عزت وآبرو کا نشان امتیاز بن کر ابھرے ہیں، عالمی استعماری طاقتوں، اسرائیل وامریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فولادی عزم وحوصلہ کا نمونہ پیش کیا ہے، ارض الہی میں اسلام اور مسلمانوں کی مظلومیت پر آواز اٹھائی، غزہ وفلسطین سے برما تک خون مسلم کی ارزانی، اور ظلم وجور پر اہل اسلام کی مسیحائی کی ہے، ایک جامع ترین قد آور شخصیت بن کر ابھرے ہیں، ظاہر ہے کہ دشمنان اسلام، فرزندان یورپ، استعماری وطاغوتی قوتوں کو یہ کب گوارا ہوسکتا ہے، مرد بیمار کی رگوں میں حیات تازہ بیدار ہوجائے، اسلامی اخوت واتحاد اور خلافت کو اپنے ناپاک عزائم اور شیطانی منصوبوں کی راہ میں سنگ گراں سمجھنے والے اردوغان کی حکیمانہ، جرأت آمیز شخصیت وقیادت میں سلطان یلدرم کی قوت وشوکت، عبدالحمید ثانی کی حمیت وغیرت کی جھلک صاف محسوس کررہے ہیں، ان کی نظریں اس مرد مجاہد کے ہر اقدام سے خلافت عثمانی کے شکوہ وجلال کا مشاہدہ کررہی ہیں، اس لئے ان کا ہر حربہ اس خیاباں کو جلانے کے لئے استعمال ہورہا ہے، ان کا ہر قدم اس کی تخریب کے لیے اٹھ رہا ہے، ان کی ہر سازش اپنے تیر ونشتر کے ساتھ کفرنواز نام نہاد مسلم حکام وامراء کے جلو میں اس کے خلاف استعمال ہورہا ہے، کسی کے حق پر ہونے کے لئے یہ کافی ہوتا ہے کہ

باطل اس کے خلاف محاذ آرائی پر کمر بستہ ہو، تاریخ کا تجزیہ بتاتا ہے کہ مسئلہ صرف ایک ملک کی سیاست کا نہیں بلکہ کفر واسلام، اور حق وباطل کے معرکہ میں اپنے موقف پر غور کرنے کا ہے، غلبہ حق کی جد جہد، اور طاغوتی قوتوں سے مقابلہ آرائی کا ہے، اپنے کردار وعمل سے حق یا باطل کی تائید اور پھر انسانیت کی قیادت کے لئے انسانیت نواز قیادت کی تعیین کا ہے۔

اس تاریخ کو سامنے رکھ کر ایک کم فہم انسان بھی بہ آسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس طرح زمانہ قدیم میں استعماری طاقتیں ترکی کے خلاف منصوبہ بند سازشوں میں شریک تھیں، اور ان کا مقصد صرف اسلام سے دشمنی، اور اسلامی عظمت وشوکت، عزت ووقار کو ختم کرنا تھا، اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ کرنا تھا، وہی آج بھی زمانہ واشخاص کی تبدیلی کے ساتھ اسی تاریخ کو دہرا رہی ہیں، عالم اسلام کے ہر فرد کی دینی، اخلاقی ذمہ داری ہے کہ حالات کی سنگینی کے لئے سنجیدگی اختیار کرے، صحیح جائزہ لے، صحیح سمت سفر اور صحیح منزل کا انتخاب کرے۔

اب جنگ کی قیادت اسرائیل وامریکہ کے ہاتھ میں ہے، وہ ہر اس قوت وطاقت، اور سیاست وتحریک کو کچلنے کا عزم رکھتے ہیں جو اسرائیل کی بقاء وتحفظ کے لئے خطرہ ہے، یا صلیبی ومسیحی دنیا کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی یاد دلا سکتا ہے، شرق اوسط کی شکست وریخت اور منافق حکام وامراء کو باقی رکھا جائے گا اس لئے کہ وہ اسرائیل کی مصلحت ہے، ان کو ''خلافت'' کے مہیب سایہ سے خوفزدہ کر کے بے لگام آمریت، اور مدہوش شہنشاہیت کو باقی رکھا جائے گا، تاکہ وہ خلافت حریف بن کر اسلام کے اتحاد کو قائم نہ ہونے دیں، ان مطلق العنان حکمرانوں، اوباش شہزادوں کا ہر ظلم وآمریت ''جمہوریت'' اور ''حقوق انسانی'' کے علمبرداروں کے نزدیک اس لئے جائز و درست ہے کہ وہ اسلام کی مسکنت وبے چارگی کا مظہر، اور اس کی تذلیل کا مزید سامان ہے، عالم اسلام کے حکمرانوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں کہ جن طاغوتی قوتوں نے عربی خلافت کا خواب دکھایا اور دھوکہ دیا، جنہوں نے ہر میدان میں ان کے آباء واجداد کی بے آبروئی کی، ان سے موالات کا کیا نتیجہ نکلے گا، ان کے در کی کاسہ لیسی کیا رنگ لائے گی، ان کے وعدوں اور معاہدوں پر یقین سراب خادع کے سوا اور کیا ہوگا، افسوس کہ آج ''کتاب وسنت'' کی حکومت کا کلمہ چبنے والوں اور مدح سرائی کرنے والے خوشامدی لوگوں کو خلافت واتحاد اسلامی کی احادیث واسلامی احکام کیوں یاد نہیں آتے، آج کے حالات میں بہت واضح اشارے حق وباطل کے موجود ہیں، ایک طرف اسلام کی سربلندی، اور عزت وافتخار کو واپس لانے کا مسئلہ ہے، اور دوسری طرف کفر وکفر نواز قوتوں سے دوستی وموالات، اور اسلام کے خلاف ان کے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر اسلام کو مزید رسوا کرنے کا مسئلہ ہے، یا سر بہ جیب، جام بکف نغمہ بلبل سننے کا مرحلہ ہے، یا جام شکن، سر بکف جہاد زندگانی میں مردوں کی شمشیریں اٹھانے کا وقت ہے،

فیصلہ ترے ہاتھ،،،شکم،، یا روح،،، غلامی ومحکومیت، یا عزت وشوکت،،

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی

اللہ اس مرد کہستانی اور بندۂ صحرائی کی حفاظت فرمائے، اور اس کو اسلام کی عزت وسربلندی کے لئے قبول فرمائے، خدا کرے کہ مظلوم ومقہور امت مسلمہ ایک بار پھر خلافت کا جلال دیکھ کر فرحت وشادمانی کا سانس لے، وما ذلک علی اللہ بعزیز

☆☆☆

□گوشۂ ترکی

ترکی میں اسلامی اقدار کی بحالی

پس منظر و پیش منظر

محمد نفیس خاں ندوی

اگست 1897ء میں بیسل (سویزرلینڈ) میں پہلا عالمی صہیونی اجلاس منعقد ہوا،اس موقع پر تھیوڈر ہرزل (Theodor Herzl)نے عالمی صہیونی تحریک (World Zionist Organization) کی بنیاد رکھی،اس تحریک کے بنیادی و اولین مقاصد میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری شامل تھی،تھیوڈر ہرزل نے مغربی طاقتوں کی تائید کے بعد خلیفہ عبدالحمید ثانی سے ملاقاتیں کیں اور 1896ء سے 1902ء کے درمیان پانچ مرتبہ خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوا،ابتدائی ملاقاتوں میں اس بات کا اظہار کیا کہ اگر سلطنت عثمانیہ یہودی مہاجرین کو پناہ دے تو وہ سلطنت کے ماتحت رہیں گے اور اپنے کاروبار کے ذریعے بڑی رقم ٹیکس کی مد میں بھی دیں گے۔سلطان عبدالحمید نے یورپ میں مظالم سہنے والے یہودی مہاجرین کے سلطنت میں آنے پر آمادگی ظاہر کی مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان تمام کو کسی ایک جگہ پر نہیں رکھا جائے گا بلکہ وہ ملک کے مختلف علاقوں میں آباد کیے جائیں گے۔تھیوڈر ہرزل کا اصل مقصد یہودیوں کی ایک ایسی بڑی کمپنی کا قیام تھا جو ضرورت پڑنے پر جتنی چاہے زمین خرید سکے تاکہ ان کے خفیہ ارادوں کی تکمیل ممکن ہو چنانچہ اس نے سلطان کی اس شرط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح اس کے اور سلطان کے مابین معاہدہ طے نہ ہو سکا۔

ہرزل نے اپنی آخری ملاقات میں سلطان کو خطیر رقم کی پیشکش بھی کی اور کہا:اگر آپ بیت المقدس اور فلسطین میں ہمیں جگہ دے دیں تو ہم خلافت عثمانیہ کا سارا قرضہ اتار دیں گے اور مزید کئی ٹن سونا بھی دیں گے۔''

یہ وہ وقت تھا جب سلطنت عثمانیہ بحران کا شکار ہو چکی تھی،مالی حالت خستہ تھی،قرض کا بوجھ بڑھ چکا تھا،خلافت کی بنیادیں ہل چکی تھیں،اور عالمی سطح پر اس کا وزن گھٹ چکا تھا،ایسی صورت حال میں ایک خطیر رقم کی پیشکش اس کی معاشی صورتحال میں بہتری اور قرضوں کی ادائیگی کے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھی اور سلطان کی اولین ترجیحات میں سے ایک سلطنت کی معاشی حالت کو بہتر کرنا بھی تھا مگر سلطان عبدالحمید نے صہیونیوں کے عزائم بھانپتے ہوئے اس پیشکش کو یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا:

I cannot sell even a foot of land, for it does not belong to me, but to my people. My people have won this empire by fighting for it with their blood and have fertilized it with

their blood. We will again cover it with our blood before we allow it to be wrested away from us"

''میں زمین کا ایک فٹ ٹکڑا بھی نہیں بیچ سکتا کیونکہ یہ میری نہیں بلکہ عوام کی ملکیت ہے- میری رعایا نے یہ سلطنت اپنے خون سے حاصل کی ہے اور خون ہی سے اس کی آبیاری کی ہے- اس سے پہلے کہ ہم اسے اپنے ہاتھ سے جانے دیں، ہم دوبارہ اسے اپنے خون سے ڈھانپ لیں گے''-

ترکی کی اس گئی گذری حالت میں بھی اس کے خلیفہ نے اپنی دینی غیرت اور اسلامی حمیت کا ثبوت دیا، اگرچہ اس کے بعد سے ہی ترکی کے خلاف سازشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، یہودی لابی نے مسیحی وسائل کا بھرپور استعمال کیا، اور اپنی دانست میں یورپ کے اس ''مرد بیمار'' کی آخری سانسیں تک چھین لیں، چنانچہ 1918ء میں پہلی عالمی جنگ کے اختتام نے ترکی کی شکست وریخت پر مہر ثبت کردیں، برطانیہ کی سربراہی میں فاتح قوتیں ترکی کے بڑے حصے پر قابض ہوگئیں، اور پھر فاتح اور مفتوح کے درمیان رسوا کن شرطوں کے ساتھ ایک ظالمانہ معاہدہ ہوا جسے ''معاہدۂ لوزان'' (Treaty of Lausanne) کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ معاہدہ پورے سو سال پر محیط ہے۔

معاہدۂ لوزان کا انعقاد سوئزرلینڈ کے ایک شہر ''لوزان'' میں 24 جولائی 1923ء کو اتحادیوں اور ترکی کے درمیان طے پایا تھا، اس معاہدہ کی رو سے ترکی کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے، اور ترکی اگلے سو سال کے لیے اس معاہدہ پر عمل درآمد کا پابند قرار پایا، معاہدہ کی دفعات اور ان دفعات میں پوشیدہ یورپ کی مسلم دشمنی بھی ملاحظہ ہو:

نمبر۱:- اسلامی خلافت ختم کی جائے گی اور اس کی جگہ سیکولر ریاست قائم ہوگی۔

نمبر۲:- عثمانی خلیفہ کو ان کے خاندان سمیت ملک بدر کیا جائے گا۔

نمبر۳:- خلافت کی تمام مملوکات ضبط کرلی جائیں گی جن میں سلطان کی ذاتی املاک بھی شامل ہوں گی۔

نمبر۴:- ترکی پٹرول کے لئے نہ اپنی سرزمین پر اور نہ ہی کہیں اور ڈرلنگ کرسکے گا، اپنی ضرورت کا سارا پٹرول اسے امپورٹ کرنا ہوگا۔

نمبر ۵:- باسفورس عالمی سمندر شمار ہوگا اور ترکی یہاں سے گذرنے والے کسی بحری جہاز سے کسی قسم کا کوئی ٹیکس وصول نہیں کرے گا۔

واضح رہے کہ باسفورس کی سمندری کھاڑی بحر اسود، بحر مرمرہ اور بحر متوسط کا لنک ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ عالمی تجارت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھنے والی نہر سویز کے ہم پلہ قرار دی جاتی ہے۔

اس معاہدہ کے ساتھ ہی ''خلافت عثمانیہ'' کی بساط لپیٹ دی گئی اور افریقہ، ایشیاء اور یورپ تک پھیلی ہوئی عظیم سلطنت بندر بانٹ کا شکار ہوگئی، یورپ کے علاقے چھین لیے گئے، عراق، اردن اور فلسطین برطانیہ کے کنٹرول میں چلا گیا، شام، لبنان، الجزائر اور لیبیا فرانس کے قبضہ میں آئے، اناطولیہ اور آرمینیا کو ترکی سے کاٹ کر آزاد ملک بنا دیا گیا۔ خلیفہ کی ملک وبیرون ملک جائدادیں ضبط کرکے ملک بدر کردیا گیا، اسی پر بس نہیں، خلیفہ کی معزولی کا پروانہ لیکر اسی صہیونی لیڈر ہرزل کو بھیجا گیا جسے خلیفہ نے فلسطین کے مطالبہ پر اپنے دربار سے دھتکار کر نکالا تھا۔ صیہونیوں کی جانب سے

یہ لہراتا ہوا وہ خنجر تھا جو خلافت کی قبا چاک کرتا ہوا فلسطین کے سینے میں اتر گیا۔

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
اپنوں کی سادگی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

مبصرین کی نظر میں اسلامی تاریخ کے سانحوں میں سب سے دردناک اور کرب انگیز سانحہ شاید 1923ء میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا تھا۔ ترکی میں خلافت قائم تھی، وہ جیسی بھی تھی، مسلمانوں کے اتحاد اور ان کی مرکزیت کا عنوان تھی، یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان بھی خلافت عثمانیہ کے خاتمے پر تڑپ اٹھے، متحدہ ہندستان کی گلیاں اور بازار ''تحریک خلافت'' کے پرہجوم جلسوں اور پرجوش نعروں سے گونج اٹھے۔ یہ عجیب تاریخی منظر تھا کہ ایک طرف ترک نیشنلزم اور ''قومیت عربیہ'' کا ہتھیار عالم اسلام کے حصے بخرے کرنے اور خلافت عثمانیہ کو بکھیرنے کے لیے پوری قوت کے ساتھ استعمال کیا جا رہا تھا، انہی دنوں جنوبی ایشیا میں قومی راہنماؤں مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، حکیم محمد اجمل خانؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ، چودھری افضل حقؒ، مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جیسے علما و قائدین خلافت عثمانیہ کو بچانے کے لیے سرگرم عمل تھے اور وہ برطانوی حکومت سے خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کی مہم روک دینے کا مطالبہ کر رہے تھے، اس دور کا یہ نعرہ آج بھی پرانے لوگوں کے کانوں میں گونج رہا ہے کہ ''بولی اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو''۔ اس مہم میں بڑی حد تک گاندھی اور نہرو بھی تحریک خلافت کی حمایت میں تھے اور کھلے بندوں اس کا ساتھ دے رہے تھے، یہ تحریک خلافت برصغیر میں سیاسی تحریکات کی ماں ثابت ہوئی جس کی کوکھ سے آزادی ہند کی سیاسی تحریکات نے جنم لیا۔

بہرحال مذکورہ شرائط پر عمل کرتے ہوئے دنیا کو ایک نئے ترکی سے متعارف کرایا گیا، اس نئے ترکی کی سیاسی باگ ڈور مغربی ایجنٹ مصطفیٰ کمال اتاترک کے ہاتھوں میں تھما دی گئی پھر ساری دنیا نے دیکھا کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ترکی میں نوجوان ترکوں کا غلبہ شروع ہو گیا۔ یہیں سے Youngs Turks کی اصطلاح نکلی، جنہوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں اسلام پسندوں پر مظالم ڈھائے، علما کا قتل عام کیا، نماز کی ادائیگی اور تمام اسلامی رسومات پر پابندی لگا دی، عربی زبان میں خطبہ، اذان اور نماز بند کر دی گئی، مساجد کے اماموں کو پابند کیا گیا کہ وہ ''ترک'' زبان میں اذان دیں، نماز ادا کریں اور خطبہ پڑھیں، اسلامی لباس اتروا کر عوام کو یورپی کپڑے پہننے پر مجبور کیا گیا، مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے ساتھی نوجوان ترکوں نے ترکی میں اسلام کو کچلنے کے لیے جتنی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا، اس کی مثال روس اور دیگر کمیونسٹ ملکوں کے علاوہ شاید کہیں اور نہ ملے۔

کمال اتاترک نے ترکی کو بچانے کے نام پر یورپ کے مطالبہ پر نہ صرف خلافت سے دستبرداری اختیار کی تھی بلکہ شریعت اسلامیہ اور مذہبی شعائر کو بھی پوری طرح مسخ کر دیا تھا جس کا تسلسل 1938 تک قائم رہا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد عوام کو کچھ جمہوری آزادیاں نصیب ہوئیں، سیاست میں اتاترک کی ری پبلکن پارٹی ہی کے بطن سے ڈیموکریٹک پارٹی نے جنم لیا اور عدنان مندریس کی قیادت میں دو پارٹی نظام اور دستوری حکومت کا یک گونہ آغاز ہوا جس کے نتیجے میں عوام کو اپنے دینی اور تہذیبی جذبات

کے اظہار کا کچھ موقع ملا، دینی شعائر پر جو پابندیاں تھیں وہ کچھ کم ہوئیں، اذان عربی زبان میں بحال ہوئی، قرآن اور دینی کتب سے رجوع بڑھا، دینی مدارس کا احیا اسکول کی شکل میں ہوا، اور اس طرح ترکی نے اپنی اصل شناخت کی طرف مراجعت کے سفرِ نو کا آغاز کیا۔

اسلامی بیداری کی ان کرنوں کی وجہ سے ترکی کے سیکولر نظام میں دراڑیں پڑنے لگیں اور اسے 'خطرے کی گھنٹی' سمجھتے ہوئے ملک کی سیکولر قوتوں نے (جن کے چار ستون فوج، بیوروکریسی، عدالت اور میڈیا تھے)، مغربی اقوام کی مدد سے ترکی کی خود اپنی دینی اور تہذیبی شناخت کے خلاف ایک نئی کش مکش اور تصادم کو فروغ دیا جس نے ملک کے امن وسکون کو غارت کر دیا، عدنان مندریس کے خلاف فوجی بغاوت ہوئی، اور انھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۹۷ء تک کے نظریاتی کش مکش کے اس دور میں عدنان مندریس کے چند سالہ شعلے کے علاوہ جن دو شخصیات نے تاریخ کے رُخ کو موڑنے کا کام کیا ان میں سب سے نمایاں بدیع الزماں سعید نورسی (۱۸۷۶ء-۱۹۶۰ء) اور نجم الدین اربکان (۱۹۲۶ء-۲۰۱۱ء) ہیں۔ سعید نورسی نے شروع میں اتاترک کا ساتھ دیا لیکن جب اتاترک نے سیکولرزم اور مغرب کی تقلید کا راستہ اختیار کیا، قومیت کے سیکولر تصور کو قوت کے ذریعے مسلط کرنے کی کوشش کی، اور اسلام کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کرنے کا ایجنڈا شروع کیا تو سعید نورسی نے اسے چیلنج کیا اور قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں لیکن اسلام کی بنیادی دعوت اور پیغام کو زندہ رکھا اور تصوف کے سلسلۂ نقشبندی کے فروغ، دینی مدارس کے قیام اور اپنے خطوط اور تحریروں کے ذریعے اسلام کی شمع کو روشن اور عام آبادی کو دین سے وابستہ رکھنے کی خدمت انجام دی۔

نجم الدین اربکان نے ان دعوتی اور روحانی کوششوں کو اپنے انداز میں مضبوط اور مستحکم کرنے کے ساتھ دین کے اجتماعی زندگی میں کردار کے احیا کو اپنا مشن بنایا، اور نہایت مشکل حالات میں بڑی حکمت و دانش مندی اور صبر و استقامت کے ساتھ ترکی کو اس کی دینی اور تہذیبی شناخت کے احیا اور اُمت مسلمہ سے ایک بار پھر جڑ کر طاقت کی نئی قوت کے حصول کے راستے پر ڈالا۔ اس کے ساتھ انھوں نے ترکی کو مغرب کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی غلامی سے نکال کر خود انحصاری اور ملّت اسلامیہ سے دوبارہ جڑنے اور مربوط ہونے کے نئے تاریخی سفر کا آغاز کیا۔

1995 میں ہونے والے انتخابات میں نجم الدین اربکان کی رفاہ پارٹی نے ملک کے 21 فیصد ووٹ حاصل کر لیے اور ایک دوسری جماعت کے ساتھ شراکت میں حکومت قائم کر لی، ترکی کے ایوان نمائندگان نے آپ کو اپنا قائد ایوان منتخب کر لیا، عدنان مندریس شہید کے بعد ترکی کے ایوان اقتدار میں پہلا اسلام پسند مرد جری داخل ہوا، آپ نے ترک عوام کے معیار زندگی بلند کرنے کی خاطر اہم کثیر الجہتی اقدامات کیے، آپ کی معتدل مزاجی اور فراست کا کرشمہ یہ ہے کہ آپ نے ترک سیاست کا محور سیکولرازم سے اسلام میں تبدیل کر دیا۔ ترک فوج کے سیکولر پسندوں کو آپ کی بلکہ دوسرے الفاظ میں اسلامی طرز حکمرانی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت کہاں گوارا ہو سکتی تھی، انہوں نے صرف ایک سال بعد ہی اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ کی حکومت ختم کر دی۔ اس بار آپ کے عملی سیاست میں حصہ لینے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔

نجم الدین اربکان کے بعد ترکی کے نظام حکومت میں اسلامی روح پھونکنے کا کارنامہ موجودہ صدر حافظ رجب طیب اردغان نے انجام دیا، ابتدائی دور میں وہ ترکی کے قدآور اسلامی نظریاتی وسیاسی رہنما نجم الدین اربکان کی 'رفاہ اسلامی پارٹی' سے وابستہ رہے،انہوں نے بعض عملی مصالح سے 'انصاف اوروکاس پارٹی' قائم کی ،جس کی روح اربکان کی تحریک کا ہی پرتو ہے۔اسی تحریک کی بدولت ترکی میں جوہری تبدیلیوں کا دور شروع ہوا،سیکولرزم کے نام پرعوام پرمسلط جبری لادینیت کا حصار ٹوٹا، مذہبی آزادی نے عوام کوروحانی سکون دیا اور دینی شعارواقدار کی بحالی نے اسکولوں، کالجوں، دفتروں اور بازاروں کے ماحول کو نیا رنگ وا?ہنگ عطا کیا، پہلے وزیراعظم اورپھرصدرکی حیثیت سے جناب رجب طیب اردغان اوران کے پیش روصدرعبداللہ گل کا اس تبدیلی میں اہم کردار رہا۔ظاہر ہے'اسلام فوبیا' کے عالمی ماحول میں ترکی میں کمال اتاترک کی لادینی وراثت کا سمٹ جانا اور یوروپ کے ہی ایک ملک میں پھر سے اسلام کا رنگ ابھر آنا بہت سے ذہنوں میں خارکی طرح چبھتا ہے۔

صدراردغان نے استنبول کے میئر(1994-98) سے موجودہ منصب صدارت تک طویل سیاسی سفر طے کیا ہے۔ ترکی کو جو'یوروپ کا بیمار' کہلاتا تھا،اقتصادی اعتبار سے مضبوط کیا،ترکی نے تعمیراتی میدان میں کمال کی ترقی کی اور دنیا کی سب سے بڑی تعمیراتی انڈسٹری کھڑی کرلی، زراعت اور باغبانی سے پیداواراور برآمدات میں ایک دہائی میں تین گنا سے زیادہ اضافہ ہوا،عوام کی بنیادی ضرورتوں جیسے صحت خدمات، پانی کی دستیابی، سڑک، مواصلات وغیرہ کو وسعت حاصل ہوئی،تعلیم کے شعبہ میں بڑا کام ہوا،اعلیٰ تعلیم کے لئے بڑی تعداد میں بیرونی طلبہ ترکی کا رخ کرنے لگے ہیں۔ یہ سارے ترقیاتی کام صدر اردغان کی مقبولیت کی بنیاد بنے،جس کا اندازہ 2016 میں فوجی بغاوت کے وقت ہوگیا تھا جب عوام جدید اسلحہ سے لیس فوجیوں اوران کے ٹینکوں کے سامنے سینہ سپر ہوگئے ، ان کو آگے نہیں بڑھنے دیا اوردنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

طیب اردغان کی مقبولیت کو مغربی طاقتوں نے بہت سنجیدگی سے لیا، کیونکہ اردغان کی اسلام پسندی نہ صرف سیکولرازم کے لیے خطرہ ہے بلکہ پورے یہودی ومسیحی اقتدار کے لیے بھی ایک چیلنج ہے،اگر ترکی دوبارہ اپنی سابقہ قوت حاصل کرتا ہے اورعثمانی شان وشوکت کے ساتھ وہ عالمی سیاست میں قدم رکھتا ہےتو مغربی طاقتوں کودوبارہ سرنگوں ہونا پڑسکتا ہے،اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اردغان اپنی تقاریر میں یہ کہتے کیوں نظر آتے ہیں کہ 2023 کے بعد ترکی پہلے جیسا نہیں رہے گا۔،انھوں نے بارہا کہا ہے کہ 2023ء کے بعد ترکی ایک کمزوراور بیمار ملک نہیں رہے گا بلکہ ایک طاقت ور اورترقی یافتہ ملک کی حیثیت سے ابھر کر یورپی سازشوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگا، ہم ترک سرزمین پر اپنی ضرورت کے مطابق تیل اور دیگر معدنیات بھی تلاش کریں گے اورنہر سویز کی طرح ایک ایسی نہر بھی کھودیں گے جو بحراسود کو بحرہ مرمرہ کے ساتھ ملا کر مربوط کرے گی۔اس نہر کی کھدائی کے بعد ترکی یہاں سے گزرنے والے ہر بحری جہاز سے ٹیکس وصول کرے گا۔جس سے ترک معیشت مضبوط سے مضبوط تر ہوگی۔

مذکورہ تفصیلات ہی کی روشنی میں یہ کہانی واضح ہوجاتی ہے کہ مغرب کیوں اردغان کا اس قدر سخت دشمن بنا ہوا ہے اور

مغرب کے اپنے مفادات کس طرف ہیں؟ اور اردغان کیوں ترکی کے لیے ایک پاورفل منتظم اور صدر چاہتے ہیں؟ طیب اردغان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ لولا لنگڑا اور کمزور صدر ترکی کے لیے زیادہ جرات مندی سے اہم ترین فیصلے نہیں کر پائے گا اور نہ ہی یورپی ممالک کی سازشوں کا مقابلے کرنے کی اس میں جرأت ہوگی۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ بات ترکی کے مفاد میں ہے کہ امریکی طرز پر صدارتی اختیارات سے لیس ترک فوج کا کمانڈر انچیف اور قوم کا اعتماد رکھنے والا صدر ہو جو عالمی سطح پر ترکی کو اس کا آبرومندانہ مقام دلا سکے۔

چنانچہ اسی منظر وپس منظر میں 24 جون اتوار کو ترکی میں سنسنی خیز انتخابات ہوئے، تقریباً 6 کروڑ ترک باشندوں نے اپنے حق رائے دہی کا ستعمال کیا، صدارتی عہدے کے لیے 6 امیدوار میدان میں تھے،، ترکی کے انتخابی قوانین کے مطابق اگر کسی بھی امیدورا کو ۵۰ فیصد سے زائد ووٹ نہیں ملتے تو سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والے دو امیدواروں کے درمیان دوبارہ الیکشن کرایا جاتا ہے جسے Run-off کہا جاتا ہے۔، اور اس کے لیے 8 جولائی کی تاریخ طے تھی، طیب اردغان کی پوری کوشش تھی کہ انھیں 50 فیصد سے زائد ووٹ حاصل ہو جائیں تاکہ انھیں ووٹنگ کے دوسرے راونڈ میں نہ جانا پڑے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اردغان کو 53 فیصد ووٹ حاصل ہوئے جبکہ ان کے حریف محرم انجے کو 31 فیصد ووٹ ملے، اس طرح رجب طیب اردغان نے صدارتی الیکشن میں تاریخی کامیابی حاصل کر لی۔

ترکی انتخابات کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے لیے جیسی انتخابی مہم ترکی میں چلی اُس سے کہیں زیادہ جوش وخروش یورپ میں نظر آیا، فرانس کے صدر ایمیونل میکرون، ہالینڈ کے وزیراعظم مارک روٹے (Mark Rutte)، جرمن چانسلر انجیلا مرکل اور ہنگری کے متعصب قوم پرست وزیراعظم وکٹر اربن (Victor Orban) کے ساتھ امریکی رہنماؤں نے طیب اردغان کے خلاف زبردست مہم چلائی، یورپی ممالک میں ''صدر اردغان ایک ڈکٹیٹر'' کے عنوان سے بڑے بڑے پوسٹر لگا دئے گئے، ترک قانون کے تحت غیر ممالک میں آباد ترک شہریوں کو بھی ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہے، چنانچہ ترکی کی سیاسی جماعتیں یورپ کے بڑے شہروں میں بھی جلسے اور ریلیاں منعقد کرتی رہیں، لیکن اردغان کی پارٹی AKP کو یورپ میں کسی بھی طرح کے سیاسی جلسہ کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔

گزشتہ سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے رجب طیب اردگان نے ''لوزان معاہدہ'' کے بارے میں کہا تھا کہ یہ وہ معاہدہ ہے جس کے تحت ترکی کو خلافت و شریعت سے دستبردار ہونا پڑا تھا، یہ معاہدہ ہم پر جبراً مسلط کیا گیا تھا جو عسکری یلغار کے سائے میں ہوا تھا اور اس میں ترک عوام کی مرضی شامل نہیں تھی۔ اردغان کے اس بیان سے تاریخ کا شعور رکھنے والے کارکنوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ۲۰۲۳ء میں اس معاہدہ کی مدت ختم ہونے پر اردگان کے عزائم کیا ہیں؟ اسی لیے پورا مغرب طیب اردغان کے مخالفوں کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔

ترکی میں صدارتی انتخابات نومبر 2019ء کو ہونے تھے لیکن صدر طیب اردغان نے قبل از وقت انتخاب کرانے کا فیصلہ کیا، ان کا موقف تھا کہ تیزی سے بدلتی علاقائی صورت حال، خاص طور سے شام میں نیٹو اور امریکہ کی جانب سے ترک مخالف دہشت گردوں کی پشت پناہی، یورپ کی جانب

سے غیر اعلانیہ اقتصادی پابندیوں اور دوسری متوقع آزمائشوں کے پس منظر میں حکمرانی کے لیے عوامی اعتماد کی تجدید کی ضرورت ہے، چنانچہ انھوں نے 24 جون کو انتخابات کا اعلان کردیا، قومی اسمبلی تحلیل کردی اور صدارتی و پارلیمانی انتخابات ایک ہی دن منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اپنے اقتدار کی مدت کو رضا کارانہ طور پر کم کرکیا انتخابات کا اعلان ایک طرف اردغان کے حق میں تازہ سیاسی اقتدار (Mandate) کے حصول کا ایک مثبت جمہوری اقدام تھا، تو دسری جانب مغربی طاقتوں کے لیے سخت تشویش وفکرمندی کا باعث، چنانچہ 18 اپریل کو صدر اردغان کی جانب سے قبل از وقت انتخاب کے اعلان کے ساتھ ہی ''ترکی آمریت کی راہ پر'' کے عنوان سے مراکزِ دانش (ThinkTanks) نے سارے یورپ میں مذاکرے اور سیمینار منعقد کیے اور متنبہ کیا کہ نئے آئین میں ترک صدر کو بہت زیادہ اختیارات دیئے گئے ہیں اور اگر اردغان دوبارہ صدر منتخب ہوگئے تو عثمانی خلافت کی تجدید بس چند دنوں کی بات ہوگی۔

اردغان کے خلاف پروپیگنڈوں کے ساتھ ہی ان کے مقابلہ کے لیے ایک مضبوط امیدوار کی تلاش شروع ہوئی، 2014ء کے صدارتی انتخاب میں روایتی سیکولر امیدوار کے بجائے OIC کے سابق سیکریٹری جناب اکمل الدین احسان اوغلو کو میدان میں اتارا گیا تھا تاکہ اسلام پسندوں کے ووٹ تقسیم کیے جاسکیں، اِس بار پھر وہی حکمت عملی اختیار کی گئی اور سابق صدر اور AKP کے رہنما جناب عبداللہ گل کو متحدہ حزبِ اختلاف کا ٹکٹ پیش کیا گیا، لیکن اردغان سے ناراضی کے باوجود عبداللہ گل راضی نہ ہوئے۔

عبداللہ گل کے بعد سیاسی میدان میں ابھرتی ہوئی خاتون رہنما میرال آقسینر (MeralAksener) کو اردغان کے مقابل تیار کیا گیا، میرال ترک عوام میں ایک مقبول ومعروف نام تھا، خاتون ہونے کی بنا پر ترک میں ایک نیا جوش تھا، پہلی خاتون صدر کی حیثیت سے ترکی ایک نئی تاریخ رقم کرنے کی راہ پر تھا، اور یہ اس لیے بھی دشوار نہیں تھا کہ میرال کی شہرت نجم الدین اربکان کی شاگردہ کی حیثیت سے تھی، اور انہیں کے بینر تلے میرال نے اپنا سیاسی سفر شروع کیا تھا، وزیراعظم تانسوچلر کی مخلوط حکومت میں مختصر عرصے کے لیے وزیر داخلہ بھی بنی تھیں، کچھ عرصے بعد وہ رفاہ پارٹی سے الگ ہوکر نیشنلسٹ موومنٹ پارٹی (MHP) میں شامل ہوگئیں اور پھر جلد ہی اپنی جماعت بنالی۔ اس متنوع سیاسی پس منظر کی بنا پر اسلام پسند، قوم پرست اور سخت گیر سیکولر طبقات سمیت تمام سیاسی مکاتبِ فکر میں ان کے لیے نرم گوشہ پایا جاتا تھا، چنانچہ ان کے نام پر مہر لگادی گئی اور نئے جوش وخروش کے ساتھ انتخابی مہم کا آغاز ہوا۔

سیاسی ومذہبی پس منظر کے ساتھ میرال کی انتخابی سرگرمیوں نے ترکی سیاست میں ہلچل مچادی، اور طیب اردغان کے مقابل انھیں ایک مضبوط امیدوار تسلیم کیا جانے لگا لیکن اسی دوران یہ انکشاف ہوا کہ محترمہ میرال کو فتح اللہ گولن کی سرپرستی حاصل ہے۔ فتح اللہ گولن وہی پراسرار شخص ہیں جنھیں ترکی میں امریکی ایجنٹ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، اور انہیں کو 15 جولائی 2016ء کو ہونے والی ناکام فوجی بغاوت کا کلیدی ملزم گردانا جاتا ہے، چنانچہ فتح اللہ گولن کا نام سامنے آتے ہی میرال کی مقبولیت کا گراف تیزی سے اوندھے منہ آگرا، اس طرح طیب اردغان کے مقابل ان کی دعویداری ختم ہوگئی۔

میرال کے فلاپ ہونے کے بعد حزبِ اختلاف کا سیاسی سفر پھر نقطۂ آغاز پر آ رکا، نئے سرے سے ایک ایسے نام کی تلاش شروع ہوئی جو اردغان کو مضبوط ٹکر دے سکے، اس دوران ری پبلکن پارٹی (CHP) کے امیدوار پروفیسر محرم انجے اپنی انتخابی مہم کو خاصہ منظّم کر چکے تھے، وہ طبعیات کے پروفیسر اور نظریاتی طور پر سیکولر ہیں، میرال سے مایوس ہوکر یورپ اور ترکی کے سیکولر عناصر نے اپنا سارا وزن محرم انجے کے پلڑے میں ڈال دیا اور زوردار انتخابی مہم کا آغاز ہوا۔

میڈیا نے پروپیگنڈوں کے ساتھ نفسیاتی جنگ کا بھی آغاز کر دیا جس میں امریکہ کا FOX ٹیلی ویژن پیش پیش تھا، فوکس کے ساتھ بی بی سی، جرمن میڈیا اور یورپ کے تجزیہ نگاروں نے بھی رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی، اور اردغان کی مقبولیت کا گراف کم کرتے ہوئے پر زور طریقے سے یہ تاثر دیا کہ ان کی مقبولیت بمشکل 46 سے 48 فیصد ہے، جبکہ کامیابی کے لیے 50 فیصد ووٹ ضروری ہیں، لہٰذا جب 24 جون کو فیصلہ آئے تو اردغان اپنی منزل سے دور ہوں گے، جس کے نتیجہ میں قانون کے مطابق پہلی اور دوسری پوزیشن پر آنے والے امیدواروں کے درمیان فیصلہ کن مقابلہ یعنی Run-off ہوگا۔ ان تجزیوں نے اردغان مخالفین کا حوصلہ بلند کر دیا۔ ایک طرف انتخابی مہم میں شدت آئی تو دوسری طرف پارلیمانی انتخابات کے لیے CHP نے محترمہ میرال کی IYI پارٹی اور ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ مل کر ایک قومی اتحاد تشکیل دے دیا اور پھر سعادت پارٹی بھی اس اتحاد میں شامل ہوگئی۔ اسی کے ساتھ صراطِ مستقیم پارٹی، بائیں بازو کی ڈیموکریٹ لیفٹ پارٹی اور مادر وطن پارٹی نے بھی قومی اتحاد کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ نیشنلسٹ موومنٹ پارٹی (MHP) پہلے ہی سے اردغان کی اتحادی تھی، چنانچہ ان دونوں پارٹیوں نے مل کر پارلیمانی انتخاب کے لیے عوامی اتحاد قائم کر لیا اور جلد ہی اسلامی خیالات کی حامل دائیں بازو کی ایک چھوٹی جماعت BBP بھی عوامی اتحاد کا حصہ بن گئی۔

سیکولرازم کا تحفظ، شہری آزادی اور ترک قوم پرستی محرم انجے کے منشور کا حصہ تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے خانہ جنگی کا شکار شامیوں کو پناہ دینے پر صدر اردغان کو شدید تنقید کا نشانہ بھی بنایا جو محرم کے خیال میں ملکی معیشت پر بوجھ ہیں۔ اس کے بالمقابل اردغان کی انتخابی مہم کی بنیاد شفاف طرزِ حکمرانی، عثمانی اقدار، دفاعی صنعت میں خود کفالت کے ساتھ دنیا بھر میں انسانی حقوق کی پاسداری پر تھی۔ اس آخری نکتے پر ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کی پھبتی کسی گئی، لیکن سلیم الفطرت ترکوں نے اسے بہت پسند کیا۔

انتخابی مہم کے آغاز سے ہی اردغان کا پلہ بھاری تھا لیکن CHP کو ایک جامع اتحاد کی بنا پر یہ توقع تھی کہ وہ پہلے مرحلے میں مطلوبہ 50 فیصد ووٹ نہیں لے سکیں گے، اور اردغان کو دوسرے مرحلے کے براہِ راست انتخاب میں شکست دے دی جائے گی، اسی وجہ سے انتخابات کے روز زبردست جوش و خروش پایا گیا، لیکن نتائج نے سیکولر اتحاد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور طیب اردغان پہلے ہی مرحلہ میں اکثریت حاصل کر کے کمال اتاترک کے بعد سب سے زیادہ طاقتور رہنما بن گئے اور 2023 تک کے لیے ملک کے صدر قرار پائے۔

یہ انتخابات اس لحاظ سے بے حد اہم تھے کہ اب ترکی میں صدارتی نظام پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا، اس نظام کے تحت انتظامیہ اور مقنّنہ (پارلیمان) کو بالکل علیحدہ کر دیا جائے گا اور امریکہ کی طرح وزرا قومی اسمبلی کے رکن نہیں ہوں گے، بلکہ اگر

صدر نے کسی رکنِ قومی اسمبلی کو کابینہ کا رکن نامزد کیا تو اُسے وزارت کا حلف اٹھانے سے پہلے پارلیمان کی رکنیت سے استعفیٰ دینا ہوگا، پارلیمنٹ صرف قانون سازی کے فرائض سرانجام دے گی اور تمام انتظامی اختیارات صدر کے پاس ہوں گے، وزیراعظم کا منصب ختم کردیا جائے گا اور صدر اپنی نیابت کے لیے نائب صدر نامزد کریں گے جو پارلیمان کا سربراہ ہوگا۔

ترکی میں نافذ ہونے والے صدارتی نظام کے تجزیہ کے بعد یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ آج زمام اقتدار رجب طیب اردغان جیسے دیندار شخص کے سپرد ہے، اور امید ہے کہ وہ ان اختیارات کو ترک قوم اور امت مسلمہ کے حق میں مؤثر تر بنائیں گے، تاہم سیاسی مفکرین کا کہنا ہے کہ ایسا نظام حکومت جس میں کل اختیارات ایک فرد یا اس کے گرد چند افراد کے ہاتھوں میں سمٹ آتے ہیں، اس وقت بدترین نظام بن جاتا ہے جب بدنیتی، کوتاہ اندیشی اور غلط روی راہ پاجائے، موجودہ قانون کے تحت صدر اردغان زیادہ سے زیادہ 2032 تک برسراقتدار رہ سکتے ہیں۔ لیکن کیا لازم ہے ان کے بعد میں آنے والے افراد بھی ملک وملت کے مفاد میں ان اختیارات کو جو صدر محترم نے اپنے لئے حاصل کئے ہیں، اسی زیرکی اور دیانت سے استعمال کرسکیں گے؟ نئے نظام میں وزیراعظم کا منصب ختم ہو جائے گا۔ وزیروں کا تقرر براہ راست صدر کریں گے، اس لئے وہ صدر کو جواب دہ ہونگے پارلیمنٹ کو نہیں، جس سے پارلیمنٹ کمزور ہوگی۔ ایسا نظام جس میں موثر نگرانی اور توازن (Checks and balances) کا میکانزم شامل نہ ہو، ملک ومعاشرے کے لئے خطرہ بن جاتا ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب بڑی عیار طاقتیں دیگر ممالک کے حکمرانوں اور وسائل کا استعمال اپنے مفاد میں کرنے کی مہارت رکھتی ہیں۔ یہ صورت عوام میں بے اطمینانی اور ملک میں شورش کو ہوا دے سکتی ہے، اس لیے ہمیں سکہ کے اس دوسرے رخ سے بھی باخبر رہنے کی ضرورت ہے، اور اردغان سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس نظام میں دیرسویر سیکولرازم کی جگہ اسلامیت کو جزلاینفک کے طور پر شامل کریں گے تاکہ ان کے بعد کوئی ایسا شخص آسانی سے کرسی اقتدار پر قابض نہ ہونے پائے جو ان اختیارات کا غلط استعمال کرے اور عالم اسلام ایک بار پھر کمال اتاترک کے عہد اقتدار کو دیکھ کر خون کے آنسو بہائے۔

انتخاب جیت جانے کے بعد طیب اردغان کو بہت سے سنگین چیلنجز کا سامنا ہے، یورپ کے اکثر ممالک کا رویہ ترکی سے معاندانہ ہے جس کی وجہ سے ان ممالک نے بعض غیر اعلانیہ پابندیاں بھی عائد کررکھی ہیں، اور آگے بھی وہ اپنی دشمنیاں ظاہر کرتے رہیں گے، گزشتہ کچھ عرصے سے ترک لیرا (Turkish Lira) شدید دباؤ میں ہے ادھر چند ماہ کے دوران اس کی قیمت میں 20 فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ ترکی کی عراق اور شام سے ملنے والی سرحدوں پر کشیدگی ہے جس کی وجہ سے انقرہ کے دفاعی اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ اقتصادی ترقی کے لیے اردغان نے طیارہ سازی کی صنعت کے قیام، شمسی توانائی کے فروغ اور دفاعی صنعت کو ترقی دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ترک قوم 5 سال بعد 2023ء میں اپنی آزادی کا سو سالہ جشن منائے گی، صدر اردغان نے 2023ء میں ملک کی فی کس آمدنی کے لیے 23 ہزار ڈالر کا ہدف طے کیا ہے جبکہ اس وقت فی کس آمدنی 11 ہزار ڈالر کے قریب ہے۔ گویا وقت کم اور مقابلہ سخت!

☆☆☆

❑گوشۂ ترکی

ترکی میں ہم جنس پرستوں کا جلوس؟

ایک خاص طبقہ کی بوکھلاہٹ اور غیر اخلاقی حرکت

شیخ اسماعیل کرخی ندوی

ہم بلا وقت ضائع کئے چند حقیقتیں سامنے رکھنا چاہیں گے:

سب سے پہلے تو یہ کہ اردوغان نے کبھی بھی ہم جنس پرستوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ اُنکے بیانات میں واضح الفاظ میں بار بار یہ سنا گیا کہ ہم ایک پاکباز اور پختہ ایمان والی نسل چاہتے ہیں، مزید اردوغان نے اس طرح کا پیشہ اپنانے والوں کے لئے سخت ترین قوانین پاس کئے، میں نے دفعہ ۲۲۷ کے تحت جسم فروشی پر مفصل بحث کی ہے اس پر بھی بہت تفصیل سے بات کرسکتا ہوں لیکن فی الوقت اختصار کافی ہے..

یادرہے ترکی میں ہم جنس پرستوں کو قانونی طور پر ۱۹۲۳ء میں تسلیم کیا گیا جبکہ ہم جنس پرست فوجیوں کے لئے ۱۹۵۱ء میں قوانین بنائے گئے.

legal act since the day it was founded in 1923.[1] LGBT people have had the right to seek asylum in Turkey under the Geneva Convention since 1951 (wikipedia)

مزے کی بات یہ ہے کہ تب سے اب تک مخالفین کے پیٹ میں کوئی درد نہیں تھا، لیکن اچانک شور مچانے لگے کہ اردوغان نے ہم جنس پرستوں کے حقوق محفوظ رکھنے کا قانون بنا دیا ہے، حالانکہ یہ صریح بہتان ہے، دراصل اردوغان نے جب حکومت سنبھالی تو ترکی ناگفتہ بہ حالات سے گزر رہا تھا لیکن ۲۰۰۸ء تک ترکی کی حالت حیرت انگیز طور پر تبدیل ہوگئی، اُس وقت تک اردوغان عالمی منظر نامہ پر صرف ایک کامیاب سیاست داں کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، اور اردوغان نے خود کو یہی ثابت بھی کرنا چاہا، اسی لئے ابتدا میں وہ عالمِ اسلام کے حالات یا اسلامی موضاعات پر کھل کر بات کرنے سے گریز کرتے رہے، اسی اثناء میں ترکی میں ایک حادثہ یہ پیش آیا کہ ایک کردش باپ نے اپنے بیٹے کو ہم جنس پرستی کے جرم میں قتل کردیا، حکومت کی طرف سے فوری کاروائی نہ ہونے کے سبب سارا یورپ بوکھلا گیا اور تنظیم حقوق انسانی کے بندر ترکی میں جمع ہوگئے، پھر انہیں کے اشارے پر انقرہ میں ہم جنس پرستوں کا سب سے بڑا احتجاجی جلوس نکالا گیا (اس احتجاج کی تصویریں بھی اس سال یہ کہہ کر خوب اچھالی گئیں کہ اردوغان کی حمایت میں ہم جنس پرست سڑکوں پر اتر آئے) اس سے قبل ۲۰۰۳ء میں بھی ایک مرتبہ استنبول کی سڑکوں پر ہم جنس پرستوں نے جلوس نکالا تھا، چونکہ اس وقت تک میڈیا اور فوج کی لگام ڈھیلی تھی اس لئے آق پارٹی پر زبردست دباؤ ڈالا گیا لیکن جب آق پارٹی پر اسکا کوئی اثر نہیں ہوا تو اپوزیشن پارٹیوں نے مل کر ۲۰۱۳ء میں ہم جنس پرستوں کے حقوق کے سلسلہ میں پارلیمنٹ کے سامنے ایک تجویز پیش کی جسے آق پارٹی نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ ہم جنس پرستی معاشرے کے لئے

خطرناک ہے اور بہت سی وباؤں کا پیش خیمہ بھی۔ بطور دلیل یورپی ڈاکٹروں کے تجربات بھی سامنے رکھے گئے، لیکن کمالسٹ پارٹی کے صدر نے جواباً کہا کہ امریکی تحقیق کے مطابق کالے لوگ گوروں کی برابری نہیں کر پاتے، لہذا آپ یہ کہنے کے مجاز نہیں اور اُنکے سائنس داں قابلِ قبول نہیں، میڈیا نے بھی خوب ہنگامہ برپا کیا اور آق پارٹی سخت آزمائش میں پڑ گئی، انھیں دِنوں ترک مقنّنہ کی طرف سے آق پارٹی کے لیڈروں کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ بھی رچا جارہا تھا اور ججوں نے فرضی اسکینڈل بنا کر میڈیا کے ذریعہ پوری دنیا میں انہیں بدنام کرنے کی تمام تر کوششیں کرڈالیں، یہ سب ہوتا رہا لیکن اُس وقت کسی کے منہ سے اُف تک کی آواز سنائی نہیں پڑی کہ ہم جنس پرستوں کے حقوق کیوں مانگے جارہے ہیں اور آق پارٹی کو مجبور کیوں کیا جارہا ہے؟. اس کے راستے کیوں تنگ کئے جارہے ہیں؟.

بہر کیف..! ملکی اور غیر ملکی دباؤ ڈال کر ایک قانون پاس کروایا گیا جس کے تحت پینل کوڈ، میڈیا ریگیولیشین اور ملیٹری لاء میں توسیع کی گئی لیکن اس کے باوجود آق پارٹی نے ایسی شقیں بہت پہلے سے پیدا کرنا شروع کردی تھیں جسکی وجہ سے ۲۰۱۰ء سے ۲۰۴۱ء تک ہم جنس پرستی میں 66% تک کمی آئی،. جب ترکی میں ہر طرح کی ہم جنس پرستی قانونی حیثیت کی حامل تھی تب مخالفین کا یہ گروپ نیندیں مار رہا تھا لیکن اب ان کی نیندیں حرام ہوگئی ہیں حالانکہ آق پارٹی نے جو شقیں پیدا کی تھیں اُن کی وجہ سے ایک اقسم کی ہم جنس پرستیوں پر پابندی عائد ہوگئی..

1) Same-sex sexual activity legal (Since 1858)

2) Equal age of consent (Since 1858)

3) Right to change legal gender (Since 1988)

مندرجہ بالا تین چیزیں تو آق پارٹی اب تک ختم نہ کرسکی لیکن مختلف شقوں کے ذریعہ اس فعلِ شنیع میں کمی پیدا کی ہے، ہم جنسم پرستوں کے جن حقوق کی بات کی جارہی ہے اُسے مقنّنہ اور پارلیمینٹ سے منظور کرانے والے کمالسٹ لیڈران، قوم پرست اور کردش پارٹی اور انسانی حقوق کی وہ ناپاک جماعت تھی جس کے خلاف آج تک کسی نے آواز نہیں اُٹھائی بلکہ اب تو شیخِ حرم خود امریکہ کو نجاتِ دہندہ کہہ رہے ہیں مزید اسی تنظیم حقوقِ انسانی کی تعریفیں کررہے ہیں جس نے ۲۰۰۸ء سے لیکر ۲۰۱۲ء تک ترکی کو سر پر اُٹھا رکھا تھا کہ یہاں ہم جنس پرست محفوظ نہیں ہیں جبکہ عراق، افغان، شام اور فلسطین میں لاکھوں معصوموں کا قتلِ عام انہیں نظر نہیں آتا، آق پارٹی کسی بھی طرح اتنے سارے لوگوں سے دشمنی مول لینے کی متحمل تھی ہی نہیں، یورپ سے لیکر امریکہ تک نے ناک میں دم کر رکھا تھا، اندرونی دباؤ اپنی جگہ، لہذا کمالسٹ گروپ کی جانب سے پیش کردہ تجویز کو کچھ حذف واضافے کے ساتھ مرتب کیا گیا اور پھر سب نے مل کر اُسے منظور کروایا، اس کی رپورٹ انٹرنیٹ پر آسانی سے دستیاب ہوجائے گی۔

اُن تصویروں کے سلسلہ میں بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی ایک اسلام پسند نے بھی ہم جنس پرستوں کی ریلی میں اُنکا ساتھ نہیں دیا، وہ ساری تصویریں اڈٹیڈ ہیں جس میں اسلام پسند نظر آرہے ہیں اور دھیرے دھیرے الحمدللہ ہم نے اصل تصویریں کھوج نکالی ہیں، بقیہ وہ دسیوں تصویریں جن میں ہم جنس پرست پریڈ کرتے نظر آرہے ہیں وہ سب مختلف موقعوں کی ہیں، مثلاً استنبول استقلال سڑک کی ۲۰۰۳، ۲۰۰۸ اور ۲۹ مئی ۲۰۱۲ کی اور انقرہ ۲۰۱۲ کی ہیں جس وقت ہم جنس پرست اپنے حقوق کی آواز بلند کر رہے تھے، اسی طرح استنبول کے تقسیم چوراہے پر ۲۰۱۳ میں احتجاج کیا گیا، حدتو یہ ہے کہ ان بے چاروں نے ترکی کی مخالفت میں برازیل کی وہ تصویر بھی ڈال دی جو ۱۶ نومبر ۲۰۱۴ کے عالمی

شہرت یافتہ ہم جنس پرستوں کے جلوس کے موقعوں پر لی گئی تھیں، مجھے نہیں معلوم کہ ان لوگوں نے یہ سب جان بوجھ کر کیا ہے یا مصری اخبارات کی بھول بھلّیوں کا صدقہ ہے۔ دراصل جب ترک حکومت نے شقیں پیدا کیں جس کے سبب انہیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تو بغیر اجازت کے جلوس نکالا گیا جس کے بارے میں واضح خبریں موجود ہیں کہ ۲۰۱۶ ہی میں اس طرح کے ہم جنس پرستوں کے جلوس پر پابندی عائد کردی گئی تھی جس میں وہ ہم جنس پرستی کا کھلے عام پرچار کرتے ہوں چونکہ ترکی میں سیکس ایڈورٹائیزنگ یا اُسکے لئے کسی کو اُبھارنا دفعہ ۲۲۷ کی شقوں کے تحت قانوناً جرم ہے، جبکہ ترکی کے بہت سے شہروں میں مقامی لوگوں نے تین سال قبل ہی اس طرح کے جلوسوں پر پابندی عائد کروادی ہے، جسے یورپ کے اکثر بڑے اخباروں نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے

"The Istanbul Pride parade is not supported by the government and is organized without permission from the municipality. In 2016 the pride got banned by the local authorities."

ترکی میں اب تک ہم جنس پرستوں کے جتنے بھی جلوس نکالے گئے اُسے کندھا دینے والے کمالسٹ اور کردش رہنما ہیں۔ مزید ان حضرات کے سارا یورپ شامل ہوتا رہا، میں قارئین سے بس اتنا کہنا چاہونگا کہ انٹرنیٹ پر LGBT pride 2018 in Turkey لکھ کر ساری حقیقتیں خود جان لیں کہ ترکی میں اس سال کیا ہوا، آپ کو حیرت ہوگی اس ٹولے کی منافقت پر۔

☆☆☆

......(**بقیہ صفحہ نمبر ۵۳ کا**)

لیکن رجب طیب اردوغان نے اس پر زبردست قانون نافذ کیا جسکی وجہ سے اس پیشہ کو اپنانے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہوئی، چونکہ اب جسم فرشوں کو لائسنس لینا پڑتا ہے اور ہر مہینے اپنی جانچ کرانی پڑتی ہے مزید ماہواری کے دنوں میں اس کام سے باز رہنا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ سارے قوانین وہی عورتیں برداشت کرسکتی ہیں جن کی فطرت ہی مسخ ہوچکی ہو، چونکہ پہلے وہ جسم فروشی کے ساتھ عام عورتوں میں بھی اُٹھ بیٹھ سکتی تھیں لیکن اب یہ ایک الگ مخلوق شمار کی جاتی ہیں، پہلے یہ کام بغیر کسی مشکل کے ڈھڑلے سے ہوتا تھا تب کسی صاحبِ دل نے افسوس نہیں کیا، اسی طرح جب اسے محدود کرنے کے لئے قوانین بنائے گئے تب بھی کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن اس مرتبہ رجب طیب اردوغان کی فتح پر بوکھلاہٹ کے سبب اس قانون کو خوب اچھالا گیا حالانکہ اردوغان کے اس قانون کے بعد ترکی میں جسم فروشی جیسے قبیح فعل میں کافی کمی ہوئی، بلکہ بڑے بڑے شہروں میں لائسنس جاری کرنا ہی بند کردیا گیا ہے، مزید یہ کہ اس قانون کے تحت جسم فروشی کو فروغ دینے والوں کے لئے چار سال تک کی سزا بھی مقرر کی گئی ہے، یعنی اگر پورن ایڈورٹائیزنگ یا Play Boy جیسے سنیٹر چلائے جائیں یا نجی طور پر اسے فروغ دینے کے اقدامات کئے جائیں تو اُس پر سخت کاروائی کا قانون پاس کیا گیا، مزید یہ کہ اگر کوئی شخص ترکی میں اس مقصد سے آتا ہے تو اُسکا پاسپورٹ کبھی بھی ترکی میں قابلِ قبول نہیں ہوگا، ظاہر ہے رجب اردوغان کو یہ حق تھا ہی نہیں کہ وہ ترکی کے دستور میں جسم فروشی کو گناہ قرار دے دیں، چونکہ ایسا کرتے ہی وہ موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے اور اسلام پسند پھر ایک مرتبہ دبا دیئے جاتے اور ترکی میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے لئے جو کچھ بھی ہورہا ہے یک لخت ختم ہوجاتا، لہذا رجب طیب اردوغان نے سب سے پہلے اسلام دشمن پولیس اور پھر عدلیہ کو سبق سکھایا اور آخیر میں میڈیا اور فوج کی ناک میں رسی ڈال کر ریفرینڈم کروادیا، اب اُمید کی جاتی ہے کہ وہ دستور میں مناسب ترمیم بھی کرسکیں گے! ۔ان شاءاللہ

☆☆☆

□گوشۂ ترکی

ترکی میں جسم فروشی
پروپیگنڈہ اور حقائق

شیخ اسماعیل کرخی ندوی

ترکی میں اردوغان کی فتح کولیکر ایک طبقہ اتنا زیادہ پریشان ہے کہ اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے کہ وہ بوکھلاہٹ میں کیا کیا حرکتیں کررہا ہے، اس نے بے سروپا کی باتیں، ناقابلِ برداشت الزامات، بے جا کردارکشی اور سب وشتم کا وہ طوفان مچایا کہ سوشل میڈیا بھی اپنے وجود پر افسوس کرنے لگے، لیکن انہیں شرم محسوس نہیں ہوتی، انہوں نے مصر میں جو کچھ کیا وہ تو اپنی جگہ لیکن ترکی میں انہیں منہ کی کھانی پڑی، پھر اسی کا ردِّعمل ہم سبھی کو سوشل میڈیا پر نظر آنے لگا۔

ابھی کل ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں واضح طور پر درج تھا کہ "ترک قوانین کے مطابق ملک میں جسم فروشی کو تحفظ حاصل ہے، آرٹیکل 227 کی شق نمبر 5237 کے تحت ترکی میں جسم فروشی اور فحاشی کو قانونی حیثیت حاصل ہے، ترکی میں آپ جسم فروشی کا لائسنس لے لیں تو اپنے گھر میں بھی اڈہ چلا سکتے ہیں بس حکومتی کاغذات مکمل ہونے چاہئیں، مزے کی بات یہ ہے کہ یہ قانون ہمارے صلاح الدین ایوبی دوئم کی اے کے پارٹی نے پیش کیا اور اسمبلی سے منظور کروایا". مزید دنیا بھر کی غلاظتیں مضمون میں شامل تھیں، راقم الحروف چونکہ ترکی کے دستور سے کچھ حد تک واقف تھا چنانچہ مضمون کا وزن پتا چل گیا اور مضمون میں جس طرح سے منافقت کا ثبوت دیا گیا وہ بھی سامنے آ گیا، بہت سے احباب اس مضمون کو لیکر بڑے فکر مند تھے کہ اس کا جواب دینا چاہئے اور حقائق منظرِ عام پر آنے چاہیئے، مجھے حیرت ہے ایسے نام نہاد علماء پر جو صرف مسلکی تعصب کی بنا پر ایسے گھٹیا گھٹیا مضامین عام کررہے ہیں، مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ یہ مضمون جو آج کل اردو زبان میں گردش کررہا ہے سب سے پہلے انگریزی زبان میں almezmaah.com نے جنوری میں شائع کیا تھا، لیکن تب اسکی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی لیکن اب اس سلسلہ میں راقم چند باتیں ترکی قوانین کے تحت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ترکی کا دستور کمالسٹ گروپ کی دین ہے، اور اس دستور کے مطابق ہر وہ کام نہ صرف جائز قرار دیا گیا بلکہ لازم کردیا گیا جس سے اسلام کی مخالفت ہوتی ہو، اور پھر اس دستور کی حفاظت اسلام دشمن فوج کے سپرد کی گئی، عدلیہ کو یہ حق دیا گیا کہ ہر اسلام پسند یا بنیاد پرست سیاسی رہنما کو سیاست سے دور رکھے اور اگر وہ حکومت بنانے میں کامیاب ہوجائے تو ایسی حکومت کا خاتمہ فوج کے ذمہ تھا، چنانچہ عدنان مندریس سے لیکر نجم الدین اربکان تک تمام سیاسی قائدین اسی کی نذر ہوتے چلے گئے، جب رجب طیب اردوغان ترکی پر حکمراں ہوئے تو اُنہوں نے ماضی سے سبق لیتے ہوئے دستور کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کی بلکہ دستور میں شقیں پیدا کرنی شروع کیں، مثلاً مساجد کو سرکاری تحویل میں لیتے ہوئے لاکھوں مسجدیں آباد کردیں، اسکا رف کے سلسلہ میں کہا کہ یہ ذاتی معاملہ ہے جو چاہے استعمال کرے جو چاہے ترک کرے، اسکا صاف مطلب

تھا کہ اسکا رف کے استعمال سے پابندی ختم کردی گئی ہے، اور اسکا نتیجہ ہمارے سامنے ہے، اسی طرح شراب پر بھاری بھرکم ٹیکس عائد کردیا اور مخالفت کی صورت میں کہا کہ چونکہ ہم ترک مریضوں کا مفت علاج اس لئے کرتے ہیں کہ ترک عوام سے ٹیکس لیتے ہیں لیکن اسکا فائدہ شرابی اُٹھاتے ہیں چونکہ شرابی ہی خطرناک بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں لہذا ہم ترک عوام کا روپیہ شرابیوں پر خرچ نہیں کرنا چاہتے، مزید قانون میں شقیں پیدا کیں کہ اسکول، ہسپتال اور مذہبی اداروں کے آس پاس شراب کی دکانیں نہیں کھولی جاسکتیں جس کا اثر یہ ہوا کہ دور دور تک شراب خانے بند ہوگئے اور بڑی بڑی کمپنیوں کی کمر ٹوٹ گئی، اور ایسے کئی مسائل تھے جن میں ایک مسئلہ جسم فروشی کا بھی تھا۔

ترکی ۲۰۰۲ سے قبل اس گندگی میں آخری حد تک ملوث تھا، عورتوں میں جسم فروشی کی وبا عام تھی بلکہ نئی نسل کی لڑکیاں اسے فیشن سمجھا کرتی تھیں، ایک صاحب کئی دہائیوں سے ترکی میں رہتے ہیں اُنہوں نے بتایا کہ آج سے ۲۰-۲۵ سال پہلے ترکی کے اسلام دشمن اور لبرل طبقے سے تعلق رکھنے والی اعلی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہر اتوار کو لال جیکٹ پہن کر سڑکوں پر نکل جاتیں جسکا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آج کا دن وہ کسی مرد کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں، اسی طرح ارضِ موعود شہر استنبول (قسطنطنیہ) فحاشی کا اڈہ بنا ہوا تھا، لیکن اب بہت زیادہ اصلاح ہوچکی ہے بلکہ انقرہ اور بُسرہ جیسے بڑے بڑے شہروں میں جسم فروشی پر عدالت کے حکم سے پابندی عائد ہے، اسی طرح استنبول میں سب سے بڑے اڈہ کو منہدم کرکے عثمانی یادگار کی تعمیر جاری ہے، جبکہ لال جیکٹ والی روایت کا خاتمہ ہوچکا ہے۔

یہ ساری باتیں جاننے کے بعد اب ذرا اُس مضمون کی طرف آئیں جو ہمارا اصل موضوع ہے، دراصل ترک دستور دفعہ 227 کے آٹھ نکات بنائے گئے ہیں، جن میں سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کسی نابالغ بچے یا بچی کو جسم فروشی کی دعوت دے گا، یا اس کام میں اُسکی مدد کرے گا، یا اُسے ورغلائے گا تو اُسے چار سے دس سال تک کی سزا ہوسکتی ہے، دوسرے نکتہ کے تحت جو شخص کسی بالغ شخص کو جسم فروشی کے لئے تیار کرے گا، یا حوصلہ افزائی کرے گا، یا اُسے اس کام کے لئے مجبور کرے گا یا پھر اُسے ماحول فراہم کرے گا تو اُسے دو سے چار سال کی سزا ہوسکتی ہے، تیسرا نکتہ طویل ہے لہذا یہاں صرف اُس کا حوالہ درج کیا جاتا ہے:

(Abolished on 6/12/2006 - By Article 45 of the Law no. 5560)

چوتھے نکتہ کے مطابق نافذ ہونے والے جرم کو ایک نصف سے دو تہوں میں بڑھایا جائے گا جہاں کسی شخص کے فتنہ کے اعمال میں مشغول کرنے کے لئے حوصلہ افزائی کی جاے، یا اس عمل پر مجبور کرنے کے کے لئے تشدد، دھوکہ، یا ہراساں کیا جاتا ہو، (یاد رہے اس شق کے بعد ترکی میں لڑکیوں کی اسمگلنگ بالکل بند ہوگئی)

پانچویں نکتہ کے مطابق اگر کسی شخص کو اُسکے سرپرست اس کام (جسم فروشی) پر مجبور کرتے ہیں تو سرپرستوں کے لئے سزا ایک نصف سے زائد بڑھادی جاے گی۔

شق نمبر چھے کے تحت اگر یہ کام کسی تنظیم کے ذریعہ انجام پاتا ہے تو اُسکی سزا بھی ایک نصف سے زائد بڑھادی جاے گی۔

ساتویں نکتے کی رو سے ان جرائم کے ارتکاب میں سرکاری اداروں کی شمولیت پر سیکورٹی اقدامات کئے جائیں گے۔

آٹھویں نکتے میں کہا گیا ہے کہ جس کسی شخص کو جسم فروشی پر مجبور کیا گیا ہو اُسکی طبی جانچ کرائی جاسکتی ہے۔

آپ ان نکات کو ذہن میں رکھیں اور اب دفعہ 227 کی شق نمبر 5237 پر بھی غور کریں۔

یاد رہے ترکی میں دفعہ 227 کے تحت قانونی طور پر جسم فروشی جائز ہے، اور یہ قانون کمالسٹ گروپ نے بنایا تھا، جسے اُس وقت تک بدلنا ناممکن ہے جب تک دستور نہ بدلا جاے اور دستور کی حفاظت ترک فوج (اسلام دشمن) کے ذمہ ہے، رجب اردوغان سے قبل جسم فروشی کے لئے بس اتنا کافی تھا کہ خواہشمند کی عمر ۱۸ سال سے زائد ہو،..... (**بقیہ صفحہ نمبر ۵۱ پر**)

گوشۂ ترکی

ترکی کا نمونہ اور ہندوستانی مسلمان؟

محمد فرید حبیب ندوی

ابھی چند ہفتوں پہلے ترکی میں انتخابات ہوئے۔ اس الیکشن پر پوری دنیا کی نظریں لگی ہوئی تھی؛ ایک طرف اردوغان کے حامی تھے جو اس کی فتح کے لئے دعا ومناجات میں مشغول تھے، دوسری طرف اس کے مخالفین تھے جو ہر قیمت پر اس کی شکست دیکھنے کے متمنی تھے۔ جو اسلام پسند تھے، ان کے جذبات وخیالات اردوغان کے ساتھ تھے۔ اور جو سیکولر مزاج تھے، وہ اس کے خلاف بددعاؤں اور سازشوں میں منہمک تھے۔ بحمداللہ اردوغان کو اس میں بہترین کامیابی ملی اور ان کے مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی۔

لیکن مسئلہ صرف اس ایک الیکشن اور اس میں فتح وشکست کے مل جانے کا نہیں ہے، مسئلہ اس سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ ایک وقت تھا کہ ترکی اسلامیت کا لبادہ اتار کر مغربیت کا لباس زیب تن کر رہا تھا، وہ اسلامی مزاج کو یوروپی مزاج کی درگاہ پر بھینٹ چڑھا رہا تھا؛ لیکن آج صورت حال بالکل برعکس ہے، آج وہاں اسلام اور اسلامی مزاج ترقی پر ہے، مذہبی بندشوں کے بجائے ہر ایک کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اسلام پسند جو پہلے پابند سلاسل کردئے جاتے تھے، آج ترقی اسلام کے لیے علانیہ کوشاں رہتے ہیں۔ کوئی ان کے قدم روکنے والا نہیں، حکومت بھی اسلام اور اسلام پسندوں کی سرپرستی کر رہی ہے۔

یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے۔ ہزاروں لوگوں کی قربانیاں اور سیکڑوں کا خون شہادت ہے۔ ہمیشہ سیاسی فتح کے پیچھے ذہن سازی اور تربیت کا رول ہوتا ہے، اس کے بغیر ملی ہوئی کامیابی دیرپا نہیں ہوتی۔ اور اس پہلو سے اگر ترکی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لمبے عرصے تک وہاں کے صوفیہ وعلماء مسلم عوام کی دینی واخلاقی تربیت اور ذہن سازی کرتے رہے، اور انھوں نے ان کا رشتہ اسلام سے منقطع نہیں ہونے دیا۔ ایسے لوگوں میں شیخ سعید بیران اور بدیع الزماں سعید نورسی رحمہم اللہ اور زندہ لوگوں میں شیخ محمود افندی مدظلہم کا نام سب سے نمایاں ہے۔ یہ تینوں حضرات نقشبندی سلسلے کے شیخ ہیں، ترک عوام کو دین سے وابستہ رکھنے اور ان میں مادیت کے جراثیم نکال کر روحانیت کی پاکیزگی پیدا کرنے میں ان دونوں کے کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں بھی شیخ نورسی رحمہ اللہ کا رول سب سے نمایاں ہے۔

اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اخلاقی اور معاشی حالت بڑی دگرگوں ہے۔ ہر میدان میں وہ ادبار وانحطاط سے دوچار ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ انھیں اس دلدل سے باہر نکالنے کے لیے تگ ودو کی جائے اور ان کے بجھتے چراغ کی ٹمٹماتی لَو کو تیز کیا جائے۔ اس کام کے لیے ہم ترکی کی اسلامی تحریک کو اپنے لیے نمونہ بنا سکتے ہیں اور ان کے مجرّب اقدامات سے فائدہ اٹھا کر ہندوستانی مسلمانوں کو ہر اعتبار سے ترقی کی راہ پر ڈال سکتے ہیں۔ مغربیت اور مادیت پرستی کی جگہ ان میں بھی روحانیت اور اسلامیت کی آبیاری۔ اور ان کے سلام سے کمزور ہوتے رشتے کو پھر سے مضبوط کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ترکی کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے چند گذارشات پیش ہیں:

۱۔ افراد سازی: ترکی کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ رہی کہ اسے شیخ نورسی اور اب شیخ محمود آفندی کی شکل میں عظیم شخصیات مل گئیں۔ شیخ نورسی سے کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے شاگردوں اور طلبہ کی ایک ایسی تعداد تیار کی، جس کے دل ودماغ میں اسلام کی محبت پیوست کردی تھی۔ شیخ نے شروع میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا تھا، مگر جلد ہی ان کا موقف

بدل گیا اور انھیں اس پر انشراح، بلکہ یقین ہو گیا کہ موجودہ دور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنی ساری توجہ افراد سازی پر لگا دی اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ سیاست سے کنارہ کشی کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ شیخ اسے شجر ممنوعہ سمجھتے تھے یا وہ اسلامی سیاست کے قائل نہ تھے؛ بلکہ ان کا نقطہ نظر یہ تھا اور بالکل بجا تھا کہ یہ وقت اس کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس وقت تو ساری توجہ اصلاح احوال پر اور مذہبی و اخلاقی تربیت پر مرکوز کرنی چاہیے، یہی وجہ تھی کہ شیخ جہاں بھی رہے، یہ کام کرتے رہے، حتی کہ جیلوں اور قید خانوں میں بھی وہ افراد سازی اور ذہن سازی کے عمل سے پیچھے نہ رہے۔ ان کی اس محنت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی میں ہی طلبہ نور کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ شیخ کی وفات کے بعد یہ کارواں رکا نہیں؛ بلکہ شیخ محمود آفندی جیسے دیگر حضرات کی قیادت میں ابھی بھی دینی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ شیخ آفندی کے مریدین کی تعداد کئی ملین بتائی جاتی ہے۔ موصوف جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں اسلامی بیداری کا یہ حال ہے کہ دیکھنے والے اسے اولین اسلامی دور کا کوئی خطہ سمجھتے ہیں۔

اس لیے ہندوستان میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ افراد سازی کے عمل پر توجہ دی جائے۔ جس طرح ہماری محنت دیگر چیزوں پر صرف ہو رہی ہے، ضرورت ہے کہ اس میں اس کارِ عظیم کو اولیت و فوقیت دی جائے، اور ایک منصوبہ بند طریقے سے اس عمل کا آغاز ہو۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مدارس و دینی ادارے بھی تو افراد سازی کا ہی کام کرتے ہیں، یہ سوال فی نفسہ درست ہے، لیکن اگر ہم مدارس کی موجودہ صورت حال پر غور کریں تو شیخ نورسی کے تیار کیے ہوئے طلبہ اور مدارس کے فارغ طلبہ کے درمیان بعد المشرقین پائیں گے، مدارس سے ہر سال ایک بڑی تعداد فارغ ہوتی ہے اور یقیناً یہ ایک عظیم کام ہے، لیکن جن مخلصین اور اسلام کا درد رکھنے والے طلبہ کی ضرورت ہے وہ ان مدارس سے نہیں نکل رہے ہیں، یا ان کی تعداد بہت کم ہے۔

شیخ نورسی کے طلبہ اور مدارس کے فارغ طلبہ میں یہ جو فرق ہے، اس کی ایک بنیادی اور بڑی وجہ یہ ہے کہ شیخ نورسی روحانیت کے عظیم مقام پر تھے، وہ طلبہ کے تزکیے اور تربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ ان کا عظیم مقام ہی تھا کہ انھیں بدیع الزماں کا لقب دیا گیا، اس کے برعکس آج مدارس کے طلبہ تزکیہ کے عمل سے نہیں گزرتے اور وہ اپنے دل کی انگیٹھی گرم کیے بغیر ہی حصول علم سے فارغ ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک بہت بڑا خلا ہے، جسے پُر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں راقم کا خیال ہے کہ ہندوستان میں پھر سے عملِ تزکیہ کے احیاء کی ضرورت ہے، اور ذہن میں رہے کہ یہ رسمی خانقاہوں کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ ان کی تعداد تو آج بھی اچھی خاصی ہے؛ بلکہ ضرورت ایسی خانقاہوں کی ہے جو حقیقت میں لوگوں کے دلوں میں حمیت و غیرت دینی اور محبت خدا و رسول کے چراغ جلا دیں۔ جو ان کا رخ مادیت سے روحانیت کی طرف پھیر دیں۔ مختصر لفظوں میں شیخ معین الدین چشتی کے کردار کی پھر ضرورت ہے۔

شیخ نورسی کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے اپنے طلبہ میں مادیت کی گندگی نکال کر روحانیت کی پاکیزگی بھر دی تھی۔ ان کے قلوب سے دنیا کی محبت نکال کر ان میں آخرت اور دین کی محبت جاگزیں کر دی تھی۔ اس کام کی ہمارے ملک میں بھی ضرورت ہے۔

۲۔ اسلامک ہوسٹلز اور جامعات کے طلبہ کی اسلامی تربیت: ترکی میں ایک اہم کام یہ کیا گیا تھا کہ جگہ جگہ اسلامک ہوسٹلز قائم کر دیے گئے تھے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو طلبہ عصری اداروں میں تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کے لیے کرایے کے طور پر ایسے ہاسٹل تیار کیے گئے جن میں انھیں بتدریج اسلام سے واقف کرایا جاتا، ان کی ذہن سازی کی جاتی اور ان کے اندر اسلام کی محبت پیوست کی جاتی۔ جو طلبہ ان ہاسٹلز میں چند سال رہ کر باہر نکلتے وہ اسلام کی محبت اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ اس طریقۂ عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ عصری اداروں میں پڑھنے والے طلبہ کے قلوب میں بھی اسلام اور اسلام پسندوں کی محبت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ اسلام کے بہترین نمائندے ثابت ہوتے تھے۔

ہندوستان میں بھی اس طریقۂ عمل کو اختیار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ یہاں کی جو تعلیمی صورت حال ہے، وہ یہ ہے کہ عصری اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبہ (الا ما شاء اللہ) اسلام اور اسلامی تعلیمات سے بدظن ہوتے ہیں، انھیں اس کی حقانیت اور ابدیت پر پورا یقین نہیں ہوتا۔ یوں تو بہت سے نماز روزے کے بھی پابند ہوتے ہیں؛ لیکن ان کے قلوب محبت اسلامی

سے اس طرح سرشار نہیں ہوتے، جیسے ہونے چاہئیں۔ اس صورت حال میں اسلامک ہوسٹلز کے قیام کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے، پھر اگر یہ بات بھی سامنے رہے تو یہ ضرورت اشد ترین ہوجاتی ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبہ میں ۹۵ فیصد عصری اداروں میں زیر تعلیم ہیں، اور محض ۵ فیصد ہی دینی مدارس کا رخ کرتے ہیں۔ اسلامک ہوسٹلز کا قیام ایک دیرینہ خواب ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی بھی یہ خواب دیکھا کرتے تھے۔ سنا ہے کہ اب بعض علاقوں میں یہ پیش رفت شروع ہوگئی۔ خدا کرے یہ کام ترقی کرے۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی عصری علوم کی تحصیل کرنے والے طلبہ کی اسلامی تربیت اور ذہن سازی پر توجہ دینی چاہیے۔

۳۔ **اعلی عصری تعلیم کی تحصیل**: ترکی کے اسلام پسندوں نے ایک کام یہ کیا کہ اعلیٰ عصری تعلیم کے حصول پر توجہ دی۔ یہ تو گذر چکا ہے کہ ایسے طلبہ کے لیے ترکی کے انقلابی قائدین (شیخ نورسی وغیرہ) نے اسلامی تربیت اور اسلامک ہوسٹلز کا طریقہ ایجاد کر رکھا تھا۔ اب جب ان طلبہ کی ذہنی تربیت ہوجاتی اور ساتھ ہی وہ اعلی ڈگریاں حاصل کر لیتے تو انھیں اعلی مناصب تک پہنچا دیا جاتا۔ اس طرح جو طلبہ اعلیٰ مناصب تک پہنچے، وہ پختہ اسلامی تربیت حاصل کیے ہوئے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے اپنے عہدے اور مقام پر رہتے ہوئے اسلام کی بہترین خدمت کی۔

اس میں کیا شک ہے کہ اس وقت عصری تعلیم کا حصول ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن افسوس کہ ابھی تک مسلمان اس کی طرف سے غافل ہیں۔ وہ یا تو تعلیم حاصل ہی نہیں کرتے، اور اگر کرتے بھی ہیں تو بس ملازمت ملنے کے لیے جتنی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے اور جس سے معاش کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے، اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ وہ کسی میدان میں ٹاپ پر پہنچنا نہیں چاہتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ انھیں اہم مناصب سے کنارے لگا دیا گیا ہے، اس میں جتنا دوش غیروں کا ہے، اس سے کہیں زیادہ ہمارا اپنا ہے۔ اس لیے کہ جب ہم اپنی لیاقت وصلاحیت کو ثابت نہیں کریں گے اور اعلی ڈگریاں نہیں حاصل کریں گے تو اسی طرح ہمیں کنارے لگایا جاتا رہے گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے۔ اس سے کسے انکار؛ لیکن اس موقع پر میں سید حامد صاحب کا یہ قول پیش کرنا چاہوں گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”تعصب کا مسئلہ اس وقت تک ہے جب مسئلہ ۹ اور ۱۰ کا ہو، آپ خود کو ۱۲ بنا لیجیے تو کوئی آپ کو نظر انداز نہیں کر سکتا“۔

اس کے ساتھ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چندے مسلمان جو اعلیٰ عہدوں پر پہنچتے بھی ہیں، تو اسلامی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسلام کے لیے مفید بننے کی بجائے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اعلی مقام پر پہنچ کر اپنی اسلامیت پر فخر کے بجائے اس پر ندامت و شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور اسے چھپاتے پھرتے ہیں۔

اس کے برعکس جیسا کہ ہم نے عرض کیا ترکی کے مسلمان جب اعلی عہدوں پر پہنچے تو انھوں نے اپنی اسلامیت کو فراموش نہیں کیا، ان کے سینے میں اسلامی محبت موجود رہی، اور وہ اسلام کی خدمت کرتے رہے۔

۴۔ **مکاتب کا قیام**: ترکی میں مدارس ائمہ وخطباء کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم کیا گیا تھا، جس نے ترکوں کی دینی تربیت میں اہم رول ادا کیا۔ ہندوستان میں بھی اس طرز کے دینی مکاتب ومدارس کے قیام کی سخت ضرورت ہے۔ الحمدللہ یہ سلسلہ قائم ہے اور اس کی تعداد روز افزوں ہے؛ لیکن پھر بھی ان کی اہمیت کے پیش نظر ایسے اداروں، بالخصوص بنیادی عقائد ذہن نشین کرانے والے مکاتب کی ضرورت ابھی بھی باقی ہے۔ اور یہ کام ایک منظّم پروگرام کے تحت ہونا چاہیے۔ بعض حضرات نے منظّم انداز میں یہ کام شروع کر بھی دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔

بہرحال ترکی یہاں تک جو پہنچا ہے، وہ ایک منصوبہ بند پلاننگ کا نتیجہ ہے، آہستہ آہستہ وہاں اسلام کے پودے کی آبیاری کی جاتی رہی اور اب وہ تناور درخت بننے کے قریب ہے۔ اس میں شیخ نورسی، شیخ سعید بیران، عدنان مندریس اور نجم الدین اربکان جیسے سیکڑوں لوگوں کی کوششوں کا حصہ ہے اور اب ان حضرات کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر محترم رجب طیب اردوغان اسلامی قلعہ تعمیر کرنے میں مشغول ہیں، اور اس تعمیر میں ان کا اخلاص، ان کی سیاسی بصیرت اور دانشمندی خوب نمایاں ہوکر سامنے آئی ہے۔ وہ اس وقت امت مسلمہ کا دھڑکتا ہوا دل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور ان سے اور زیادہ کام لے۔ ترکی کی اس پیش رفت میں ان کے کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

□گوشۂ ترکی

ترکی میں موجودہ تبدیلی کے اسباب

ابوطالب ندوی

یہ صداقت مبنی برحقیقت ہے کہ دنیا میں عروج وزوال کا چکر گھومتا ہے۔تبدیلی عمل کے سبب سے آتی ہے۔یہ نتیجہ اس بات کا ہے کہ کچھ خاص خوبیوں کی بنیاد پر اوج فلک پر پڑاؤ ڈالے جاسکتے ہیں تو بسا اوقات کچھ وجوہات اور ذیلی کمیاں، کوتاہیاں تحت الثریٰ میں لے آتی ہیں۔یہ اتار چڑھاؤ ''ترکی'' میں بھی نظر آتا ہے۔ترکی یہ وہی ملک ہے جو کبھی سلطنت عثمانیہ کے نام سے اپنا پرچم لہرا چکا ہے۔ خریطۂ عالم میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ وقت میں ترکی دو براعظموں ایشیا اور یورپ میں پھیلا ہوا ہے۔دسویں صدی ہجری کی ابتدا میں سلطنت عثمانیہ خلافت کے منصب جلیلہ پر قابض تھی۔دنیا کا بڑا رقبہ ان کے کنٹرول میں تھا۔تاریخ نویسوں کے ہزاروں صفحات گواہ ہیں کہ ۶ر صدیوں تک ۴۰ر لاکھ مربع میل کے وسیع وعریض علاقہ پر اس نے اپنا جھنڈا لہرایا ہے۔اس سلطنت کی سطوت وشوکت، حکومت کی قوت وقدرت لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔قائد کی سیادت وقیادت بے لوث تھی۔نظام حکمرانی بے عیب تھا۔عدل و انصاف اور امن وامان کا دور دورہ تھا۔اس کے سائے تلے عربی، ایرانی، کُردی نوع بنوع اقوام وملل سے تعلق رکھنے والے پرسکون زندگی بسر کررہے تھے۔پوری دنیا میں اس کا ڈنکا بجتا تھا، ہر چہار جانب اس کا طوطی بولتا تھا۔حسد کی نگاہ سے اس ملک کو دیکھا گیا تو وہیں طمع کی نظر سے بھی تاڑا گیا۔

مفکر اسلام سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس مملکت کی مسلمہ حیثیت پر حقیقت پسندانہ تبصرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''تمام عرب ممالک اس کے ماتحت تھے۔حرم ومقامات مقدسہ کے پاسبان ومتولی ہونے، خلافت اسلامی کے حامل وامین، ایک بڑی طاقت اور شہنشاہی کی حیثیت سے بھی، مغرب اور مخالف اسلام کی طاقتوں کی نگاہ میں اسلامی طاقت کا نشان اور بہت سے اسلامی مفادات کا محافظ وپاسبان ہونے کی بنا پر بھی تمام دنیا کے مسلمان اس کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔اور وہاں پیش آنے والے واقعات سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے، بلکہ اثر بھی لیتے تھے۔''

تاریخ میں جس طرح اس کی عظمت کا ذکر ہے اسی طرح نکبت و پستی کا بھی چرچا ہے۔صفحۂ ارضی کی تاریخ میں اسباب وعلل حرف بہ حرف محفوظ ہیں۔مطالعہ کرنے والے کرتے ہیں۔بات کرنے والے، دلائل کی روشنی میں چرچا کرتے ہیں۔وہ کیا اسباب وعلل تھے جس نے اس سپر پاور حکومت کو قعر مذلت میں ڈھکیل دیا۔ملکوں کی آبادی اور بربادی تخت وتاج پر متمکن افراد پر منحصر ہے۔ایک طرح سے ان کے دین وایمان کے وہی ذمہ دار وٹھیکے دار ہوتے ہیں۔ الناس علی دین ملوکھم کے تحت ایوان کا دین ہی عوام کا دین ہوتا ہے۔سلطنت کے زوال کا آغاز اسی دن شروع ہو چکا تھا جب کہ حکومتیں اپنی ذمہ داری سے دستبردار ہوگئی تھیں، انصاف کا قتل کھلے آنکھوں عدالتوں میں ہونے لگا تھا۔افسر شاہی کے راگ الاپے جانے لگے تھے۔حکومت کے کارندے عیاشی وفحاشی میں مبتلا ہوگئے تھے۔جس سے ملکوں کے ملک قرضوں کے بوجھ میں دب گئے۔اسی طرح تہذیبی، ثقافتی، لسانی تعصب اور ایک کی دوسرے پر

فضیلت و برتری کی ہوائیں چلنی شروع ہوئیں ۔پھر پے بہ پے برائیاں کی جانے لگیں۔ پہلے اللہ کے احکام ٹوٹے ، پھر اللہ کے رسولؐ کے فرامین کی دھجیاں اڑائی گئیں۔مسند احمد میں حضرت رسول پاک ﷺ سے ایک ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اسلام کی سب کڑیاں یکے بعد دیگرے ٹوٹیں گی۔ جب بھی کوئی کڑی ٹوٹے گی تو لوگ بعد والی کڑی سے چمٹنے لگیں گے۔سب سے پہلے جو کڑی ٹوٹے گی وہ اسلام کا نظام حکومت وعدالت ہوگا،سب سے آخر میں نماز ہوگی۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ آپ ﷺ کے یہ فرامین بجا طور پر پورے ہوئے ۔اللہ کے احکام کی پامالی سے انقلاب نہیں بلکہ عذاب آیا کرتا ہے۔

سلطنت عثمانیہ کے سقوط اور زوال کے وجوہات کو موٹے طور پر مندرجہ ذیل نقاط میں قلمبند کر سکتے ہیں:

☆ بیرونی وغیر ملکی قرضوں کا بھاری بوجھ ہونا
☆عدالتوں کا نظام عدل وانصاف کا بگڑنا
☆مسالک ومذاہب کے جھگڑے
☆علاقائیت ولسانیت،عصبیت وقوم پرستی کا ناسور
☆مالی بدعنوانی اور رشوت خوری کا بڑھتا ہوا سیلاب
☆اندرونی خانہ جنگی اور صوبائی امور میں بدانتظامی اور خلفشار
☆فلسطین اور ارض مقدسہ میں یہودی ریاست کی اسکیم
☆ پہلی جنگ عظیم میں سلطنت کی ہار
☆ضمیر فروشوں اور غداروں کا اعلیٰ منصبوں پر فائز ہونا

یہ وہ عیوب ونقائص ہیں جس نے حکومت کا چراغ گل کر دیا۔ اس کی بہت سی مثالیں عہد عثمانی کی تاریخ میں مل جائیں گی ۔خلیفہ عبدالحمید ثانی کے وقت ایک یہودی وفد آیا اور کہا: خلیفہ! اگر آپ فلسطین میں یہودی ریاست کو منظوری دے دیں تو آپ کا سارا قرضہ اتار دیں گے،مزید برآں ہم آپ کو مالا مال بھی کر دیں گے۔ سلطان نے ایمانی جوش وحرارت میں آکر ایک تاریخی جملہ کہا۔''اگر اپنی ساری دولت دے کر تم لوگ ارض فلسطین کی ذرا سی مٹی بھی مانگو گے تو ہم تمہیں نہیں دیں گے۔''اس سے ان کی کمزوری اور بے بسی کے نتائج اخذ کئے جائیں یا بہادری کے۔لیکن اتنی بات تو ہے کہ اس ایوان وحکومت سے آنکھیں چار کرنے کی سکت دوسری حکومتوں میں آگئی تھیں۔عوامی امور ومصالح پس پشت ڈالے جاتے رہے۔ بے جانخوت کی نحوست ہی تو تھی کہ اس سلطنت کا جنگی مقابلہ روس سے ہوا،اور روس کامیاب ہوا۔اس نے بہت ہی اہانت آمیز شرطیں رکھ دیں۔جس شہنشاہی کی رِفعت و بلندی دلوں میں ثبت تھی، اس کا بھرم قائم نہیں رہا۔اس ذلت کو کب یہ حکومت گوارا کر سکتی تھی؟؟۔ اس کی غیرت جوش میں آئی اور شکست وریخت،شجاعت و بہادری کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ایک بار اور آمادۂ جنگ ہوئے،اب فتح و ظفر نے بڑھ کر استقبال کیا۔ دن بدلتے دیر نہیں لگتی ہے۔دنیا کے لال بجکڑوں کا کیا گلہ کروں؟ جب اپنے ہی نادان و بے سروسامان ہیں ۔ وہ علاقائیت و وطنیت کی بندش میں جکڑ گئے ۔لسانیت و قومیت کے پابند بن گئے ۔ٹولیوں اور گروہوں کی شکل میں ملک و مملکت کو سمیٹ دیا۔آپس میں دست وگریباں ہو گئے ۔تف ہے ان خردمندوں کی عقلوں پر! جس نے سیاست وحکومت کا دائرہ محیط کر کے وسیع تر کرنے میں خون کی ندیاں بہادیں ۔ ہائے کیا کیا جائے؟؟؟ بالآخر اس عظیم تخت وتاج کا خاتمہ ہوگیا۔ کچھ اپنوں کی، کچھ غیروں کی بدقماشی نے سلطنت کو تاراج کر دیا۔دنیا سے خلافت کا جنازہ نکل گیا۔ بادشاہت وملوکیت کا چوغہ اتر گیا۔اب دنیا نے اس کی جگہ جمہوریت کا لبادہ اوڑھا۔دنیا کے زیادہ تر ممالک جمہوری ہو گئے۔

1923ء میں ترکی بھی ایک جمہوری ملک بن گیا۔ جمہورت کے قوانین کا نفاذ اس دیش میں ہوا۔لیکن زمانے تک خاموشی کا عالم طاری رہا۔تونگر وتوانا اور مالدار وساہوکار حکومت کے پس پردہ اپنی روٹیاں سیکتے رہے۔سیاست کے بدلے ہوئے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔طرز حکومت وہی رہا،صرف نام بدلے'' بادشاہت سے جمہوریت کی طرف''۔نعرے الگ ہو گئے''جمہوری ملک''۔یہی وہ ترکی ہے جس کی فرمانروائی''کمال اتاترک''جیسے لیڈر کے ہاتھ میں آئی تو وہ ڈکٹیٹر بن گیا۔انہوں نے مظالم کے پہاڑ ملک کے شریف باسیوں پر توڑے۔ گن گن کر اور چن چن کر مذہبی اور دینی شعار کے

حاملین کو قتل کیا۔ گولیوں سے عالموں اور صوفیوں کو بھنوا دیا۔ بارود و بم کے آکاش سے باتیں کرتے دھوئیں ان کی درندگیت کی نشانی بتاتے اور سفا کی کی کہانی سناتے ہیں۔ توپ کے گولے برسائے جس پر بے کفن دفن لاش و نعش نشانِ عبرت بن گئیں۔ ظلم و استبداد کا اک باب اور رقم ہو گیا۔ کہا جائے تو ماضی کا ترکی بہت المناک بھی ہے اور تابناک بھی۔ سچی بات ہے کہ موجودہ ترکی نے ماضی کی اندوہنا کی اور المناکی سے سبق لیا اور اپنی درخشاں و تاباں تاریخ کے باب سے حوصلہ کا درس بھی لیا۔

آج جمہوری طرزِ حکومت کا سکہ دنیا میں رائج ہے۔ رائج الوقت سکے کے نفع و نقصان ہم سب پر عیاں ہیں۔ سیاست میں دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا ہے، جب کہ جمہوریت عوام کی حکومت کا نام ہے۔ میرا خیال ہے کہ جمہوریت کی سیاست کے مزاج میں رعونت اور سرکشی ہے۔ عوام کے ذریعے منتخب شخص عوام پر حکمرانی کرتا ہے۔ سربراہِ مملکت کا انتخاب ایک ایسا مسئلہ ہے جو بہت نازک بھی ہے اور اہم بھی۔ نازک اس لئے کہ یہ ایک ذمہ داری ہے جو نہایت سوجھ بوجھ سے انجام دی جاسکتی ہے۔ اور اہم اس لئے کہ سب حکومت کی اچھی کارکردگی کا یقین اور امید وابستہ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک جمہوری ملک کی طرف پوری دنیا کی نگاہیں ابھی مرکوز تھیں۔ پوری دنیا وہاں کے عوام کے فیصلہ کی منتظر تھی۔ صرف اس لئے کہ وہاں کا لیڈر اور قائد جن کا نام ''رجب طیب اردغان'' ہے۔ جو ایک سچا اور پکا مسلمان ہے۔ راست بازی جن کی پہچان ہے۔ ایفائے عہد جن کی شان ہے۔ دنیا کے کسی گوشہ و خطہ میں کرب و کراہ کی جنبش سے رگِ حمیت پھڑک اٹھتی ہے۔ وہ حدود و قیود کو لانگنے میں ذرا سی دیری نہیں کرتے۔ مملکت ترکیہ مسلمانوں کی ہمیشہ سے آماج گاہ رہی ہے۔ یہاں سے مظلوم کی آہ و بکا کی دادرسی کے لئے حق و انصاف کی صدا پر لبیک کہا جاتا رہا ہے۔ رجب طیب اردغان نے بھی اسی طرح مسلم دشمنی کی مخالفت و مدافعت میں تن، من، دھن کی بازی لگا دی ہے۔ سلگتے اور سسکتے ہوئے حالات اور بلکتے ہوئے افراد کی مزاج پرسی میں زر اصلی اور سرمایۂ حیات کی بیش بہا دولت کو پانی کی طرح خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ لعنت و ملامت اور طعنوں سے کیا ہوتا ہے؟ جب یہ حق کی عطا کردہ سوغات ہو۔ ظلم و محرومی کی خبر جب کبھی بھی کہیں کی سنتے، دفاع میں جوابی کاروائی کرتے۔ حالیہ واقعات شاہد عدل ہیں کہ روہنگیائی مسلمان جو آب و دانہ کو ترس رہے تھے۔ اپنے ہی وطن میں غریب الوطنی کی سانسیں لے رہے تھے۔ صدر رجب طیب کی بے قراری بہت بڑھ گئی، صرف اس لئے کہ پوری دنیا کا مسلمان ایک کنبہ اور خاندان ہیں۔ ایسے لمحے میں زبان حال و قال سے ترکی نے کہا:

ثبوت دیں گے وفا کا یوں اشتباہِ غلط
ملا کے خاک میں رکھ دیں گے ہر سپاہِ غلط
برب کعبہ ہم ان کی آنکھیں نکال چھوڑیں گے
اٹھی جو ملک کی جانب کوئی نگاہِ غلط

جہاں ابھی صدیوں تک بیداری نہیں آئی تھی۔ آج اسی کے نغمے زبان پر رقصاں ہیں۔ دنیا اسی ملک کو ''ترکی'' کے نام سے جانتی ہے، اور وہیں کا صدر ''رجب طیب اردغان'' ہے۔ رجب طیب نے نوجواں کو جھنجھوڑا، زمامِ اقتدار سنبھالنے کے بعد سے ملک کو اپنی بے لاگ کاوشوں سے اوجِ فلک کی بلندیوں کی طرف گامزن کیا۔ اللہ کے نظام کی رسی ہاتھ میں لی۔ ترکی روشن مستقبل کی طرف رجب کی قیادت میں بڑھ رہا ہے۔ روشن مستقبل کے یہ چمکتے ستارے ہیں۔ جن کی سربراہی میں ترکی ایک کروٹ لے رہا ہے۔

ملک ترکی تبدیلی کی ڈگر اور ٹریک پر چل پڑا ہے۔ جس کی بدولت پوری دنیا کی نگاہ ان پر ٹکی ہوئی ہے۔ سب کی نظریں ان کی پولیٹکل اور سیاسی طاقت کی طرف ہیں۔ ان کی بے باکی جگ ظاہر ہے۔ اس لئے آج پھر سے مغرب اور مخالف اسلام طاقتوں کی نگاہ میں اسلامی طاقت کا نشان اور بہت سے اسلامی مفادات کا محافظ و پاسبان بننے جا رہا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان اس کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، اور وہاں پیش آنے والے واقعات سے نہ صرف دلچسپی رکھتے ہیں، بلکہ اثر بھی لے رہے ہیں۔

اس تبدیلی کے پیچھے مندرجہ ذیل اہم اسباب ووجوہ ہیں:

عِلم کی سرپرستی اور نگہبانی نے ترکی کو رجب کی سرکردگی میں اس اعلیٰ مقام تک پہنچادیا۔نسل انسانی کی ذہن سازی کے لئے علم سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں۔فی الفوراس کی طرف توجہ مبذول کی۔حصول علم کا نظام مرتب کیا۔اچھے درس وتدریس اور اچھی تعلیم وتربیت کے لئے کلاس میں طلبا کی تعداد معین کی۔ہر شہری کی جھولی میں وطن سے محبت وانس کی بے پناہ دولت ڈال دی۔اس طرح ملک کے ہر فرد بشر کو ملک کا جانباز سپاہی بنادیا۔ملک میں مذاہب کے مابین احترام آدمیت کے پاس ولحاظ کے لئے قانون بنائے۔مذاہب کا تفوق برقرار رکھتے ہوئے حکومت کی ماتحتی میں مساوات انسانی کا پیغام عام کیا۔میزان عدل وانصاف کی کسوٹی سبھی کے لئے یکساں قائم ہے۔اپنے، غیر میں امتیاز مٹادیا۔حکومت کی باگ ڈور کو میثاق سمجھ کر عمل پیرا ہوئے ہیں۔مصلحین وقائدین اور دینی رہنما کی وساطت سے سیاسی جوڑ توڑ اور داؤ پیچ سے دست کش ہوکر عوام کی پسماندگی اور درماندگی دور کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ان کی دور اندیشی کوئی خواب نہیں بلکہ تعبیر ہے،اس اسلامی نظام کی جس پر کبھی ابوبکر و عمر،عثمان وعلی نے چل کر دکھایا تھا۔ایوان بالا کی ہر صدا پر لبیک کہنا اور حکم کی تعمیل کرنا عوام کی عادت بن گئی۔وعدہ وفا کرنا حکومت کا مزاج بن گیا۔ دروغ بے فروغ کی کوئی سبیل نہ رہی۔عوام کا رشتہ براہِ راست حکومت سے جُڑ گیا ہے۔اس نظام حکمرانی میں حکمراں کی نہ سُستی حائل ہوئی، نہ سُستی شئ سمجھ کر سستی کو راہ دی۔یہی وہ اصل جوہر وگوہر ہے جو بدلاؤ کے رجحان پیدا کرنے کا محرک ہے۔

یہ خوبیاں حکومت کی طرف سے قوموں میں پیدا کی جارہی ہیں۔ان اوصاف سے ترکوں کو لیس کیا جارہا ہے، جو اللہ رب العزت کی طرف سے ودیعت کیے گئے ہیں۔اس الیکشن میں رجب کی نصرت نے مسلمانوں کی حرماں نصیبی کو ختم کردیا ہے۔اور مغربی اقوام کو یاس وقنوط میں مبتلا کردیا ہے۔جمہوریت کا حق جس طرح لوگوں نے ادا کیا، اسی طرح برابر رجب بھی حق ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔گویا محبت وانس کی ہوا بحال کرنے میں ترکی اولین دیش ہے۔بجا طور پر اس تبدیلی کے پیچھے دعاۃ وصلحا کی پوری جماعت ہے۔کیوں نہ ہو۔جب کہ ''ترک قوم کی کسی کی باجگذاری کی عادت نہیں رہی۔خودسری سے حکومت ومملکت فطرت رہی ہے''۔

ملک ووطن پر رجب طیب اردغان کی سیاسی پالیسی کا ایک گہرا اور مثبت اثر پڑا۔ یہ مرد درویش دنیا کی خیر خواہی کا متمنّی ہے۔لوگوں کی بھلائی اور آرام وراحت کا طالب ہے۔فی الحقیقت رجب طیب اردغان بھی دورانحطاط کی پیداوار ہیں،لیکن ترکی ان کی قیادت میں جس طرح عالمی منظرنامے پر ابھرا ہے،ایسا لگتا ہے کہ کبھی زوال کا شکار نہ ہوا تھا۔غرض کہ وہ فرشتہ صفت مسلمانوں کا مسیحا ہے۔جس کی ہر کوشش وکاوش احترام آدمیت وانسانیت کے لئے ہے۔کامیاب ہے وہ قوم جو اپنی گذشتہ تاریخ سے سبق لے۔مسلمان کی تاریخ بتاتی ہے کہ زوال وادبار سے بڑے بڑے جہابذہ پیدا ہوئے ہیں۔یہ تو مسلمانوں کی اصل خصوصیت ہے۔چونکہ غیر مسلم اقوام وملل کی تاریخ میں نظر آتا ہے کہ ان کے سیاسی زوال، انقلابِ سلطنت اور بدنظمی وانتشار کے ساتھ ان کو علمی زوال اور قحط الرجال سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔سلطنتوں کی ہمت افزائی وسرپرستی اور قوموں کی خود اعتمادی واحساس برتری کے فقدان کے ساتھ ان کے ذہن وفکر کے سوتے خشک، مسابقت کا جذبہ سرد اور محرکات عمل کمزور پڑجاتے ہیں۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ان کے سیاسی زوال اور اندرونی انتشار کے زمانہ میں ایسے ممتاز اہل کمال پیدا ہوئے، جو دور زوال وانحطاط کی پیداوار نہیں معلوم ہوتے۔

میں آپ کو بتاتا چلوں کہ ترکی کے انصاف پسند اور نغمۂ امن گنگنانے والے افراد نے رجب کو کامیاب کرکے حق وعدل کا ساتھ دیا ہے۔ان کی پالیسی پر نظر دوڑائیے،اور لمحہ بھر رک کر سوچئے تو جنگ کے گہرے بادل چھٹ جائیں، اور دنیا عافیت وراحت کا سانس لینے میں کامیاب ہوجائے۔

☆☆☆

□گوشۂ ترکی

ردوغان، ترقیات، گولن اور عالمی میڈیا کے پروپیگنڈے

سمیع اللہ خان
جنرل سکریٹری: کاروانِ امن وانصاف

مغربی سورج ڈوب رہاہے، برطانوی عوام نے اپنے ہاتھوں سے یوروپی یونین کے خلاف بریگزٹ کا آپشن استعمال کرکے اس سامراج پر کاری ضرب لگادی ہے، غیر فطری اور غیر انسانی نظام کے علمبردار یوروپ کا یہ نقطۂ زوال ہے۔

دوسری طرف ترکی کے باشعور عوام نے وزارت عظمٰی کے بعد صدارتی نظام میں بھی رجب طیب کے لیے فری ہینڈ کو اختیار کیا ہے، یہ ایک عظیم تبدیلی کا آغاز ہے۔

مغربی میڈیا جو کہ پوری دنیا پر اثر انداز ہے، اپنے آقاؤں کے اشارے پر دن رات ایک کررہا ہے، وہ اذہان کو مسموم کرنا چاہتا ہے اور رجب طیب کی شبیہ اس کا خاص ہدف ہے۔

دنیا کی طالع آزما طاقتیں ایک بار پھر ترکی پر جھپٹ رہی ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہ ایک لا نبی تاریخ ہے ترکی ہمیشہ ایسے معرکوں سے نبرد آزما ہوا ہے اور شاد کام ہوا ہے، ۱۹۱۸ میں انگریزوں نے مصطفٰی کمال کو استعمال کرکے ترکی میں الحاد و دہریت کا بیج بونا شروع کیا، ۱۹۵۰ تک دجالی طاقتوں کے ان ہرکاروں نے ترکی میں کفر وشرک کے خوب کھیل کھیلے لیکن درون خانہ زمینی سطح پر اسلام پسند مخلصین سرگرم عمل تھے اور بالآخر ۵۲ سالہ محنت رنگ لائی اور ۱۹۵۰ میں عدنان مینڈریس وزیر اعظم اور جلال بایار صدر منتخب ہوئے، اب پھر سے ترکی میں اسلامی لہر چل پڑی، لیکن ترکی کے مذہب بیزار ملحدوں کو یہ صورتحال ہضم نہیں ہورہی تھی، اور اس کے علاوہ آقائے فری میسن بھی اسے برداشت نہیں کرپارہے تھے چنانچہ ایک سازش کے تحت اس حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا جلال بایار قید کیے گئے اور عدنان مینڈریس کو پھانسی دی گئی، اس کے بعد ایک بار پھر دجالی طاقتوں نے الحادی مشنریوں کو ترکی میں سرگرم کیا لیکن اسلام پسندوں نے اس کے مقابلے میں کبھی بھی ہمت نہیں ہاری اور اپنے روحانی رہنما شیخ آفندی حفظہ اللہ کی رہنمائی میں زمینی جدوجہد جاری رکھی اور اسلام پسند پھر سے ۱۹۹۲ میں ابھر کر سامنے آئے اور معروف ومخلص اسلام پسند رہنما نجم الدین اربکان کی جماعت برسر اقتدار آئی، اور یوں ترکی میں پھر سے روح اسلامی پھلنے پھولنے لگی، دجالی مشنریاں پھر میدان میں آئیں اور سازشوں کا جال بن کر عدلیہ کی مداخلت سے نجم الدین اربکان کو حکومت چھوڑنے پر مجبور کردیا، انسانیت کے حقیقی دوست اور الفت ومحبت کے علمبرداروں کی کوششوں کو پھر سے جھٹکا لگا، لیکن ترک قوم بڑی جفاکش اور اولوالعزم واقع ہوئی ہے معرکہ ایمان وکفر میں وہ بارہا ابھر ابھر کر سامنے آتی رہی لیکن کبھی بھی اس نے ہتھیار نہیں ڈالے، اور اربکان کے بعد اس مشن کو مرد آہن رجب طیب اردوغان نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا، اردوغان بصیرت افروز قائد اور دور اندیش رہنما ہیں، ان کے پاس ملت کی خاطر دھڑکتا دل اور فکرمند دماغ ہے جو ہمیشہ ملت مرحوم کے احیا کے لیے سرگرم عمل رہتا ہے، انہوں نے اپنے مدبرانہ اقدامات سے بتدریج ترکی کو مضبوط کرلیا اور اپنی ملی و مذہبی خدمات سے انہوں نے عوام میں اپنی مقبولیت کا لوہا منوالیا، ان کی مقبولیت کے راز بہت کچھ ہوسکتے ہیں، لیکن نمایاں جذبہ ان کی بے پناہ فلاحی ورفاہی خدمات اور قوم کے تئیں والہانہ تعلق ہے، اردوغان کا سیاسی نظریہ اسلامی بنیادوں پر ہے، اور یہی وجہ ہیکہ وہ

یوروپ کے لبرلوں اور اسلام دشمن جمہوری علمبرداروں کو بھی نہیں بھائے،لیکن انہوں نے معترضین کو خاطر میں لائے بغیر اپنی محنت جاری رکھی اور جہد مسلسل سے اپنے اسلامی نظریۂ سیاست کو ثابت کر دکھایا۔

اردوغان صرف نام پر نہیں کام پر چلتا ہے، ان کی خدمات اور ترکی کے ارتقاء و استحکام میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ تاریخ میں آب زر سے رقم ہوں گے،

اردوغان نے ترکی معیشت کو مستحکم کیا، استنبول کو، Pollution Free, Crime free,اور رواں دواں ٹریفک شہر بنایا، لوڈشیڈنگ میں کمی کی، ترکش ائیرلائن کو یوروپ کی بہترین اور دنیا کی ساتویں بڑی ائیرلائن تک پہنچایا، ۲۰۰۲ سے ۱۱ کے درمیان ترکی میں ۱۳۵۰۰ کلومیٹر طویل سڑکیں بنوائیں، ۲۰۰۹ میں محکمہ ریل کو مضبوط کیا، تعلیمی بجٹ 7 ارب لیرا سے بڑھا کر 34 ارب لیرا کر دیا، پوری قوم کو گرین کارڈ عطا کیا جس کے ذریعے کوئی بھی ترک باشندہ ملک کے کسی بھی ہسپتال میں کبھی بھی مفت علاج کرواسکتا ہے،

خواتین کو سروسز میں حجاب کی اجازت دی، اردوغان کے اس فیصلے کے بعد ۲۰۱۵ میں وہاں خاتون جج بنیں اور اس نے مقدمہ اسکارف پہن کر سنا تو پورا یوروپ ششدر رہ گیا، اردوغان نے مسجد اور اسکول کے ۱۰۰ میٹر اطراف تک شراب کا اشتہار تک ممنوع قرار دیا، اور تمام اسکولوں میں دین و اسلام کی تعلیمات کو لازمی کیا، دجالی مشنریوں نے ترکی کو کمزور کرنے کے لیے اس کی معیشت کو سبوتاژ کر دیا تھا، اور ترکی کو ورلڈ بینک کا مقروض کیا تھا، اردوغان نے عمل پیہم اور مدابرانہ اقدامات سے بتدریج اس قرضے کو مکمل ادا کیا، اور اب ورلڈ بینک کو ہی قرضہ دینے کی پیشکش کی، الحادی مشنریوں کی طرف سے پھیلائے گئے لادینی نظام تعلیم کی اصلاحات کیں، ملکی یونیورسٹی کی تعداد ۹۸ سے بڑھا کر ۱۹۰ کر دی۔

یہ ہیں اردوغان کے وہ کارنامے جن سے اسلام دشمن عناصر ہمیشہ بوکھلائے رہتے ہیں، وہ ترکی کو جمہوری راستوں سے ہی اسلامی سانچے میں ڈھلتا دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھ رہے ہیں ترکوں کی اسلامی پیش رفت اہل یوروپ کے لیے ایک بڑا صدمہ ہے اور گلے کی ایسی ہڈی ہے جسے وہ نگل نہیں پا رہے۔ کیونکہ رجب طیب اردوغان نے ترکی کو اسلامی قالب میں اس راستے سے ڈھالا ہے جو راستہ اہل یوروپ نے دنیا میں متعارف کرایا،

اس سے نمٹنے کے لیے دجالی طاقتوں نے فتح اللہ گولن کو ذمے داری دی، فتح اللہ گولن نے بتدریج ترکی میں اسلامی عناصر کو زہرناک کرنا شروع کیا، اردوغان گولن کے عزائم جان چکے تھے لیکن ڈھیل دیتے رہے لیکن آخر کار گولنی عناصر اردوغان کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوئے اور انہوں نے فوج کے اسرائیل نواز ٹولے سے مل کر اردوغان کے خلاف باقاعدہ بغاوت کروائی، لیکن وہ بھی اردوغان تھے جنہوں نے زمین پر اپنی چھاپ مضبوط جمائی تھی چنانچہ عوام نے فوج کا مقابلہ کیا اور اپنے محبوب لیڈر کے لیے ۲۵۰ سے زائد جانوں کا نذرانہ پیش کیا، بغاوت ناکام ہوئی اور اردوغان جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کے مصداق آج بھی ترکوں کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔

اس وقت ہمارے یہاں کچھ مفکرین اردوغان کی شبیہ مجروح کرنے کے لیے منظّم طور پر سرگرم ہیں ان کے اعتراضات اردوغان پر کچھ یوں ہیں کہا جا رہا ہیکہ اردوغان کے خلاف میڈیا میں طرح طرح کے الزامات پر مبنی رپورٹس آئی ہیں، کہا جاتا ہیکہ یہ رپورٹس انگریزی میں ہے اسلیے اردو دانوں تک پہنچ نہیں پا رہے ہیں جبکہ جن انگریزی اخبارات اور میڈیا کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے ان کا واقعہ یہ ہیکہ وہ عالمی سطح پر اسپانسرڈ ہیں اور چند تنظیموں کے آرگن ہیں، جن کا مکمل کنٹرول فری میسن کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، اس حقیقت کو واقعات کی روشنی میں یوں سمجھ سکتے ہیں: جب ترکی میں جمہوری حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی اس وقت انگریزی میڈیا کی سرخیاں تھیں:

برطانیہ کا مشہور اخبار ٹیلی گراف لکھتا ہے;

The Army Sees Itself as the Guardian of Turkey,s Secular Constitution

"فوج اپنے آپ کو ترکی کے سیکولر آئین کی محافظ سمجھتی ہے"

اس اخبار کے مطابق عوام کی منتخب حکومت اور پارلیمنٹ نہیں بلکہ فوج آئین کی محافظ ہے، اور بغاوت جائز!

نیویارک ٹائمز عوام کو فوج کا ہمدرد کرنے کے لیے لکھتا ہے،

Look at Erdogan Controvesial A Rule in turkey

"ترکی میں اردوغان کا متنازعہ اقتدار، ایک نظر میں"

ایک انگریزی اخبار ڈیلی بیٹ نے تو حد کردی اور سرخی لگائی کہ،

Erdogan Reportedly Denied Assylum in Germany, Now Headed to London,

"اردوغان کو جرمنی نے پناہ دینے سے انکار کردیا، اب وہ لندن جارہے ہیں"

VOX نیوز نے میڈیا کا نام روشن کرتے ہوئے لکھا،

Erdogan Is Clearly a Threat to turkish Democracy and Secularism,

"اردوغان واضح طور پر ترکی جمہوریت اور سیکولرزم کے لیے خطرہ ہیں"

انگریزی میڈیا میں عالمی سطح پر غیر جانبدار اور معتبر مانے جانے والے FOX میڈیا ہاؤز، نے Ralf Peters کو اپنے ہاں مدعو کیا اور اس نے اردوغان کے خلاف فضا بناتے ہوئے کہا،

"If The Coup Succeeds, Islamists Loosr and we win,

"اگر بغاوت کامیاب ہوجاتی ہے تو اسلامسٹ ہار جائیں گے اور ہم جیت جائیں گے،

روسی میڈیا نے بدترین خسیسیت کرتے ہوئے، فوجی بغاوت کے خلاف اردوغان کی حامی عوامی بھیڑ کو یہ کہہ کر لگایا کہ یہ بھیڑ بغاوت پر جشن منارہی ہے،

یہ ہے اس میڈیا کی حقیقت جن کی رپورٹس کی دہائی دے کر اردوغان پر کیچڑ اچھالا جارہا ہے، کیا یہ کھلے ہوئے حقائق اردوغان کے تئیں میڈیا کی دجّالی ذہنیت کی عکاسی نہیں کرتے؟

آخر کس انصاف کے پیمانے سے اس میڈیا کی چند رپورٹس کی بنیاد پر اردوغان پر کیچڑ اچھالا جارہا ہے؟

دنیا کا کون سا قانون ثابت شدہ دشمن کی افواہوں کو فریق مخالف کے حق میں دلیل بناتا ہے؟ ہم اپنے نجی معاملات وقضیات میں اپنے مخالف فریق کی بات اسلیے اڑا دیتے ہیں کہ وہ تو ہم سے خار ہوا ہے ہی، تو بھلا بتایئے کس طرح ایک عالمی سیاسی بساط پر، ایک فریق کو اس کے مخالف میڈیا کی پروپیگنڈہ بازی سے مجرم مانا جائے گا؟

جن فتح اللہ گولن کی مسیحائی اور مظلومیت کا لوگ ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں ان سے یہ پوچھنے کی ہمت کیوں نہیں کر پارہے ہیں کہ آخر کیا وجہ بنی کہ اسلام کا ایک دعویدار امریکہ کی گود میں جا بیٹھا ہے؟ وہ اگر اپنے موقف میں سچے تھے اور نظریات میں مخلص تھے تو سامنا کرتے ترکی ہی میں رہ کر، جیسا کہ آج تک اخوانی کرتے آئے ہیں، انہوں نے کبھی بھی آلام ومصائب کے خوف سے راہ فرار اختیار نہیں کی، تو گولن جیسا نظریاتی شخص کیوں بھاگا بھاگا پھرتا ہے؟

اور گولن کس ناحیے سے اسلامی محسن ہوگئے درآں حالیکہ ان کے افکار ونظریات حد درجہ گمراہ کن ہیں، گولن صاحب کے مطابق:

غیر مسلم کافر کے جسم کا ریشہ ریشہ مسلمان ہوتا ہے، ۱۹۹۸ میں عیسائی پوپ سے ملاقات کے وقت گولن صاحب نے بشارت دی کہ، یہودی اور عیسائی بھی جنت میں جائیں گے، گولن صاحب کے مطابق، قرآن وحدیث میں جو صرف مسلمانوں کے لیے جنت کا وعدہ نظر آتا ہے وہ عربوں نے قرآن میں تحریف کردی ہے، گولن صاحب کا کہنا ہیکہ، قرب قیامت عیسیٰ کا نزول جسمانی نہیں ہوگا، جب ترکی میں حجاب مخالف آواز بلند ہوئی تب گولن صاحب نے فتویٰ دیا کہ، حجاب مسلم خاتون کے لیے کوئی لازمی چیز نہیں! انہی سب نظریات کی بنا پر اربکان اور پروفیسر غندو سمیت اکثر مسلم دانشورانِ ترکی نے خود کو بہت پہلے گولن اور ان کی تنظیم سے الگ کرلیا تھا، اور گولن صاحب کی حقیقت اس وقت کھل کر سامنے آگئی جب چند اختلافات کا بہانہ بنا کر وہ امریکہ بھاگ لیے اور منظّم انداز میں امریکہ سے اردوغان مخالف مہم چھیڑی، گولن کے امریکہ فرار ہونے کے باوجود اردوغان نے ان کے حامیوں کو یہاں رہنے دیا، ان پر کسی طرح کی سختی نہیں کی حتیٰ کہ انہیں سسٹم میں نوکریاں تک دیں، لیکن آخر کار ہوا وہی سانپ نے زہر اگلا اور فوجی بغاوت میں ان گولنی عناصر نے کھل کر زہر ناکی پیش کی اور اردوغان کو ختم کرنے کے لیے مکمل سرگرم رہے:

تب جا کر اردوغان نے ان گولیوں پر شکنجہ کسا اور انہیں گرفتار کرنا شروع کیا، اوور کوئی بھی حاکم یہی کرتا، کیونکہ اب تک ایسی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکی ہے کہ ملک میں منظّم بغاوت کھڑی کرنے والوں کو حزب اقتدار نے اپنا داماد بنایا ہو، لیکن یہاں مفکرین کو یہ پہلو نظر نہیں آرہا کہ اردوغان جن لوگوں پر سختیاں کررہے ہیں انہوں نے ان کی حکومت کا تختہ پلٹنے اور انہیں قتل کرنے کی سازش کی تھی، اور ایسے لوگوں کی یہی سزا ہوتی ہے جو انہیں ترکی میں دی جارہی ہے، لیکن مفکرین اسے اردوغان کا تشدد کہتے ہیں اور سیاسی انتقام سے تعبیر کرتے ہیں حالاں کہ سیاسی انتقام اگر اردوغان لینا چاہتے تو اسی وقت لیتے جب آج سے دس سال پہلے گولن ترکی چھوڑ کر امریکہ فرار ہوئے تھے، دوسری طرف دورخی پالیسی اور دوغلا موقف ہے ان مفکرین کا، کہ یہی کام سعودیہ علماء حق کے خلاف کررہا ہے، اپنی حکومت سے دشمنی کا بہانہ بنا کر وہ اہل حق کو جیلوں میں ٹھونس رہا ہے تو وہ مفکرین کے نزدیک جائز ہے کیونکہ وہ ان کی نظر میں سعودیہ کی اسٹیٹ پالیسی ہے، اور ہر ملک کو اپنی حفاظت اور سرکار کو اپنی بقا کے لیے ایسے اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔

کیسے دوہرے معیارات گڑھ لیے ہیں گھسی پٹی اصطلاحات کے رعب دار لکھاریوں نے، کہ ہر اسلام پسند بہر صورت مجرم ہوگا، اور ہر لبرل، ملحد فائنانسر امن کا داعی اور معصوم ہوگا چاہے وہ خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہادے۔ عربی دنیا اور مغربی میڈیا پر نظر رکھنے والے ہر صاحب عقل پر یہ واضح ہے کہ موجودہ ترکی اور اردوغان کے خلاف ان کے برپا کردہ پروپیگنڈے محض ایک مخصوص بالادستی کے لیے ہیں، یہ مراکز جہاں سے ایسے پروپیگنڈے اٹھ رہے ہیں وہ یقینی طور پر یکطرفہ ہیں: استنبول کے ایک چھوٹے سے پارک کے لیے شروع ہونے والا احتجاج جب ختم ہورہا تھا تو مشہور برطانوی رسالے اکانومسٹ نے اپنے شمارے میں رجب طیب اردوغان کی بڑی سی تصویر شائع کی، تصویر پر خلافت عثمانیہ کی پوشاک چڑھائی اور لکھا:

"ڈیموکریٹ یا سلطان؟"

مغربی میڈیا کے قطب نما اس رسالہ نے اسی دوران انتخابات کے وقت ترک عوام کو مخاطب کرتے ہوئے صاف طور پر لکھا:

"ڈیموکریٹک پیپلز پارٹی کو ووٹ دیں تاکہ رولنگ پارٹی یعنی کہ جسٹس پارٹی پر لگام دی جاسکے"۔

۷ جون کو امریکی روزنامے نیویارک ٹائمز اور اسی دن " اسرائیل ٹو ڈے " میں صراحت کے ساتھ اردوغان کے خلاف نظریاتی نہیں ذاتیاتی سطح کی دشمنیوں پر مبنی شراکتیں شائع ہوئی ہیں۔

ترکی فوجی بغاوت کے موقع پر برصغیر کے مغرب زدہ لبرل بھی پیچھے نہیں رہے، چنانچہ پاکستان کا ایک انگریزی اخبار ہیڈنگ لگاتا ہے ERDO-GONE اس عنوان تلے چھپی ذہنیت کو بھلا کون محسوس نہیں کرتا ہوگا؟

ان تمام حقائق کے سامنے آجانے کے باوجود آخر کیسے ہمارا تعلیمیافتہ طبقہ اردوغان کے سلسلے میں انگریزی، مغربی میڈیا سے متاثر ہوتا ہے؟ یہی سب حقائق ہیں موجودہ صدارتی انتخابات میں اردوغان کی کامیابی کے بعد اٹھنے والے مغربی میڈیائی پروپیگنڈے کے، جنہیں ہندوستان کا ایک ٹولہ خوب اچھال رہا ہے، جس میں ہم جنس پرستی کو بھی شامل کیا جارہا ہے، جس کی حقیقت بھی ایسی ہی کچھ ہے۔

ہم اردوغان کو معصوم یا خالص اسلامسٹ نہیں مانتے اور نا ہی اردوغان کو امیر المؤمنین کہتے ہیں، بلکہ ہم اردوغان کو اسوقت کے حکمرانوں میں سب سے بہتر سمجھتے ہیں، اردوغان نے ترکی کو ترقیات کی جن شاہراہوں پر کامیابی سے گذارا ہے وہ اردوغان کو ایک کامیاب حکمران بتلاتی ہیں، ملت کے تمام ہی قضیوں میں چاہے وہ فلسطین کا معاملہ ہو کہ، برما کے مظلومین کا، اردوغان کے بے خوف مواقف اور ان کی بے لاگ للکار قومی جسم میں حرارت کے اثرات پیدا کرتی ہے، اور من حیث القوم ان کے لیے پیار بڑھاتی ہے، وہ باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ملت کی ترجمانی کرتے ہیں، یہی کیا کم ہے اس مرحوم ملت کے لیے ایسے بحرانی دور میں،

یہ جو لوگ قوم میں اہل حق کے متعلق شک پیدا کرنے اور ذہن گندا کرنے کا کام کرتے ہیں کیا وہ ہے سامنے کی حقیقت بھلا بیٹھے ہیں کہ ترکی یوروپ کے سینے پر اسلامی پھریرا لہرا رہا ہے، اردوغان نے ترکی کو جمہوری راستے سے ہی ترقی یافتہ ممالک کی ایسی فہرست میں لا کھڑا کیا ہے جن میں اسلام پسندوں کا نام تک گوارا نہیں کیا جاتا تھا، اردوغان نے امریکہ و اسرائیل کی اس بغاوت کو اپنے ملک میں ناکام کردیا جو مصر میں مرسی کے خلاف کامیاب ہوگئی تھی، یہ آخر

باطل کو کیسے ہضم ہوگا؟

اور شاہان عرب تو اردوغان کو کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے جیسا کہ وہ اخوان اور مرسی کو برداشت نہیں کر سکے، کیونکہ ترکی اور اردوغان و اخوان کا عروج ان ڈکٹیٹروں اور قومی قزاقوں کے خاتمے کی نوید ہے، وہ قومی قزاق جو مقامات مقدسہ کی عقیدتوں کے چادر میں فری میسن اور اسرائیلی عزائم کے جال بن رہے ہیں، اور اسی پردے میں ہزار ہا علماء حق کو نشانہ بنا رہے ہیں، وہ کبھی بھی اردوغان کی مقبولیت برداشت نہیں کر پائیں گے، اور یہ رپورٹ مغربی ذرائع میں بھی آچکی ہے، کہ اردوغان حکومت کے خلاف متحدہ عرب امارات نے تین بلین ڈالرز خرچ کیے تھے تاکہ اردوغان کی حکومت کا خاتمہ کیا جاسکے، قطر مقاطعہ کے وقت خلیجی ملک کے ایک بڑے سفیر کا میل میڈیا میں آگیا تھا، اس میں بھی یہ حقائق عیاں تھے، اور پھر ترکی کا بحیثیت اسلامی پسند ملک مضبوط ہونا یوروپ میں اسلام کا مضبوط ہونا ہے، یہ سب استعماری طاقتیں کبھی برداشت نہیں کر پائیں گی۔

ایمانی جذبات کو چھپانا اور مزاج کی ناقص ترجمانی موجودہ دنیا کا ٹرینڈ بن چکا ہے جسے سیکولرزم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی ترقیات اور پروموشن کا معیار ٹھہرا ہے جبکہ یہ نہایت غیر فطری ٹرینڈ ہے، مؤمنین کو بجا طور پر فخر ہونا چاہیے اور اس کا اظہار بھی کیا جانا چاہیے کہ فی الوقت دیگر کمیونٹیز کو دنیا، میں اپنے جذبات کے اظہار سے کوئی باک نہیں ہے، یہ سارے سیکولرزم کی ذمہ داری آخر صرف اور صرف مسلمانوں کے ہی نام کیوں؟

جبکہ ہر دل کہتا ہے کہ:

آج کے ترکی کا رجب طیب اردوغان، عدنان مینڈریس جیسے ہزاروں شہدا کے لہو کا امین ہے، ان کی آرزوؤں کی تعبیر ہے، وہ ایسا لیڈر ہے جس کے گرم سینہ میں امت پنے کا دل دھڑکتا ہے،، وہ کبھی مظلوم فلسطینیوں کے حق میں فریڈم فلوٹیلا ہو جاتا ہے، تو کبھی اس کی غیرت اسرائیلی صدر کو بھرے اسٹیج پر منہ تکتا چھوڑتی ہے۔

وہ کبھی مصر کے اخوانیوں کے لیے اخوت اسلامی کا نشان بن جاتا ہے: تو کبھی: بنگلہ دیشی تحریکیوں کے لیے حریت کی للکار ہو جاتا ہے۔

وہ کبھی دوغلے دنیوی سامراج کے دھتکارے ہوئے شامی رفیوجیوں کے لیے انسانی و ایمانی دسترخوان بن جاتا ہے: تو کبھی: اس کی خدا ترس بیگم بری مظلوموں کے کیمپ میں ہوتی ہے، ان سے بغلگیر ہوتی ہے، اور انسانیت پر بدترین بربریت کے سفاک مناظر سے پھوٹ پڑتی ہے۔

وہ کبھی ایوان میں تدبیر ملکی کی عہد ساز نظیر ہوتا ہے ؟: تو کبھی: میدان جنگ میں سپہ گری کی تاریخ رقم کرتا ہے۔

رجب طیب اردوغان مرد آہن ہے وہ کاغذی اندیشوں سے کہیں زیادہ میدانی تدابیر کو چیلینج کرتا ہے، اس کی دانشمندانہ قیادت نے جس عزیمت و استقامت کے ساتھ مسلح بغاوت کو روند ڈالا تھا، اسی وقت تاریخ میں رقم ہو چکا تھا کہ: اردوغان کی قیادت میں وہ لوہا ہے جو کبھی خالدؓ، زنگی، ایوبی اور بن قاسم کے عزائم میں ہوا کرتا تھا۔ اردوغان ان مجاہدین کے سالار ہیں جن کی زندگیاں ملت کا عظیم سرمایہ ہیں، عزیمت و استقامت، خلوص و وفا کے نغمے ان کے قول و عمل سے پھوٹتے ہیں۔

آج کے ترکی کا ہر سورج اپنی ہر ہر کرن سے شعور و آگہی کے جلوے بکھیرتا ہے، جدید ترکی کے عہد اقبال کو سلام، ترکوں کی نویدِ عروج کو سلام:

شاعر کی زبانی سنیں تو:

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدیٔ امت کی سطوت کا نشانِ پائیدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے،
نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ایوّب انصاری سے آتی ہے صدا،
اے مسلمان! ملّتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

☆☆☆

گوشۂ ترکی

معاہدۂ لوزان-ایک مطالعہ

انجینئر شفیع اللہ
رکن مجلس عاملہ کاروان امن وانصاف، ممبئی

معاہدہ لوزان کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہم پہلی جنگ عظیم کے بارے میں چند حقائق کا جائزہ لیں گے۔

پہلی عالمی جنگ کا زمانہ ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء سے ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء تک ہے۔ ایک طرف تو اتحادی قوتیں جن میں روس، فرانس، انگلستان، جاپان اور امریکہ تھا تو دوسری طرف مرکزی طاقتیں جن میں آسٹریا ہنگری سلطنت، جرمنی اور سلطنت عثمانیہ شامل تھیں۔

طرفین کو ہم اس زمانہ کے نقشے کے مطابق دیکھتے ہیں:

نشان دہی کے علاوہ بقیہ ہرے رنگ میں اتحادی طاقتوں کی کالونیاں تھیں اور پیلے رنگ میں مرکزی طاقتوں کی کالونیاں تھیں

سارے مغربی ممالک چاہتے تھے کہ افریقہ پر قبضہ کرلیں اور وہاں اپنی اپنی کالونیاں بنائیں۔ ۱۸۸۰ء سے شروع ہوئی افریقہ کو حاصل کرنے کی اس دوڑ میں فرانس، انگلینڈ، بیلجیم، ہالینڈ سب سے آگے تھے۔ انگلینڈ ان سب کا لیڈر تھا۔

یوروپ میں انیسویں صدی میں قوم پرستی سر چڑھ کر بول رہی تھی۔

شروعات

بالٹک یا بالقان ریاستیں یا تو آسٹریا ہنگری کے زیر قیادت تھے یا سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھے۔ لیکن انکی چاہت تھی کہ یہ بھی قوم پرستی کے نقش قدم پر اپنا الگ ملک بنائیں۔ ان میں ایک قسم کا رجحان پروان چڑھا کہ جنگ کر کے ہی کوئی ملک عظمی ملک بن سکتا ہے اور کسی بھی دیش کی عظمت جنگ کرنے اور اسکے جیتنے میں پوشیدہ ہے۔

بالکان کا علاقہ

یہ سب بالقانی ریاستیں، عثمانیہ، سلطنت میں آتی تھیں۔

۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۲ء تک تین الگ الگ لڑائیاں ہوئیں۔ بالقان چونکہ آسٹریا ہنگری، روس اور خلافت عثمانیہ کے درمیان تھا اور تینوں اس پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے اس لئے مختلف لڑائیاں لڑی گئیں۔ بالقان کو بارود سے بھرا گودام بھی کہا جاتا تھا۔ رومانیہ، بلغاریہ، سربیا، البانیا، یونان آزاد ہوئے۔ بوسنیا بھی چاہتا تھا کہ وہ آزاد ملک بنے۔ بوسنیا پر آسٹریا ہنگری کی حکمرانی تھی۔

فرینز فرڈیننڈ کا قتل

۲۸ جون ۱۹۱۴ء میں آسٹریا ہنگری کے ولی عہد فرڈیننڈ اور انکی بیوی پر بوسنیا میں حملہ ہوا اور انھیں قتل کر دیا گیا۔ قتل کے پیچھے بوسنیا شہری گیریولو پرنسیپ تھا۔ گیریولو بلیک ہنڈ نام کی ایک تنظیم شامل تھی۔

آسٹریا۔ ہنگری نے اس قتل کے پیچھے آزاد ریاست سربیا کو ذمہ ٹھہرایا جو بوسنیا کی آزادی کے لے، بوسنیا کی مدد کر رہا تھا۔

آسٹریا۔ ہنگری نے سربیا کو بغیر لڑائی کے ہتھا ر ڈالنے اور شرائط ماننے کا حکم جاری کر دیا۔

جھگڑا صرف آسٹریا اور سربیا کے درمیان تھا۔

قارئین نیچے پیش کیا گئے معاہدوں کا نقشہ دیکھ لیں تو بات سمجھ آجائے گی کہ کس طرح مما لک جوق در جوق اس جنگ کا حصہ بن گئے۔

یوروپی مما لک کے درمیان چند خفیہ معاہدے بھی تھے۔

الگ الگ مما لک کے درمیان جو کچھ سمجھوتے تھے، انھیں ہم مندرجہ ذیل وین خاکہ سے با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔

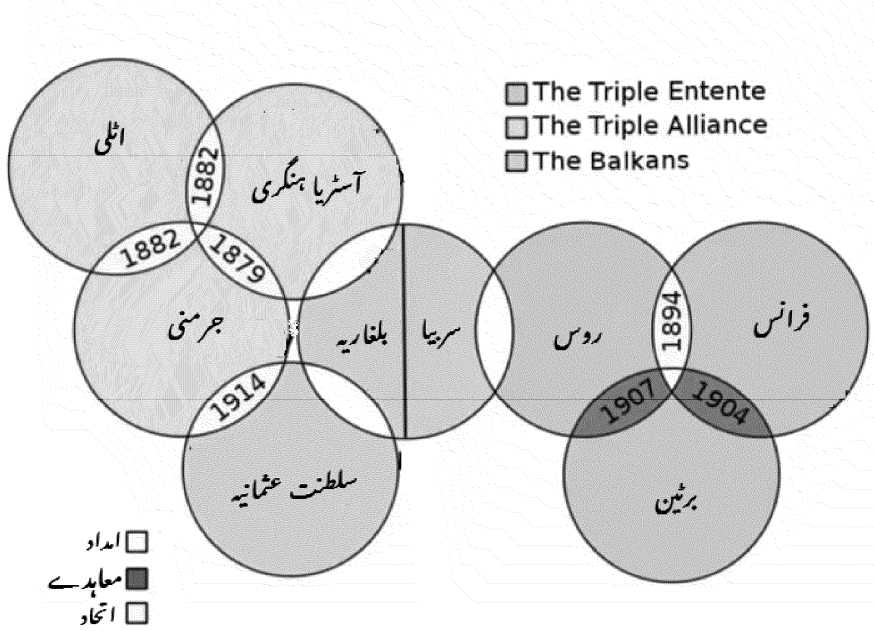

اس خاکہ کی مدد سے مما لک کے درمیان باہمی تال میل کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک طرف فرانس، روس اور انگلینڈ کے درمیان تو دوسری طرف اٹلی، آسٹریا۔ ہنگری اور جرمنی کے درمیان معاہدے تھے۔ معاہدہ، اتحاد اور باہمی امداد خاکہ میں مختلف رنگ سے بتایا گیا ہے۔

سربیا نے روس سے مدد مانگی۔ روس کو موقع کی تلاش تھی کہ کب وہ بالقان ریاستوں میں دراندازی کرے۔

روس نے سلاوک باشندوں کی نسل کی بنیاد پر سربیا کی مدد کی۔ ادھر آسٹریا۔ ہنگری، جرمنی کے پاس گیا۔

جرمنی نے سربیا پر جنگ تھوپ دی۔

روس نے جرمنی پر جنگ کا اعلان کر دیا،
اور کچھ دن بعد فرانس نے جرمنی کے خلاف محاذ کھول دیا۔
اب ہم سلطنت عثمانیہ کی طرف رخ کرتے ہیں۔
باسفورس اور درہ دانیال روس کے لیے بہت اہم تھا۔ یہاں سے اسکے جہاز باقی دنیا سے جڑتے تھے۔ روس کا خیال تھا کہ اگر اس

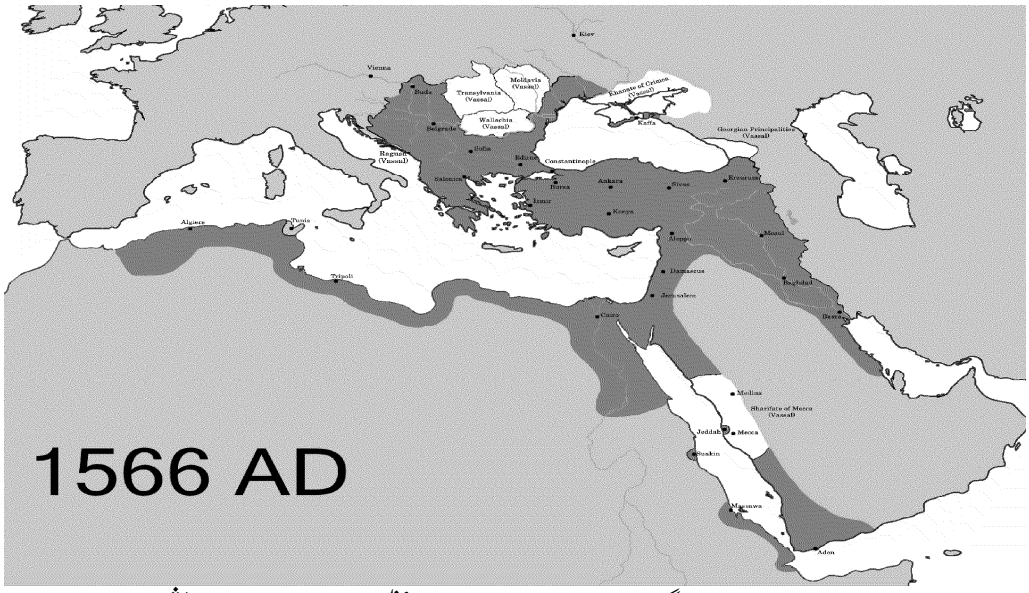

پر عثمانہ سلطنت پوری طرح سے حاوی ہو جائے گی تو اسکے کے لیے مصیبت ہو جائے گی، اسی لئے روس نہیں چاہتا تھا کہ اس راستے پر عثمانیہ حکومت کا اثر بڑھے۔

نیچے دیئے گئے خاکے میں ہم نے اس راستے کو نمایاں کیا ہے۔

برطانوی اور فرانسیسی افواج کی مدد کے لئے امریکا ۱۹۱۷ء میں پہلی بار اس جنگ میں شامل ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں امریکی صدر ووڈرو ولسن نے چودہ نکاتی منصوبہ بنایا جس میں جنگ میں شمولیت کے مقاصد بیان کئے گئے تھے۔ اس میں عالمی امن، بحری جہازوں کی آزادانہ نقل مکانی، سامراجی کا خاتمہ اور لیگ آف نیشن کی بنیاد وغیرہ شامل تھے۔ لیگ آف نیشن بعد میں اقوام متحدہ میں ڈھل گئی۔ جرمنی، سلطنت عثمانیہ، آسٹریا۔ہنگری اور روس کو اس جنگ میں اپنی اپنی سلطنتوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔

خلافت عثمانیہ کو ختم کر دیا اور سلطنت کو چالیس سے زائد ممالک میں تقسیم کر دیا گیا۔

قارئین کی مزید دلچسپی کے لیے ہم سلطنت عثمانیہ کا نقشہ بھی پیش کئے دیتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ خلافت عثمانیہ کا دور چھ سو سالہ ۱۲۹۹ عیسوی سے ۱۹۲۳ عیسوی تک رہا جس میں انکی فتوحات سے کلیسا کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔

تین براعظم ایشیا، افریقہ اور یوروپ پر مشتمل سلطنت عثمانہ

خلافت عثمانیہ میں ارمینیا، شام، اردن، یونان (گریس)، مکہ، مدینہ، مصر، عراق، ، فلسطین، بلغاریہ، یوکرین، یمن، تیونس، سربیا، سلوا کیا، رومانیہ، قطر، مراکش، مونٹی نگرو، مالٹا، لاہ ، لبنان، جارجات، الجرمیا، بحرین وغیرہ جیسے، ممالک اور انکے کچھ علاقہ قابل ذکر ہیں۔

پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ پر شکست خوردہ طاقتوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

۱۰ اگست ۱۹۲۰ کو ہارنے والی طاقتوں نے ایک مسودہ پر دستخط کئے۔

This is called as treaty of sevres

جرمنی پر جنگی جرائم عائد کے گئے اور اس پر خطرہ رقم کا بوجھ لاد دیا گا۔ ۲۰۱۰ تک جرمنی اسکی قیمت چکا تا رہا۔

خلافت عثمانیہ کے اس معاہدہ پر دستخط کی وجہ سے جہاں ترک

عوام کی جدوجہد کو نقصان پہنچا وہیں بھارت میں تحریک خلافت پر بھی اثر ہوا۔

اس مسودہ کی رو سے سلطنت کا کثر ط علاقہ برطانیہ، فرانس، اٹلی اور یونان کو دے دیا گیا۔ استنبول اور سمندری راہ گزر جسے درہ دانال کے نام سے جانا جاتا ہے کو بین الاقوامی ملکیت میں شامل کر دیا گیا۔

Treaty of sevres کی وجہ سے سلطنت کی تقسیم کو مندرجہ ذیل نقشہ کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اس معاہدہ کے فوراً بعد حجاز یعنی موجودہ سعودی عربیہ، عراق، فلسطین

Treaty Of Sevres 1920 -1923

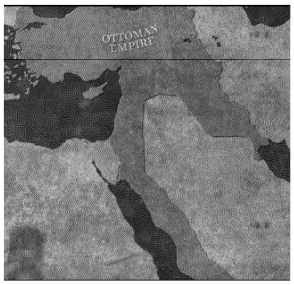

treaty of Sevres -1920

دستخط سے پہلے

۱

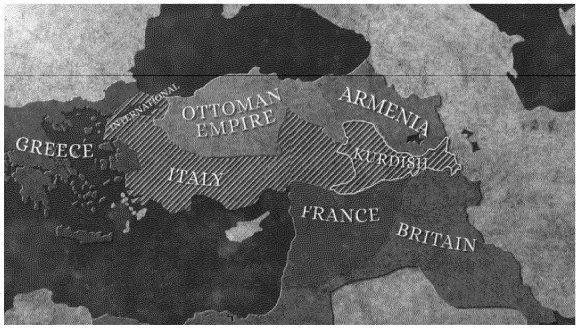

treaty of Sevres -1920

دستخط کے بعد

۲

Treaty Of Sevres 1920 -1923

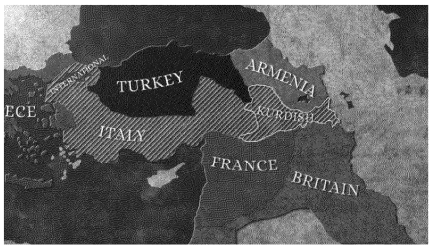

treaty of sevres

کے مطابق ترکی

۳

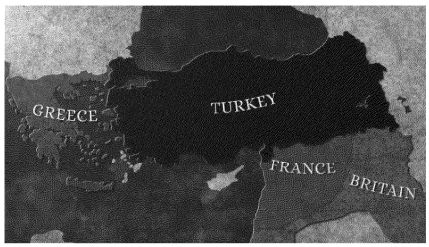

جدید ترکی

۴

اورمصر پرلندن قابض ہوگیا۔ برطانیہ نے یہاں اپنی کالونی بنالی۔ برطانیہ کی افواج یہاں گھر کرگئی۔ پیرس نے شام اور لبنان پر ہاتھ رکھ دیا۔

سلطنت کے تقسیم کے خلاف ترکوں میں قوم پرستی کا جذبہ ابھرا اور مصطفیٰ کمال کی قیادت میں معاہدے کی مشترکہ افواج سے ترکوں نے جنگ چھڑک دی اور فتح حاصل کی۔

اوپر پیش کی گئی چاروں تصاویر کا بغور معائنہ کیجیے۔

ٹریٹی آف سیولہ، برطانوی ڈپلومٹک مارک سائکس اور فرانسیسی ڈپلومیٹ فرانکوس پیکو کے درمیان پہلے ہی طے پایا گیا ایک خفیہ معاہدہ تھا جو انیس سوسولہ عیسوی میں مشرقی وسطی پر مغربی اجارہ داری کے لیے کام کررہے تھے۔

معاهده لوزان

ٹریٹی آف سیور کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۳ میں دوسرا معاہدہ عمل میں لایا گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے جدید ترکی کی سرحدیں طے ہوئی اور ترکی کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کے دیگر حصوں پر دعویداری کو مسترد کردیا گیا۔

۲۴ جولائی ۱۹۲۳ میں اتحادی ممالک نے ترکی کے ساتھ ایک ۱۰۰ سالہ معاہدہ کا۔ اس معاہدہ میں ایک طرف ترکی تھا اور دوسری طرف فرانس، اٹلی، برطانیہ، جاپان، یونان اور رومانیہ تھے۔ یہ معاہدہ سوئزرلینڈ کے شہر لوزان میں ہوا تھا اسلئے اسکا نام معاہدہ لوزان رکھا گیا۔ معاہدہ کا اصل متن فرانسیسی زبان میں ہے۔

اس معاہدہ میں ۱۴۳ آرٹیکلس شامل ہیں۔ جسمیں قابل ذکر:

۱۔ ترکی کے سمندری راستے کے ذریعے تجارت
۲۔ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ
۳۔ چند ضروری معاہدے اور
۴۔ قانین جن پر ترکی کو پابند رہنا ہوگا۔

اس معاہدے کی رو سے جو نکات طے ہوئے انمیں خاص مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تین براعظموں پر مشتمل اسلامی خلافت کا خاتمہ
۲۔ سلطنت کی چالیس سے زائد ممالک میں تقسیم۔ چند قابل ذکر نام اوپر بیان کے جاچکے ہیں۔
۳۔ سلطنت عثمانیہ کا تمام وسائل سے دستبرادری
۴۔ سلطان کے تمام اثاثوں کو منجمد کردیا گیا
۵۔ سلطان اور خاندان کا ترکی سے جلاوطنی
۶۔ ترکی میں اسلامی ریاست کی بجائے سکولر ریاست کا قیام
۷۔ ترکی میں موجود قدرتی وسائل جیسی تیل کے ذخائر کی کانکنی پر پابندی
۸۔ باسفورس بندرگاہ جو ایشیا اور یوروپ کے درمیان نقل و حرکت کے لیے سب سے کم فاصلہ والا راستہ ہے اور جسکی اہمت نہر سوئز جیسی ہے اسے عالمی ملکیت قرار دیا گیا۔
۹۔ اس بندرگاہ سے گزرنے والے کسی بھی تجارتی و مسافر بردار وفوجی بحری جہاز سے ترکی محصول نہیں لے سکتا۔
۱۰۔ ترکی میں موجود یونانی عیسائی اقلیت اور یونان میں موجود ترکی مسلم اقلیت کی حفاظت
۱۱۔ بحریہ روم میں واقع جزیرہ سائپرس یعنی قبرص سے دستبرداری
۲۱۔ سوڈان اور مصر سے علاحدگی

http//:sam.baskent.edu.tr/belge/\Lausanne_ENG.pdf

جنگ عظیم اول کے بعد کس طرح عالمی طاقتوں نے اپنی جیت کے لبادہ میں اسلام، اسکے مرکز خلافت عثمانیہ اور پورے عالم کے مسلمانوں کے کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے اور کس قدر چالاکی سے عالم اسلام کو تار تار کیا ہے۔ مسلم ممالک کو معاشی، اقتصادی طور سے پیچھے کرنے اور عالمی منڈی اور قدرتی ذخائر پر تن تنہا قبضہ جمائے رکھنے کی ناپاک سازش کی ہے۔ فقط باسفورس اور درہ دانیال کو بند کردیا جائے تو یوروپ کے بیسوں ممالک کو نقصان پہنچتا ہے۔

۲۰۲۳ء میں جب یہ معاہدہ ختم ہو چکا ہوگا اس وقت ترکی اپنی زیرزمین قدرتی وسائل کو حاصل کر کے تیل کی پیداوار کے ذریعے اپنی معیشت کو مستحکم کریگا، مزید باسفورس اور درہ دانیال سے حاصل ہونے والا محصول اس کی مجموعی ملکی پیداوار میں اضافہ کا سبب بنے گا۔

☆☆☆

گوشۂ ترکی

خلافت عثمانیہ اور ترکی

محسن خان ندوی
(استاذ دارارقم اینڈ اسلامک انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ)

ایک خواب: کہتے ہیں کہ عثمان خان نے ایک خواب دیکھا کہ.....

''ایک زبردست درخت اس کے پہلو سے نمودار ہوا جو بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحر و بر پر چھا گئیں۔ درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا بہہ رہے تھے اور چار بڑے بڑے پہاڑ اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کے بعد نہایت تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتیوں کا رخ ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا۔ یہ شہر ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں دو سمندر اور دو براعظم ملتے تھے اور ایک انگوٹھی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ عثمان اس انگوٹھی کو پہننا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔''

یہ عثمان خان کون تھا؟ اور اس خواب کی کیا تعبیر تھی؟

عثمان خان ارطغرل کا بیٹا تھا یہ وہی ارطغرل ہے جس نے منگولوں کی طاقتور فوج کے خلاف اپنے صرف ۴۴۴ سوار کے ساتھ قونیہ کے سلجوقی سلطان علاء الدین کی مدد کی تھی اور منگولوں کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا اور سلطان نے خوش ہو کر بدلہ میں اسے ایک جاگیر دی تھی۔ چند سال بعد جب ارطغرل کا ۱۲۸۸ء میں انتقال ہو گیا تو اس کا بیٹا عثمان خان اس کا جانشیں بنا ادھر قونیہ کی سلجوقی حکومت کو منگولوں نے ختم کر دیا اور سلطان جنگ میں مارا گیا۔ اب عثمان خان نے ایک خود مختار حکومت قائم کر لی اور یہی وہ حکومت ہے جسے پوری دنیا سلطنت عثمانیہ یا دولت عثمانیہ کے نام سے جانتی ہے جو عثمان خان کے نام پر رکھا گیا یہ عثمانی نسلاً ترک تھے۔

خواب کی تعبیر: عثمان کے اس خواب کو بہت اچھا سمجھا گیا اور بعد کے لوگوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ چار دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینیوب تھے اور چار پہاڑ کوہ طور، کوہ بلقان، کوہ قاف اور کوہ اطلس تھے۔ بعد میں عثمان کی اولاد کے زمانہ میں چونکہ سلطنت ان دریاؤں اور پہاڑوں تک پھیل گئی تھی اس لئے یہ خواب دراصل سلطنت عثمانیہ کی وسعت سے متعلق ایک پیشین گوئی تھی۔ شہر سے مراد قسطنطنیہ کا شہر تھا جسے عثمان فتح نہیں کر سکا اور وہ بعد میں فتح ہوا۔ (ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ صفحہ ۲۰۲)۔

فتح قسطنطنیہ: قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوشش حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ سے جاری تھی (عمدۃ القاری ۱۰/۱۹۷) لیکن آلِ عثمان میں سے سلطنت عثمانیہ کے ایک جواں سال سلطان محمد فاتح کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس نے رومیوں کی گیارہ سو سال پرانی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور قسطنطنیہ ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو فتح کر لیا اس فتح کے بعد آپ کی وہ پیشین گوئی پوری ہو گئی جس میں آپ نے فرمایا تھا ''خدا نے مجھے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی کنجیاں دے دی ہیں''۔ کسریٰ یعنی ایران کی ساسانی حکومت کا خاتمہ خلفاء راشدین ہی کے زمانہ میں ہو گیا تھا اور قیصر کی حکومت کا خاتمہ محمد فاتح نے کر دیا۔ اس فتح کی وجہ سے تاریخ میں اسے فاتح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

محمد فاتح نے قسطنطنیہ (اب اس کا نام استنبول ہے) فتح کر

کے اسے دارالخلافہ قرار دیا اس وقت سے ۱۹۲۴ء تک یعنی پونے پانچ سو سال تک اس کی یہ حیثیت باقی رہی۔اس زمانہ میں اس شہر نے ایسی ترقی کی کہ سلطنت عثمانیہ کے تمام شہر اس کے سامنے ماند پڑ گئے اور استنبول آج بھی ترکی کا سب سے بڑا شہر ہے۔

خلافت کی منتقلی: عثمانی سلطنت کا سلطان بایزید ثانی کا بیٹا سلیم اول نے ایک طرف ایران کے شاہ اسماعیل صفوی کی حکومت کو شکست دی تو دوسری طرف مصر وشام کے مملوکی خاندان کی حکومت کو ۱۵۱۷ء میں شکست دے کر قاہرہ میں داخل ہوا۔حجاز پر چونکہ مصر کی بالادستی تھی اس لیے مصر پر عثمانی قبضہ ہو جانے کے بعد حجاز کے امیر نے مکہ ومدینہ کی کنجیاں سلیم کو بھیج کر عثمانیوں کی اطاعت کر لی۔

مصر سے واپسی پر سلیم عباسی خلیفہ متوکل سوم کو اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔متوکل نے آنحضرت ؟ کے تبرکات یعنی علم،تلوار اور چادر مبارک جو خلفاء ؓ کے پاس بطور نشان خلافت چلے آتے تھے سلیم کے حوالے کر دئے،کہا جاتا ہے کہ متوکل استنبول میں ایک تقریب کے دوران خلافت کے حق سے سلیم کے حق میں دست بردار ہو گیا تھا۔اس طرح ۱۵۱۸ء میں خلافت عثمانی ترکوں کو منتقل ہو گئی۔

عہد عروج : سلطنت عثمانیہ(جس کا بانی عثمان خان تھا) کی بنیاد ۱۲۸۸ء میں پڑی اور اس وقت سے لیکر مصطفیٰ دوم کے زمانہ یعنی ۱۶۹۹ء تک خلافت عثمانیہ کا عہد عروج تھا۔یوں تو سلطنت عثمانیہ کے تمام ہی سلاطین کا دور بڑا زبردست رہا اور ان کے دور حکومت میں تعلیم وتعلم تعمیرات،نوآبادیات،مساجد کی تعمیر شفاخانوں کا قیام ہوتا رہا،سلاطین عثمانی جہاں ایک طرف علم دوست رعایہ پرور واقع ہوئے تھے وہیں زبردست سپاہی اور میدان کارزار کے شہسوار بھی تھے آرخاں کے زمانہ میں فوج اتنی منظم ہوئی کہ یہ فوج دنیا کی پہلی باقاعدہ فوج کہی جاتی ہے، یہ پیدل فوج تھی اور اس کی فوجی تربیت اتنی اچھی تھی کہ دنیا کی کوئی فوج اس کے مقابلہ میں جم کر لڑ نہیں سکتی تھی۔آرخاں ہی کے زمانہ میں خلافت عثمانیہ اتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ اس نے اپنا پہلا سکہ اسی زمانہ میں جاری کیا۔

آرخاں کے بیٹے مرداول کے زمانہ میں عثمانی سلطنت کا رقبہ ایک لاکھ مربع میل ہو گیا تھا یعنی آرخاں کے زمانہ سے پانچ گنا زیادہ۔محمد فاتح اپنے کارناموں میں سب سے بازی لے گیا۔اس کا سب سے بڑا کارنامہ قسطنطنیہ کی فتح ہے،اسی کے ساتھ محمد فاتح پہلا عثمانی حکمراں ہے جس نے بحری قوت کو بڑی ترقی دی۔محمد فاتح پہلا عثمانی حکمراں ہے جس کی شہرت دنیا میں دور دور تک پھیل گئی اس کے زمانہ میں سلطنت عثمانیہ جتنی بڑی حکومت پوری اسلامی دنیا اور یورپ میں کسی کی نہیں تھی۔محمد فاتح ہی وہ پہلا سلطان تھا جس نے پہلی مرتبہ سلطنت عثمانیہ کے لئے باقاعدہ قوانین مرتب کیے۔

سلیم اول کا عہد عثمانی سلطنت کا عہد آفریں دور تھا سلیم اول کے دور میں عثمانی ترک بلاشک وشبہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن چکے تھے۔اس کے بعد اس کا بیٹا سلیمان اعظم ۲۶ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا۔اس کے دور میں عثمانی سلطنت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔سلاطین عثمانی مین یہ سب سے بڑا اور سب سے باعظمت حکمراں ہوا ہے یورپ والے اس کو ذی شان کے لقب سے یاد کرتے تھے لیکن ترک اس کو سلیمان قانونی کہنا پسند کرتے ہیں۔سلیمان کی قواعد دان فوجیں جدید اسلحہ سے آراستہ تھیں۔اس نے جو زرعی اصلاحات کیں اس کی وجہ سے کسانوں کی حالت یورپ والوں کے لئے قابل رشک بن گئی تھی اور آسٹریا اور ہنگری کے کاشتکار ہزاروں کی تعداد میں اپنا ملک چھوڑ کر سلطنت عثمانیہ میں آباد ہو گئے تھے۔ترک سلاطین علم دوست اور علماء نواز واقع ہوئے تھے لیکن سلیمان اعظم نے علم وادب اور شاعری کی عثمانی خاندان میں سب سے زیادہ سرپرستی کی۔فضولی اور باقی جو ترکی زبان کے درجہ اول کے شاعر ہیں اس کے دور سے تعلق رکھتے تھے۔ابوسعید آفندی ابراہیم حلبی اس زمانہ کے مشہور عالم تھے جنہوں نے قوانین بنانے مین سلیمان کی بڑی مدد

کی۔اس کے عہد میں مدرسے، کتب خانے کثرت سے قائم کئے گئے، مساجد، باغ، پُل اور شفاخانے بھی بہت تعمیر ہوئے، استنبول کا بازار جہاں چھوٹی بڑی پانچ ہزار دکانیں تھیں جن میں معمولی چیزوں سے لیکر انتہائی قیمتی چیزیں بھی ملتی تھیں یہ اپنی قسم کا دنیا میں سب سے بڑا بازار تھا اور اپنی دلکشی کی وجہ سے دنیا میں مشہور بھی، جو سیاح بھی استنبول آتا اس بازار کو ضرور دیکھتا۔

سلطنت عثمانیہ کی قوت اور پائیداری کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا سیاسی، انتظامی اور فوجی نظام ٹھوس بنیادوں پر قائم تھا۔

زوال: ۱۶۸۳ء میں ویانا کے محاصرہ میں ناکامی کے بعد یورپی حکومتیں روس، آسٹریا، وینس اور پولینڈ خلافت عثمانیہ پر ٹوٹ پڑیں، ترکی کئی سال تک ان کا مقابلہ کرتا رہا، لیکن بالآخران کو شکست ہوئی اور ۱۶۹۹ء میں کارلوڈنر کے مقام پر ایک معاہدہ ہوا جس کے بعد یورپ میں ترکوں کی پیش قدمی رک گئی اور ہنگری بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا، لیکن ۱۷۷۴ء کے بعد ترکوں کا تیزی سے زوال شروع ہوگیا۔اب ان کو مسلسل شکستیں ہونے لگیں اوران کے مقبوضات ایک ایک کرکے ہاتھ سے نکلتے گئے۔

سلطنت عثمانیہ کے زوال کو روکنے کے لئے جن عثمانی سلاطین نے قابلِ قدر کوششیں کیں ان میں سلطان سلیم ثالث (۱۸۰۷ء) کا نام سرفہرست ہے، لیکن جاہل صوفیوں تنگ نظر علماء نے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے، مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی، سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کرکے اسلام کو خراب کررہا ہے، شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو بادشاہی کے لائق نہیں۔آخرکار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر کے قتل کر دیا گیا۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ رقمطراز ہیں: ''یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔''

مغربی قوتیں نہیں چاہتی تھیں کہ سلطنت عثمانیہ پھر ایک بڑی طاقت بنے چنانچہ روس، انگلستان اور فرانس نے مل کر حملہ کر دیا عثمانی بیڑے بالکل تباہ ہو گئے اور مجبوراً سلطان کو صلح کرنی پڑی، اندرونی بغاوتیں اور بیرون حملوں نے سلطنت عثمانیہ کو بالکل کمزور بنا دیا اور سلطان کے ہاتھوں سے رفتہ رفتہ اس کے مقبوضات نکلنے لگیا ورنوبت یہاں تک پہونچی کے فتوحات تو دور کی بات ہے خود اپنی زمین بچانا مشکل ہوگیا، ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو عبدالحمید خان دوم نے دستوری اساسی کا اعلان کیا اور دو ایوانوں پر مشتمل پارلیمنٹ قائم کی گئی ابھی ترکوں کی آئینی حکومت کا آغاز ہی تھا کی روس نے حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں یورپ میں جنوبی یونان اور کوہ بلقان کے درمیان مختصر سا علاقہ ترکوں کے پاس رہ گیا۔اب عثمانی ترکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تیونس پر اور برطانیہ نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کرلیا۔

روس سے جنگ کے غیر معمولی بہانہ بنا کر سلطان عبدالحمید خان ثانی نے پارلیمنٹ معطل کر دی اور تقریباً تیس سال مطلق العنان اور ایک آمر مطلق کی حیثیت سے حکومت کی اس میں شک نہیں کے اس مدت میں بیرونی سازشوں کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی ایک چپہ زمین بھی انہوں نے ہاتھ سے نہیں نکلنے دی۔ ترکی قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا انگریزوں نے کئی مرتبہ قرض کی ادائیگی کی شرط فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری رکھی لیکن سلطان نے اس پیشکش کو سختی سے رد کر دیا۔

سلطان نے قوم پرستوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے مجبور ہوکر ترکی میں دوبارہ ۱۹۰۸ء میں دستور بحال کر دیا جو ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست تک قائم رہی۔سلطان رشاد کے دور خلافت میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا اور اس کے بعد جنگ بلقان چھڑ گئی جس کی مغربی حکومتوں نے ترکی کے خلاف پشت پناہی کی جس کے نتیجہ میں استنبول سے ادرنہ تک کے علاقہ چھوڑ کر سلطنت عثمانیہ کے سرے یوروپی مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے، جنگ بلقان ختم ہوئی تو ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول چھڑ گئی جس میں ترکی کو زبردستی گھسیٹا گیا نتیجہ ۱۹۲۰ء میں اتحادی فوجیں استنبول

میں داخل ہوگئیں ساڑھے چار سو سال کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ سلطنت عثمانی کے دار الخلافہ پر غیروں کا قبضہ ہوا ہو۔اس واقعہ نے نہ صرف ترکی بلکہ ساری اسلامی دنیا کو غم وغصہ میں مبتلا کر دیا خلیفہ اسلام اب انگریزوں کے بس میں تھا۔اتحادی طاقتیں ترکی کے حصہ بخرے کر دینا چاہتی تھی لیکن اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال کی قیادت میں آزادی کی جنگ شروع ہو چکی تھی ۱۹۲۲ء کے آخر تک ترکوں نے تمام دشمنوں کو اناطولیہ سے نکال باہر کیا اور عبدالمجید کو خلیفہ منتخب کیا ،لیکن ۱۹۲۳ء کو بادشاہت ختم کر کے ترکی کو جمہوری ملک قرار دیا گیا اور مصفطیٰ کمال نے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت بھی ختم کر دی۔اس طرح خلافت عثمانیہ کا ۶۲۵ سال کے بعد خاتمہ ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ترکی سے خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد سے اب تک اس سو سالہ مدت میں ترکی میں بے حد تغیر وتبدل رونما ہوئے وہ ترکی جو آج سے سو سال پہلے اسلام کا مرکز تھا خلافت کے خاتمہ کے بعد اسلام وہاں ایسا اجنبی ہوا کہ صرف عربی الفاظ کے ساتھ اذان دینے کے جرم میں آٹھ لوگوں کو سزائے موت دی گئی اسلامی شعائر کو کھرچ کھرچ کے نکال دیا گیا اسلام کا نام لینا جرم ہوگیا بے حیائی عام کر دی گئی شراب وزنا سرکاری سرپرست میں انجام پانے لگے۔

وہ ترکی جو خلافت عثمانیہ کے دور میں بادشاہ تک متقی پرہیز گار عبادت گزار ہوتے تھے اور عوام اپنی صاف صفائی شریف مزاج اور ہمت وغیرت میں مشہور تھے ان سو سالوں میں ایک سے بڑھ کر ایک ظالم ڈکٹیٹروں کو جنم دیا اور عوام کو گناہوں کی ایسی لت لگا دی گئی کہ جو ترک عوام ایک وقت میں دنیا کی سب سے بہترین فوج مانی جاتی تھی جس سے جم کر مقابلہ کرنا تقریباً ناممکن سمجھا جاتا تھا اور جس کا دبدبہ پورے یورپ میں تھا وہ یورپ کا مرد بیمار کہلانے لگا ترک کو ایسی پستی میں دھکیل دیا گیا اور ایسے گڑھے میں پھینک کر ہزاروں من مٹی اس پر ڈال دئی گئی تھی کہ یہ ترک قوم پھر کبھی بھی اس گڑھے سے باہر نہ نکل پائے اور وہیں دم توڑ دے۔

لیکن یورپ کی یہ تمام تر کوششیں ایک صدی بھی مکمل نہیں کر پائیں کہ یورپ کا یہ بیمار مرد اور پستی میں ہزاروں من مٹی میں دبا ہوئی یہ ترک قوم پھر سے نئی تازگی اور نئی روح لیکر اٹھ کھڑا ہوا یورپ حیران ہے ہماری سو سالہ کوششیں کیسے ناکام ہوگئیں!!!!!!

وہ ترکوں کا سرخ ہلالی جھنڈا جو مراد اول کے زمانہ میں شروع ہوا تھا پھر سے اپنی پوری آن بان شان سے لہرا رہا ہے۔

ترک کے موجودہ صدر رجب طیب اردوغان کی حالیہ انتخاب میں زبردست کامیابی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ گزشتہ دہائیوں میں یورپ نے ترکی میں اسلام کو جو دیش نکالا دیا تھا ترک قوم نے اس کے جواب میں اب یورپ کو ہی دیش نکالا دیا ہے ،طیب اردوگان کی اس کامیابی سے پورا یورپ بوکھلا گیا۔اب الحمدللہ ترکی ہر اعتبار سے خود مختار اور ایک طاقتور ملک بن گیا ہے جس سے سارے یورپین ممالک سہم گئے ہیں اور ان کو خلافت عثمانیہ کا خوف پھر سے ستانے لگا ہے یہی وجہ ہے کہ یورپ تو یورپ بعض عرب ممالک بھی ترکی سے اتنے ڈرے سہمے ہیں کہ اس انتخاب میں اسلام پسند صدر طیب اردوغان کو ہرانے کے لئے لاکھوں لاکھ روپئے پانی کی طرح بہا دیا لیکن پھر بھی کامیابی نہیں ملی۔

ترکی میں رفتہ رفتہ ان تمام چیزوں میں اصلاح کا آغاز ہو چکا ہے جو اسلامی قوانین سے ٹکرا رہی ہیں قوانیں میں شق پر شقیں نکالی جا رہیں ہیں تاکہ وہ قوانین جو اسلام سے ٹکراتے ہوں ان پر عمل کرنا عوام کے لئے مشکل ہو جائے اور رہ اسلامی قوانین کی طرف رفتہ رفتہ بڑھنے لگیں،عوام بھی اسلام میں کافی دلچسپی لے رہی ہیں بلکہ اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو خلافت عثمانیہ کی واپسی کی امید لگائے ہوئے ہیں۔

مصادر ومراجع:

۱۔ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ،از۔ثروت صولت

۲۔تاریخ اسلام،از۔شاہ معین الدین ندوی

۳۔تنقیحات،از۔سید ابوالاعلیٰ مودودی

۴۔تعمیر حیات لکھنو

☆☆☆

□گوشۂ ترکی

ترکی کی اسلامی تحریک-ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر عنایت اللہ وانی ندوی
اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج کلہوتران، ڈوڈہ

ترکی مختلف اعتبارات سے متمدن دنیا میں امتیازی شان رکھتا ہے، جغرافیائی اعتبار سے یہ ایشیاء اور یورپ کے مرکز اور اور دونوں کے درمیان پُل کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا جنوب مغربی حصہ ایشیاء میں اور جنوب مشرقی حصہ یورپ میں داخل ہے، یہ چھ سو سال تک اسلامی سلطنت کا پایہ تخت اور خلافت عثمانیہ کا مرکز رہا ہے، چھ صدیوں سے زائد عرصہ تک اسلام کے محافظ رہنے والے اس ملک کو عالمی سازش کے تحت یک لخت اسلام سے بے گانہ کر دیا گیا، ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۳ء کو جدید ترکی کے بانی قوم پرست اسلام مخالف مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے سیکولر حکومت کا اعلان کر دیا، یوں صدیوں عالم اسلام کی قیادت کرنے والی ریاست اپنی مسلم شناخت سے یک لخت محروم ہوگئی، اسلامی قوانین کو سیکولر قوانین میں تبدیل کر دیا گیا، سرکاری اداروں میں اللہ اور رسول کا ذکر سیکولر آئین کے ساتھ بغاوت شمار کیا جانے لگا، جذبۂ قومیت کو ابھارا گیا، اسکولوں کے تعلیمی نصاب سے عربی رسم الخط کو مٹا کر لاطینی رسم الخط رائج کیا، مدارس پر پابندی لگادی، قرآن کا پڑھنا اور تعلیم دینا جرم قرار دیا، مسجدوں میں تالے لگا کر عربی میں اذان تک ممنوع قرار دی اور یورپ سے ہم آہنگ ہونے کے لئے فحاشیت، عریانیت اور رقص وسرور کے ادارے اور شراب خانے قائم کئے، عورتوں کے لئے پردہ ممنوع قرار دیا، مذہب سے نفرت کو عین سیکولرازم قرار دیا، اسلامی کیلنڈر کا بھی خاتمہ کیا، اسلام کے عائلی قوانین کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ سوئیس قوانین کو آئین کا حصہ بنایا گیا، تعدد ازدواج بھی ممنوع قرار دیا، فتح قسطنطنیہ اور اسلامی آثار کی سب سے اہم نشانی ''ایا صوفیہ'' کو مسجد سے عجائب گھر میں تبدیل کر دیا، اسلام اور مسلمانوں سے تعلق کی ہر نشانی کو مٹا کر ترکی کو مشرق سے کاٹ کر مغرب کا حصہ بنادیا، اسلام کا حلیہ بگاڑ کر ترک مسلمانوں کو صدیوں پر محیط ان کے عظیم دینی، علمی، تاریخی، ادبی وثقافتی ہر قسم کے فکر اسلامی کے عکاس ورثہ سے محروم کر دیا، بقول علامہ اقبالؒ:

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

لیکن قانون الٰہی کے تحت ہر عروج کے بعد زوال یقینی ہے، ۱۹۶۹ء میں جب ترکی نے عالم اسلام کے ازلی دشمن اور اس کے قلب میں واقع نام نہاد صہیونی ریاست 'اسرائیل' کو تسلیم کر لیا تو ترکی عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا انہوں نے ۱۹۵۰ء کے الیکشن میں ترکی کے اعتدال پسند رہنما عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی کو منتخب کر لیا، انہوں نے آتے ہی نہ صرف مساجد اور مدارس کے دروازے کھول دئے بلکہ عوام کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۵۹ء میں اسلام کو ایک بار پھر ترکی کا سرکاری مذہب قرار دیا، ترکی میں حسن البناء شہیدؒ کے فکری وارث، انقلابی فکر کے حامل اسلام پسند ترک مرد مجاہد پروفیسر نجم الدین اربکانؒ

(پیدائش:۲۹/اکتوبر ۱۹۲۶ء وفات: ۲۷/فروری ۲۰۱۱) نے ان اصلاحات کا بروقت فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۹/جنوری ۱۹۷۰ء کو 'ملی دفاع پارٹی' کی بنیاد رکھی، لیکن پارٹی کے اسلام پسند نظریات کی وجہ سے عدالت نے اسے غیر قانونی قرار دیا، پابندی کے باوجود اربکان کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے ۲۱/ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ایک دوسری سیاسی پارٹی 'ملی سلامت پارٹی' کے نام سے بنائی اور ۱۹۷۳ء کے الیکشن میں ۴۸/ارکان کے ساتھ مخلوط حکومت میں نائب وزیر اعظم منتخب ہوئے۔

اپنے دورِ اقتدار میں نجم الدین اربکان نے اسلامی بیداری مہم کے حوالے سے کافی کام کیا، مساجد اور مدارس میں اسلامی تعلیمات کے تعلق سے قانون سازی کی، خصوصا فوجی اداروں میں اسلامی تعلیم کو لازمی قرار دینا ان کا اہم ترین کارنامہ تھا، لیکن فوج کو یہ بات پسند نہیں آئی اس لئے اقتدار پر قبضہ کر کے 'ملی سلامت پارٹی' سمیت تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد کردی جو ۱۶/جولائی ۱۹۸۳ء تک برقرار رہی، تین سال بعد عوام نے پھر سے اربکان کی پارٹی کو اسلامی جذبہ کے ساتھ کامیاب کیا اور ۱۹۹۶ء تک وہ ۱۵۳/ارکان اسمبلی کے ساتھ ترکی کے وزیر اعظم بن گئے، مگر فوج نے ایک بار پھر اربکان کو ایک اسلامی نظم پڑھنے کے جرم میں اقتدار سے معزول کردیا، البتہ فوج کے مسلسل جبر کے ردعمل میں اسلام پسندوں کی حمایت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

اسی دوران اربکان کے ایک دست راست اور موجودہ صدر رجب طیب اردگان استنبول کے میئر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے، وہ محنت، ایمانداری، خلوص اور صلاح و صلاحیت کی وجہ سے عوام میں معروف ومقبول ہو چکے تھے اور عوام ان کی ذات میں اپنا مستقبل دیکھ رہی تھی، لیکن انہیں بھی ۱۹۹۷ء میں ایک اسلامی نظم پڑھنے کے جرم میں جیل جانا پڑا، سخت عوامی احتجاج کی بنیاد پر حکومت کو مجبورا انہیں رہا کرنا پڑا۔

باطل پرست طاقتوں کی جانب سے ہر ممکن کوشش اور ہر طرح کی منصوبہ بندی کے باوصف ترکی میں اتاترک کی مغربی تہذیب کے احیاء کا منصوبہ اللہ کے فضل سے ناکام ہو چکا ہے، اور اربکان نے جس اسلامی تحریک کی بنیاد ڈالی تھی اردگان کی قیادت میں ترک عوام اس تحریک کو منزل مقصود تک پہنچانے میں گامزن ہے، مختلف الیکشنوں میں عوام نے جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کو بھرپور مینڈیٹ دے کر بھاری اکثریت سے اس کے ارکان کو اسمبلی میں پہنچادیا اور پہلی بار ترکی کی تاریخ میں ملک کے وزیر اعظم اور صدر دونوں ایک اسلام پسند جماعت سے منتخب ہوئے۔

مخالف طاقتوں نے ہر محاذ پر اسلامی طاقت کو کچلنے اور دبانے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اسلام پسند نجم الدین اربکان کو پانچ مرتبہ مختلف ناموں سے نئی پارٹیاں بنانی پڑیں، یہ اربکان ہی کا حوصلہ وہمت تھی کہ بار بار کی پابندی اور قید وبند کے باوجود صبر کے پہاڑ بنے رہے، آشیانہ بار بار جلتا رہا مگر وہ ہر بار تنکا تنکا جمع کر کے نیا آشیانہ بناتے رہے، نجم الدین اربکان نے جو راستہ کھول دیا تھا لاکھ کوششوں کے باوجود نہ کوئی فوج اور نہ کوئی دوسری اندرونی وبیرونی طاقت اس کو بند کرسکی۔

ترکی کے موجودہ وزیر اعظم رجب طیب اردگان، نجم الدین اربکان کے تربیت یافتہ اور دینی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہیں، اسلامی غیرت وحمیت سے معمور ہیں، خود بھی دینی وفکری اعتبار سے کافی مضبوط ہیں اور پورے ملک میں تعلیمی، تربیتی، سیاسی اور فکری تمام میدانوں میں اسلامی بنیادوں پر کافی کام کر رہے ہیں، ترک عوام کی اکثریت اسلامی اعتبار سے نہایت بیدار اور اسلام کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہے، دینداری اور تدین میں بھی اور ڈسپلن میں بھی یہ قوم اپنی مثال آپ ہے، گزشتہ سال فوجی بغاوت کو کچلنے میں عوام نے جس جوانمردی اور بے خوفی کا ثبوت دیا ہے دنیا کی پوری تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر

ہے،اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ترکی میں اسلام پسندوں کو کس قدر عوامی حمایت حاصل ہے اور دینی بیداری پیدا کرنے میں وہاں کے اسلام پسندوں نے کس قدر کام کیا ہے۔

اپنے دور اقتدار میں اردگان نے جو سخت فیصلے لئے ہیں ان کے ان جرأت مندانہ اقدامات سے اسلام مخالف طاقتوں کی نیند حرام ہوچکی ہے خصوصا مسئلہ فلسطین کے حوالے سے فلسطینیوں کی حمایت اور اسرائیل کے ساتھ مزاحمت کے کردار نے انہیں ممتاز اسلامی قائد کی حیثیت سے معروف کردیا ہے، جب سے ترکی نے اپنی پالیسیاں تبدیل کی ہیں خاص طور پر یورپی یونین میں شمولیت کی بھیک مانگنے کے بجائے اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے، یا خلیجی بحران میں قطر کی حمایت کررہا ہے، فلسطین، مصر، شام، عراق، لیبیا، تیونس اور دیگر مسلم ممالک کے اسلام پسندوں کی مکمل پشت پناہی اور ان کو پناہ دینے کے اقدامات کئے ہیں، ایک مسلمان مرد مجاہد کی طرح فریڈم فلوٹیلا کے معاملہ پر اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا، بنگلہ دیشی حکومت کی جانب سے جماعت اسلامی کے رہنما مولانا مطیع الرحمٰن (شہید) کو پھانسی دینے پر اپنے سفیر کو بنگلہ دیش سے واپس بلا لیا، مغربی حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دینی غیرت وحمیت کا ثبوت دیا، برما کے درماندہ مظلوموں کا تعاون اور اس طرح کے بہت سے کام جن سے اسلامی اور انسانی جذبہ کی عکاسی ہوتی ہے، اس سے عالم اسلام میں ترکی اور اردگان کی اہمیت ومقبولیت بڑھتی ہی جارہی ہے، ماضی میں عالم اسلام کا مرکز رہنے والا یہ ملک پھر سے اسلامی قوت بن کر ابھر رہا ہے، اردگان اور ان کے اعوان وانصار کی مسلسل کامیابیاں اس کی غماز ہیں کہ ترک عوام اسلامی اقدار کا ازسرنو احیاء چاہتے ہیں، اور وہ دن دور نہیں کہ جب پھر سے خلافت عثمانیہ کی یاد تازہ ہو، وما ذالك على الله بعزيز۔

☆☆☆

''ہم ایسی نسل چاہتے ہیں جس کا ایمان اور عقیدہ پختہ اور مضبوط ہو، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان کسی ایک شعبہ میں نہیں بلکہ تمام شعبہ ہائے حیات میں آگے بڑھیں، ہم اپنے نوجوانوں کو اس فانی دنیا کی لذتوں میں ڈوبا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے، بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان دنیا کے ہر شعبے میں سب سے آگے کھڑے ہوں اور دنیا ان کے پیچھے کھڑی ہو، نوجوانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایمان کے بغیر زندگی ایسے ہی ہوتی ہے جیسے پانی کے بغیر صحرا۔''

(اردوغان)

□گوشۂ ترکی

کامیاب اردوغان

تحریر: دکتور علی صلابی، ترجمہ: مفتی اجمل ندوی

وہ ایسا کوئی مداری نہیں کہ سانپوں کو اپنے تھیلے میں میں جمع کرے اور نہ کوئی سپیرا ہے کہ بین اس طرح بجائے کہ سارے اژدہے ڈسنے کے بجائے اس کے سامنے رقص کرنے لگیں، اللہ نہ کرے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس انقلاب کا خاتمہ ہوجائے جس نے سارے انقلابات کو ناکام بنادیا یا صدارتی انتخابات اس کے بڑھتے ہوئے اثر کو روک دے یا وہ اس دار فانی سے ہی رخصت ہوجائے جس سے کسی کو مفر نہیں، لیکن اس نے انقلاب کی آخری کوشش بھی کر لی اور جدید ترکی حکومت کی آخری اینٹ بھی رکھ دی۔

ترکی میں اردوغان نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے ایسا انقلاب ہے جو از خود وجود میں نہیں آیا اور خود بخود منصۂ شہود پر نہیں آیا بلکہ اس کے لیے مسلسل جدوجہد ہوئی، وہ رفتہ رفتہ پروان چڑھا، انقلاب کی آندھی کا آغاز عوام کے ذریعہ سڑکوں پر احتجاج کے ساتھ شروع ہوتا ہے، اور سیاسی، سماجی، اقتصادی طور سے موجود نظام کو دوسرے نظام سے بدلنے کے لئے بسا اوقات یہ احتجاجات مسلح مقابلہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، یہ ایسی پرخار گھاٹی ہے جو ملکی طاقتوں اور صلاحیتوں کو کمزور کرنے کا ذریعہ اور کبھی ان ممالک کی تقسیم کا سبب بن جاتی ہے۔

لیکن طیب اردغان نے اس دشوار گذار گھاٹی کو عبور کیا اور فوجی انقلاب کی کوشش کے بعد پر خطر آپریشن کی کارروائی کر کے ترکی کے انقلاب کی تخم ریزی کی، اگر یہ کارروائی ناکام ہوجاتی تو ترکی اس مریض جسم کے مانند ہوجاتا جس کو ٹھیک کرنے کے بجائے گور وکفن کے حوالہ کر دیا جاتا ہے، لیکن ترکی ایک زوال پذیر حکومت اور فقر وافلاس کے دہانہ سے نکل کر ایک ترقی یافتہ اور قائدانہ صفت کا حامل ہوکر ترقی واقبال کی بلندیوں پر پہونچنے والے دیگر ممالک کے درمیان شانہ بشانہ کھڑا ہے۔

یہ ترقی کسی گیس پٹرول کے اکتشاف یا زمین سے نکلنے والی کسی معدنی اشیاء کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی یہ ترقی درحقیقت سائنسی، اقتصادی، سماجی وٹکنالوجی ڈپولپمینٹ سے ہوئی۔

اردغان نے سیاسی پہلو سے بھی لشکر کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا خاتمہ کیا اور ترکی کے صدر بننے کے بعد وہ ملک کے حقیقی فرنروا ہوگئے اور لشکر ترکی کو کسی بھی سیاسی کردار ادا کرنے سے برطرف کر دیا اور یہ ساری گرمیاں اور کاوشیں رفتہ رفتہ زیر عمل آئیں، اس کام کے لئے اردغان کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا جو پتلی سرنگ میں چلنے کے مرادف تھا، اردغان کی اس سعی پیہم کا ہدف یہ تھا کہ لشکر کو فوجی اتھارٹی سے ملکی حفاظت کے مقصد کی طرف منتقل کیا جائے اور ان کی سیاسی نظام پر بالادستی کے بجائے ایک منتخب صدر کی زیر قیادت نظام کی بالادستی حاصل ہو، لہذا فوجی اسٹاف کے چیف کی جگہ صدر ترکی کے پہلو کے بجائے دیگر وزراء کے برابر ہوگئی، کہ اس سے قبل اس کو صدر کے سامنے سلوٹ مارنے میں بھی نخوت ہوتی تھی۔

لشکر کے سابق بے جا اثر و رسوخ اور بے لگام تسلط کو دیکھتے ہوئے یہ ایک بہت بڑی انقلابی تبدیلی ہے، اردغان نے اتاترک کے مجسمہ کو توڑے بغیر اور اتاترکی جمہوریت کی مخالفت کئے بغیر اس کو مکمل طور پر ختم کر دیا، اس کی فضا خراب کر دی اور اتاترک کی جمہوریت اپنی حقیقت کھونے کے بعد ترکی میں مدفون ہوگئی۔ اور اردغان نے اسلام مخالف اتاترکی سیکولرازم کے نظریہ کو غیر جانبدار سیکولرازم کے نظریہ سے بدل دیا، اردغان نے حکومت میں اپنے اسلامی طریقۂ کار اور اصول شریعت کے نہج کو واضح نہیں کیا مگر اس نے ظلم واستبداد اور دینی بے راہ روی کی اکثر شکلوں ان پر قدغن لگا دی، مسلمان اتاترکی سیکولرزم کی وجہ سے جن کے شکار ہو رہے تھے۔

الغرض یہ کہ موصوف نے آوارگی کے اڈہ کو بند نہیں کیا لیکن اسلامی مدارس کے قیام کی اجازت دے دی، اس نے لادینیت پر روک نہیں لگائی لیکن حفظ قرآن واشاعت علم ودین کی فضا ہموار کی، اس نے حجاب پر پابندی نہیں لگائی مگر حجاب والی بچیوں کو کالجز و یونیوسٹیز میں ایڈمیشن کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

□گوشۂ ترکی

عربوں میں اردوغان کی محبوبیت کے اسباب

تحریر: محمد عایش ترجمہ محمد عالم ندوی

صدر رجب طیب اردوغان خلیج او رعرب ممالک میں زبردست مقبول ہورہے ہیں، ان کی مقبولیت کی ابتداء ترکی سے شروع ہوئی اوراب اس مرحلہ میں پہنچ چکی ہے کہ اہلِ عرب اب ان کو صرف ترکی کے کامیاب لیڈر کے طور پر نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ ان کو امت اسلامیہ کا قائد مان رہے ہیں۔ ایک بڑا طبقہ اس طرف اپنی توجہ مبذول کیے ہوئے ہے کہ آخر اردوغان کی اس مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؛ حالانکہ اردوغان کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد وہ ہے جو ترکی زبان تک نہیں جانتی کہ یہ الزام تھوپ دیا جائے کہ یہ سب ذرائع ابلاغ اور میڈیا کی مہربانیاں ہیں، اردوغان سے ایسے واقعات منسوب کئے جارہے ہیں جو تاریخ میں ہم عمر بن عبدالعزیز اور صلاح الدین ایوبی کے تعلق سے پڑھتے ہیں، حالانکہ جو باتیں عوام میں رواج پارہی ہیں ان میں سے اکثر محض خیالی، یا بڑھا چڑھا کر پیش کی ہوئی ہیں، بعض چیزوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی عثمانی خلیفہ ہے یا سلطان عبد الحمید ثانی کا جانشین ہے، جو عثمانی اقتدار پر ۳ دہائیوں سے قابض ہے، اردوغان اور عبدالحمید الثانی کے درمیان ایک بنیادی چیز مشترک ہے، جس کی وجہ سے اردوغان کو دیکھ کر لوگوں کے ذہن و دماغ میں خلافت کا تصور قائم ہوجاتا ہے، عبدالحمید ثانی جس سیاست پر یقین رکھتے تھے وہ مسلمانوں کے باہمی ربط وتعاون پر قائم تھی، اردوغان بھی اسی سیاست کو پھر سے مضبوط کرنا چاہتے ہیں، عبدالحمید ثانی کا کہنا تھا کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں ان کا باہمی مربوط رہنا اشد ضروری ہے، فاصلوں کے بجائے دن بدن ہمارا ایک دوسرے سے قرب بڑھنا چاہیے، مسلمانوں کی وحدت اگر ٹوٹتی ہے تو پھر ہمیں اپنے محفوظ مستقبل کی امیدیں ترک کردینی چاہئیں، ٹھیک یہی فکر اردوغان کے اندر سمائی ہوئی ہے اور وہ اسی پر کاربند ہیں۔

اردوغان کی محبوبیت کے چند اسباب:

اول: جس وقت ۲۰۰۲ء میں ان کی پارٹی نے ترکی میں اقتدار سنبھالا، اس وقت ملک کی اقتصادی حالت ابتری کا شکار تھی، لیکن ۲۰۰۲ سے ۲۰۱۱ کے درمیان ملک کی اقتصادی ترقی کی شرح میں ٪۵۲ کا اضافہ ہوا، اور گزشتہ چھ سالوں کے اندر اس تناسب میں ٪۶۷ کا اضافہ ہوا ہے۔

ترقی کے اس تناسب نے ترکی کو G-20 میں شامل کردیا، یعنی اردوغان کے سترہ سالہ دورِ حکومت نے ترکی کو عالمی اقتصادی منڈی میں سترہویں مقام پر پہنچادیا، جس کا شہریوں کی فلاح و بہبود اوران کی روزمرہ کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔

دوم: ترکی کی تاریخ میں اردوغان اوران کی پارٹی نے یہ بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ حکومت میں فوج کے عمل دخل اوراس کی طاقت کوختم کردیا۔ اس مبارک عمل نے ملک کو ایک بڑے فساد سے نجات دی، حالانکہ بہت سے عرب ممالک اس کا اب بھی شکار ہیں کہ فوج کا ایک جنرل اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پارلیمانی حکومت کو تحلیل کردیتا ہے۔

سوم: اردوغان کا تعلق دیہات کے ایک غریب خاندان سے تھا، رزق اور معیاری زندگی کی تلاش میں یہ غریب خاندان استنبول آیا، ابھی اردوغان کا بچپنا ہی تھا کہ حالات نے اردوغان کو استنبول کی گلیوں میں تربوز اور ترکی کیک جس کو سمیط کہا جاتا ہے بیچنے پر مجبور کر دیا، تاکہ گھر کی ضروریات کو پورا کرنے میں والد کو کچھ سہارا ملے، اور کچھ خوشحال زندگی نصیب ہو جائے۔

عرب دنیا نے ان حالیہ انقلابات سے پہلے اور ان کے بعد کسی ایسے صدر کو نہیں دیکھا جس کا تعلق اس قدر غریب خاندان سے ہو بلکہ جتنے صدور ہوئے ہیں سب کے سب محلات کے شہزادے اور ریشم و دیباج کے پروردہ ہیں، اور پھر انہوں نے اپنے فاسد حلقہ یاراں کے ذریعہ قوم پر اپنا اقتدار جمایا ہے۔

چہارم: اردوغان نے تین ملین شاہی پناہ گزینوں کے لئے اپنے ملک کے دروازہ کھول دیئے، مزید لاکھوں مصریوں، شامیوں اور لیبیا کے رہنے والوں کو اپنے ملک میں جگہ دی، اس کے علاوہ ان بے شمار عربی لوگوں کو پناہ دی جن کی زندگی کا دائرہ حیات ان کے حکمرانوں نے ان پر تنگ کر دیا تھا۔

پنجم: اس وقت ترکی میں ۷۲ ہزار غیر ملکی طلباء مقیم ہیں، جن میں اکثریت اہل عرب کی ہے، اور ان میں کی ایک بڑی تعداد حکومتی گرانٹ پر ہے، جبکہ عرب ممالک اپنے ملک کے طلباء کو بھی یہ سہولت دینے میں ناکام ہیں، گزشتہ چند سالوں میں ترکی جامعات میں اسکالرشپ حاصل کرنے کے لئے تقریباً ۸۳ ہزار درخواستیں جمع ہوئی ہیں۔ جبکہ ہم کسی عرب حکومت کے تعلق سے نہیں جانتے کہ کسی بھی طور پر (یعنی وظیفہ یا بلا وظیفہ) طلباء کی اتنی تعداد کو جمع کرنے میں اپنی دلچسپی دکھائی ہو۔

چھٹا سبب: عرب ممالک کے زیادہ تر شہری بلا کسی پابندی یا ویزے کے ترکی میں داخل ہوتے ہیں جبکہ کوئی عرب شہری کسی دوسرے عرب ملک میں بلا کسی ضرورت اور ویزے کی پیچیدہ رکاوٹوں کو جھیلے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔

ساتواں سبب: جب اسرائیل نے سمندری راستہ کے ذریعہ ترک باشندگان پر حملہ کیا اور بہت سوں کو ہلاک کر ڈالا، اس وقت تل ابیب اور انقرہ کے درمیان پانچ سال تک کے لئے تعلقات ختم ہو گئے تھے، اس کے برعکس اسرائیل نے عرب کے دارالحکومت میں گھس کر عربوں کا قتل عام کیا تو صرف پانچ مہینہ کے لئے عرب-اسرائیل تعلقات رکے اور پھر اپنی حالت پر لوٹ آئے۔

آٹھواں سبب: اردوغان کا جمہوری انداز۔

ایک ایسا شخص جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو، دہشت گردی جیسے جرائم میں ملوث ہو (صلاح الدین سرطاش) وہ صدارتی انتخابات میں حصہ لیتا ہے اور اقتدار تک پہنچے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے، اس حد تک ایسے شخص کو آزادی دی جاتی ہے، جبکہ عالم عربی کے حالات بالکل اس صورت حال کے خلاف ہیں، کہ اچانک صدر کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے، اس کو گرفتار کر لیا جاتا ہے، لاپتہ کر دیا جاتا ہے۔ ترکی میں ایک قیدی صدر بن سکتا ہے، جبکہ عرب کا جمہوری نظام یہ ہے کہ کسی بھی صدر کو معزول کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جائے اور پھر گوشہ گمنامی اس کا مقدر ہو جائے اور پھر حالات ایسے بنا دئے جائیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنیاد پر اردوغان عرب عوام کے منظورِ نظر ہوتے جا رہے ہیں، ترکی پھر سے ان کی امیدوں کا مرکز بن رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے ترکی کے الیکشن میں اپنی پوری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ایک طوفان ہے جس کے رخ سے کوئی واقف نہیں، یہ اندیشہ اس لئے تھا کہ انتخابات پورے منصفانہ طریقہ پر کرائے گئے، یہ انتخابات اس لئے بھی اہم تھے کہ اس سے عوام کے رجحان کا صاف اندازہ ہو گیا۔

☆☆☆

□ گوشۂ ترکی

اردوغان کی کامیابی مخالفین کی نظر میں

تحریر: مصطفیٰ ابوالسعود ترجمہ: فیض الاسلام ندوی

اردوغان کی کامیابی پر ہم کیوں خوش ہیں؟: اردوغان کی کامیابی صرف ترکی ہی میں موضوع بحث نہیں ہے، بلکہ ساری دنیا کی نگاہیں ترکی اور اس کے انتخابات پر جمی ہوئی تھیں، لہذا جب اردوغان فتح سے ہمکنار ہوئے تو ترکی اور ترکی کے باہر سبھی اسلام پسند کمزور لوگوں نے خوشی منائی، اور ساتھ ہی یہ تمنا بھی ظاہر کی کہ اگر عالم عربی میں بھی ایک اردوغان ہوتا تو کمزوروں کی مدد کرتا، بہرحال ان لوگوں نے خاص طریقوں پر اس خوشی کو منایا، ان رسائل، مضامین، تصویر، ویڈیو کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے جن کے ذریعہ قلبی خوشی کا اظہار کیا گیا تھا، ایسے شخص کی جیت پر جو ہر برائی کے سامنے ڈٹ کر پوری قوت سے کھڑا رہتا ہے۔

دوسری طرف عرب وعجم کے بہت سے منافقین، مخالفین، معاندین اردوغان کے سفینہ کے ڈوب جانے کا انتظار کر رہے تھے، تاکہ وہ ان کی ہار پر بھرپور خوشی کا اظہار کر سکیں، لیکن جب قومی بیداری کی لہر ان کے خلاف اٹھی تو پھر انہوں نے اردوغان پر بغض وحسد، کینہ وعداوت کے تیر چلائے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جمہوریت اور حقوق انسانی کے احترام کا بھی اظہار کر رہے تھے، لیکن ان کے اس نظریہ وفکر اور ان کے برتاؤ میں اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا کہ زمین سے آسمان کا۔

یہ حق ہے کہ اردوغان ان مخالفین کے لئے کبھی بھی نرم نہیں پڑے، جو ان کی سیاست کو ناپسند کرتے تھے، اس لئے نہیں کہ ان کی سیاست بانجھ ہے، یا وہ خود کرپٹ سیاستداں ہیں، بلکہ اس لئے کہ جب تک ان کے لئے ممکن ہوتا ہے تب تک وہ خودمختاری اور آزادی کی پالیسی اپناتے ہیں، وہ کبھی بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے کو پسند نہیں کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دلوں میں اپنی محبت باقی رکھنے کے لئے بھی انھوں نے ایسے لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ نہیں برتا، جنہوں نے سازشیں رچ کر، مخالفین کا ساتھ دے کر، داخلی و خارجی بحران پیدا کر کے اردوغان کو حکومت سے بے دخل کرنا چاہا، لیکن اللہ کی مدد، امریکہ اور اس کے چمچوں کی سازشوں کے سامنے سد سکندری بن گئی۔

امریکی پارلیمنٹ کے رکن ''آدم شیف'' نے اپنی ٹویٹر پر ٹوئیٹ کے ذریعہ یہ اپیل کی کہ کوئی بھی اردوغان کو جیت کی مبارک باد نہ دے''، آخر کیوں؟ اس لئے، کیوں کہ اس کے خیال کے مطابق ''اردوغان نے اپنے مخالفین کو گرفتار کرا کر، اور ذرائع ابلاغ پر پابندی لگا کر الیکشن میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اور ترکی کے رویے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ دنیا میں کہ اب جمہوری نظام کو دشمنوں کی سازشوں کے لئے پیش کر دیا گیا ہے''۔

صہیونیت بھی اردوغان کی حیثیت ومقام کو کم کرنے میں پیش پیش تھی، اور وہ اردوغان کے بعد کے مرحلے کی تیاری میں تھی، اس کی کوشش تھی کہ وہ از سر نو اپنی سیاسی پالیسی نافذ کرے، جس کا مقصود یہ ہے کہ ترکی کو حماس وغیرہ کی مدد کرنے سے روک دیا

جائے۔

صرف اسرائیل کی ناجائز حکومت ہی نہیں ہے، جس نے اردوغان کی جیت پر توہین وذلت کو محسوس نہیں کیا، بلکہ عالم عربی میں جمہوریت، لبرلزم، حقوق انسانی کے بڑے بڑے علمبردار اور وکلاء اس غم میں اسرائیل کے برابر کے شریک ہیں، ان سب نے پوری کوشش کے ساتھ شکوک وشبہات، اور مندرجہ ذیل سوالات کا سہارا لے کر لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا، تاکہ اردوغان کی کامیابی کی ضرورت اور اہمیت کم ہوجائے۔

اول۔ اردوغان کی کامیابی مطلق العنان طرز حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے ہے۔

دوم۔ ترکی الیکشن کو قبل از وقت کرانا یہ اردوغان کی ٹیکنک تھی۔ اپنی اس پالیسی کی تجدید کے لیے، جس کے بارے میں بعض لوگوں کا گمان ہے کہ وہ فوجی انقلاب کے قائدین کے خلاف کارروائیوں کی وجہ سے کمزور پڑ گئی تھی۔

سوم۔ انتخاب اس ایمرجنسی میں ہوئے جسکو حکومت نے بغاوت کے وقت سے نافذ کیا تھا۔

چہارم۔ ترکی میں فسق و فجور کو راہ دینے والے ٹھکانے، اور منشیات کے اڈے موجود ہیں۔

پنجم۔ ترکی کے اسرائیل کے ساتھ مضبوط روابط ہیں، ان تمام چیزوں کی موجودگی میں اردوغان اسلامی نظام کا دعوی کیسے کر سکتے ہیں۔؟

ان نظریات کو پیش کرنے والوں کی راست بازی اور حسن نیت پر ہم یقین کرتے ہوئے کچھ سوالات کرتے ہیں؟

اول۔ ہم عالم عربی میں رہتے ہوئے آزادی کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں، اسلئے کہ کبھی بھی ہمیں اپنی مرضی کے مطابق ایک کام انجام دینے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ اب موازنہ کیجیے ترکی کی ڈکٹیٹر شپ کا۔

دوم۔ ترکی انتخابات کے قبل از وقت ہوجانے کی وجہ سے اتنی حیرانگی کیوں ہے؟ کیا یہ سیاسی طریقہ کار نہیں ہے؟ کیا وہ صہیونی حکومتیں جن سے تم رات دن محبت کا دم بھرتے ہو اس سیاسی طریقہ کار کو اپنا کر الیکشن قبل از وقت نہیں کراتیں؟ پھر ذرا یہ بتایئے عربی ممالک میں آزادی سے لے کر اب تک کتنی بار شفاف انتخابات ہوئے ہیں؟

سوم۔ ایمرجنسی کا نفاذ۔ کیا ہم نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایمرجنسی حالات میں نہیں گزارا؟

چہارم۔ اسی کے ساتھ یہ بھی شکایت ہے کہ اہل وطن کے لئے امن وسلامتی، خصوصا کرپشن، بگاڑ کو روکنے کے لئے اب تک نہ کوئی بیداری مہم چھیڑی گئی، نہ کوئی لائحۂ عمل تیار ہوا؟ کیا وہ بھول چکے ہیں یا انہوں نے بھلا دیا ہے کہ ہمارے سارے عرب ممالک کرپشن کی مختلف اقسام میں گرفتار ہیں۔

پنجم۔ اگر ترکی اسرائیل کے تعلقات کی بات ہے، تو عالم عرب کے صہیونی حکومتوں سے کھلم کھلا مضبوط روابط کس عنوان کے تحت داخل ہیں؟

ترکی میں انتخابات کی شفافیت اور جمہوریت کی گواہی تمام لوگ دیتے ہیں۔ اور ایمرجنسی نافذ کرنے کا فیصلہ ملکی ضرورت کے تحت تھا، یہ حاکم کی خواہش یا مزاج کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ حالات نے اس فیصلہ پر مجبور کیا۔ اور اس کے باوجود ترکی ترقی کرتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ اس کے برعکس ہمارے عالم عربی میں نہ انتخابات ہوئے ہیں، اور نہ ہی جمہوریت ہے۔ اور ابھی بھی ایمرجنسی جیسی صورت حال ہے۔ اور پھر ترقی بھی صفر ہے۔

اخیر میں ان لوگوں کو یاد دہانی کراتا چلوں جو جمہوریت کے حق میں لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں، اور حقوق انسانی کے ترانے گنگناتے ہیں کہ ان کا، ان کی قوم کا، ان کے وطن کا انجام تبھی سلامت رہ سکتا ہے جب ان کی فکر اور ان کے طرز عمل میں یکسانیت پائی جائے گی انھیں چاہیے کہ وہ نظریات اور عمل کے تضاد سے بچیں۔

☆☆☆

''رجب طیب اردوغان''

از: ڈاکٹر راغب السرجانی

ترجمہ وتعلیق: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

اردو میں ایک نئی کتاب

''رجب طیب اردوغان''

از: مولانا نذر الحفیظ ندوی
صدر شعبہ عربی، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو

اسلامی دنیا کے لیے وہ سال انتہائی منحوس اور تاریک سال تھا جب صدیوں سے روشن اسلامی خلافت کا چراغ استعماری طاقتوں نے بجھا دیا، یہ اسلامی تاریخ میں ایسا تاریک دن تھا جس کی مثال صرف تاتاری حملہ میں ملتی ہے، اس کے بعد سے تو اسلامی دنیا کی تمام خصوصیات اور اس کی مخصوص شناخت کے خلاف مہم چل پڑی اور گدھ کی طرح اس پر سب لوگ ٹوٹ پڑے، لیکن اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں قرآن مجید اور اسلامی تاریخ پر نظر رکھنے والے علماء اور دانشوروں نے جن میں علامہ اقبال اور سید ابوالحسن علی ندوی سرفہرست ہیں یہ پیشین گوئی کی کہ ایک نہ ایک دن یہ چراغ پھر روشن ہوگا اور تاریکیاں کافور ہونگی، علامہ اقبال نے کہا تھا

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی ذہن ھندی نطق اعرابی

اور مولانا ابوالحسن علی ندوی نے وہاں ترکی میں اسلامی بیداری کے آثار کو دیکھ کر یہ فرمایا تھا کہ اسلام کا دور پھر واپس آرہا ہے، ان کی مشہور ومعروف کتاب تاریخ دعوت وعزیمت اور دوسری تصنیفات کے ترجمے ترکی میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھے گئے، تقریبا نصف صدی کے عرصہ میں مولانا ابو الحسن علی ندوی مولانا سید ابوالاعلی مودودی، سید قطب، علامہ یوسف القرضاوی کی کتابوں سے نئی نسل نے فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ اس خاک کی ڈھیر سے اسلامی بیداری کی لہر اٹھی، آخر میں رجب طیب اردوغان عالم اسلام کے افق پر مہہ کامل بن کر طلوع ہوئے۔

عزیز گرامی ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی نے رجب طیب اردوغان کے نام سے ایک مصری مصنف کی کتاب کا ترجمہ اور تعلیق کے ساتھ جو کتاب پیش کی ہے وہ ایسے وقت میں سامنے آئی ہے جب طیب اردگان کو بے نظیر کامیابی ملی ہے اور استعماری طاقتوں کو جس نے حیرت میں ڈال دیا ہے، اردوغان کی یہ کامیابی مسلسل جد وجہد، ایثار وقربانی اخلاص و بلند نگاہی سخن دلنوازی اور حکیمانہ طرز عمل کے نتیجہ میں ملی ہے، ان کی یہ کتاب جو اصلا ترجمہ ہے عربی زبان میں شائع شدہ کتاب کا لیکن ان کے معلومات افزا نوٹ اور تجزیے اور تبصرے اور ضمیمہ نے ایک مستقل کتاب تیار کردی ہے، اس کتاب میں ترکی سیاست کا ہر پہلو سے تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، طیب کی بے نظیر کامیابی سے اس کتاب کے مندرجات کی تصدیق ہوتی ہے۔

☆☆☆

تاثرات برکتاب

''رجب طیب اردوغان''

محمد مولانا علاء الدین ندوی
(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

کسی یورپین فلسفی کا مقولہ ہے: ''بڑے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ دنیا کے سارے احمق (اس نے گدھے کا لفظ استعمال کیا ہے) اس کے خلاف ایکا کر لیتے ہیں اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں''۔ اس فلسفی کی بات کسی کو اپیل کرے نہ کرے تاہم اردوغان کے بارے میں راقم کو ضرور اپیل کرتی ہے۔

اردوغان جس ڈھب سے اور جس بصیرت مندی اور حکمت عملی سے اپنے ملک کو آگے لے جا رہے ہیں، بین الاقوامی تناظر میں انہوں نے انسانیت نوازی اور عدل پروری کی جو پالیسی اپنائی ہے، پھر ان کے اندر قومی خودداری اور ملی غیرت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ مجھے اردوغان کو ''بڑا'' ماننے پر مجبور کرتا ہے۔

اگر سوال ہو کہ اردوغان کیا چاہتے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ تو چند لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ..... وہ اپنی، اپنے ملک کی اور اور سارے آزاد ممالک کی خود مختار سیاسی پالیسی چاہتے ہیں اور اس میدان میں وہ مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں، وہ شکوہ ترکمانی اور عالم اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیافت چاہتے ہیں، اپنے ملک کی حد تک ان کی حکیمانہ اور مخلصانہ جدو جہد کے مبارک اثرات نظر آنے بھی لگے ہیں، وہ اپنے ملک کے ہر فرد کو ملکی ترقی کے سفر میں شریک سفر دیکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد میں وہ پیہم کامرانیاں حاصل کر رہے ہیں، وہ اپنی معیشت کو آزاد اور اپنے ملک کو ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہیں اور حقائق کہتے ہیں کہ اس راہ میں وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں، زراعت، صنعت و حرفت، تعلیم و تربیت اور فنی مہارتوں کے میدان میں وہ فتوحات پہ فتوحات حاصل کر رہے ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ غلامی کی بدترین سوچ سے عالم اسلام کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، وہ غیرت، عزت نفس، خودداری، خودارادیت، انسانیت کی توقیر، عالمی امن اور بین الاقوامی سطح پر منصفانہ نظام کی بالا دستی چاہتے ہیں اور ان میدانوں میں ان کی پیش قدمی جاری ہے۔

کئی دہائیوں کے بعد عالم اسلام میں ایک ایسا مرد مجاہد ابھرتا نظر آ رہا ہے جو کفر و باطل اور غلامانہ ذہنیت کی خوفناک تاریکیوں اور مہیب آندھیوں میں چراغ رہ گزر بنا منزل کی طرف رواں دواں ہے، اس نے اپنی سوجھ بوجھ اور بصیرت و حکمت سے کئی بڑے بڑے کام کئے ہیں، جس کا اعتراف بین الاقوامی سطح پر بھی ہوا اور ملکی سطح پر بھی آفریں آفریں کی صدائیں گونجتی رہتی ہیں۔

میں اس کی عظمت، اس کی سچائی، اس کے مومنانہ قلب و جگر، اس کی ہمت و جواں مردی، اس کے یقین محکم، اس کے عمل پیہم، اس کی دردمندی اور انسانیت نوازی، اس کے لاہوتی پرواز اور اس کی عقابی شان کو سلام کرتا ہوں۔

اپنی پرانی عادت کو دہراتے ہوئے مسلمانوں کی مختلف ٹولیوں نے اردوغان کے بارے میں افراط و تفریط کے گڑھے

میں گرنا شروع کر دیا ہے، کوئی اسے عصر حاضر کا عمرؓ کہہ رہا ہے، تو کوئی اسے بدی اور شر کا محور بتا رہا ہے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس ملت کی فکری سوچ ''عوامی سوچ'' میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے، بڑے بھی بہت جلد عوامی سوچ کے گدلے پانی میں بہہ جاتے ہیں، گروہی عصبیت، جذباتیت اور نفسانیت کے شکار ہو جاتے ہیں، متانت وسنجیدگی اور کسی مسئلہ کے مالہ وماعلیہ پر غائرانہ و محققانہ نظر ڈالے بغیر بے سروپا باتیں کرنے لگتے ہیں۔

''رجب طیب اردوغان'' کے مترجم کا اپنے ضمیمہ میں کہنا ہے:

''عقل بھی محو تماشا ہوتی ہے جب ایک طرف کچھ لوگ دوغلی پالیسیوں کے حامی نظر آتے ہیں، تو دوسری طرف ایک طبقہ احیائے خلافت کے پر زور مطالبات دہرانے لگتا ہے اور سوال پر سوال داغنے لگتا ہے، یہ کیوں نہیں کیا؟ اور وہ کیوں نہیں کیا؟.....اس طبقے کے لوگ اس سے صرف نظر کر جاتے ہیں کہ اردوغان نے اپنوں کے نفاق اور غیروں کی دشمنی کی سازشوں کے نرغے میں ہوتے ہوئے بھی ترکی کو مادی اور مذہبی ہر دو اعتبار سے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ اب لوگ کچھ اور ہی امید لگانے لگے ہیں، اگرچہ میری نظر میں اس طرح کی امیدیں یا تو قبل از وقت یا عجلت پسندی میں کئے گئے تجزیے کے مرادف ہے، یا فی الحال یہ محض خام خیالی ہے، البتہ خلافت کی تمنا کوئی معیوب چیز نہیں، خدا نے اس امت کو پیدا ہی اسی لئے کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک اردوغان نے جو کچھ کیا ہے وہ معاشی ترقی کے سہارے ہی کیا ہے، جس کے سبب ترکی کے سیکولر عوام بھی اردوغان کو ووٹ دینے سے پیچھے نہیں رہتے۔

.....اردغان کے ناقدین میں ایک طبقہ یہ بھی سوال کرتا ہے کہ اردوغان اسلامی جمہوریہ، یا خلافت اسلامیہ کا اعلان کیوں نہیں کرتے، ظاہر ہے کہ عالم اسلام اور عالم عرب میں بہت سے اسلام پسند لوگوں کی یہی خواہش ہے، مگر ترکی کے احوال اور جو ترکی اور استبدادی سیکولرزم اردوغان کو اپنے پیش رووں سے وراثت میں ملا تھا، اس کے پیش نظر یہ سوال سطحی نظر آتا ہے .....اردوغان جب اقتدار تک پہنچے تو ان کو جو ترکی وراثت میں ملا تھا، اس کی بنیاد اس اتاترک نے رکھی تھی جو کسی دین و عقیدہ کا قائل نہیں تھا، جس نے مصحفِ مقدس کو شیخ الاسلام کے سر پر دے مارا تھا، اردوغان کو وراثت میں مغرب اور ناٹو سے ۶۰۰ معاہدے ملے تھے، امریکہ کے ذریعہ جاسوسی کرنے کے دسیوں اصول وراثت میں ملے تھے، جس میں کسی ترک حتی کہ فوجی جرنیلوں کو بھی رخنہ ڈالنے کی اجازت نہیں تھی .....ان سب کے باوجود حکمتِ عملی اور تدریجی روش کے ساتھ انہوں نے فکر بدلنے اور دلوں کو فتح کرنے کی جو طرح ڈالی اور جہاں تک پہنچے وہ حیرت انگیز ہے'' (رجب طیب اردغان ص۲۹۳-۲۹۶)

اردغان اپنے وقت کا عمرؓ نہیں، کیونکہ عمرؓ کے کے زیر حکمرانی جو مسلم رعایا رہتی تھی اس کے پاسنگ بھی تو آج کے مسلم رعایا نہیں ہے، اردوغان وقت کا نورالدینؒ زنگی اور صلاح الدین ایوبیؒ بھی نہیں، کیونکہ آج ہم میں وہ جذبۂ حریت، وہ جذبۂ سر فروشی اور وہ جذبۂ جہاد بھی تو نہیں، تو کیا ہواؤں پہ خلافت کی بنا رکھی جائے گی، بس جو کچھ ہے وہ یہ کہ اردوغان عالم اسلام کے حکمرانوں میں سب سے بہتر اور قابل قدر شخص ہیں، وہ اسلام کے ایک سپاہی اور انسانیت کے خیر خواہ ضرور ہیں ۔

ہم یوسف قرضاوی کے الفاظ کی تائید بھی کرتے ہیں اور انہیں دہرانا بھی مناسب سمجھتے ہیں:

''اے اردغان! اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا کہ آپ حق بولتے ہیں اور حق کی تائید کرتے ہیں، آپ ناداروں کا سہارا ہیں، مظلوموں کے مددگار ہیں، بے سہاروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی میں پیش پیش رہتے ہیں اور نیک کاموں میں مالی تعاون کرتے ہیں'' (حوالۂ سابق ص۲۷۶)

عالم اسلام کے حکمرانوں کی طرح سے اردوغان اپنے ہی بھائیوں اور اپنے ہی شہریوں کو زک تو نہیں پہنچا رہے ہیں، وہ مغرب کے طاغوتوں کی چوکھٹ پہ خود بھی جبہ سائی نہیں کر رہے ہیں نہ ہی اپنی قوم کو ذلت کی زندگی جینے پر آمادہ کر رہے ہیں، اردوغان ملکی سرمایہ پر کنڈلی مار کر بیٹھ تو نہیں گئے ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک کے وزیر عظم کو ضیاء الحق کے بعد اللہ نے کتنا موقع دیا، انہوں نے اپنے ملک کی کیا امیج بنائی اور ملک کے عوام کے ساتھ کون سا انصاف کیا؟

''دیکھنا تو یہ ہے کہ اللہ تعالی اردوغان سے کس قدر کام لیتا ہے اور اس ربِ کائنات کی کیا مرضی ہے، جو تمام رازہائے سربستہ اور اور ہر کام کی مصلحت سے واقف ہے.....ہم تو بس خیر کے طالب اور خیر کے لئے دعا گو ہیں'' (حوالۂ سابق ص ۳۰۶)

میں ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی کے بر وقت منظر عام پر آنے والے اس قیمتی ترجمے کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت پسند انسانوں پر بڑا احسان کیا کہ اس دستاویز کا ترجمہ کر دیا اور اس میں قابل قدر اضافے بھی کیا۔ میں ہر طبقے کے مسلمانوں سے درخواست کروں گا کہ اِسے پڑھیں، وہ بھی اِسے پڑھیں جنہیں کسی وجہ سے اسلام سے الرجی ہے اور انسانیت کے تناظر میں اردوغان کے کاموں کا جائزہ لیں اور انصاف کی روش پر قائم رہتے ہوئے اس کا تنقیدی مطالعہ کریں، وہ بھی ضرور پڑھیں جو اسلام کی ترجمانی اشخاص اور کسی خاص ملک کے حوالے سے مصلحت اندیشی کی غرض سے کرتے ہیں اور جس کو ''مخالف'' سمجھتے ہیں اس کے ہر مثبت قدم پر پانی پھیر دیتے ہیں، وہ اسلام پسند بھی اس کتاب کو غور سے پڑھیں، کیونکہ اس میں ان کی دلچسپی کا بہت سامان ہے، وہ بھی غائرانہ اور مخلصانہ اس کا مطالعہ کریں جو پچھلی دہائیوں میں اسلامی بیداری (صحوہ اسلامیہ) کے علمبردار رہے اور حالات نے ان کو روپوش کر دیا، اِن کے لئے اس میں سرمۂ بصیرت اور گنجینۂ حکمت ہے کہ آخر کیوں اپنوں کے شور شرابے اور عالمی سازش کے نتیجے میں ان کا مشن فیل ہوا اور اردوغان نے وہ کیا اور کون سی حکمت عملی اپنائی کہ کامیابیوں پہ کامیابیاں حاصل کرتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اللہ اس مردِ مجاہد کو سلامت رکھے اور ناموسِ دین وملت کا محافظ بنائے!!۔

☆☆☆

تاثرات

''بڑے قابل مبارکباد ہیں ڈاکٹر راغب السرجانی کہ انہوں نے وقت کے اس موضوع پر قلم اٹھایا، اور اردوغان کی کہانی میں ترکی کی کہانی سنادی، حال کو مستقبل سے جوڑ دیا۔

ہمارے برادر عزیز طارق ایوبی بھی دوہری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ ۲۰۱۱ء سے اپنے قلم سے حق کی جنگ لڑ رہے ہیں، ''ندائے اعتدال'' کے صفحات پر انہوں نے منافقوں کی بخیہ دری بھی کی، مغفلوں اور نادانوں کی دبیز عینک بدلنے کی بھی کوشش کی، اور اخیر میں اردوغان کے الیکشن میں اپنے قلم سے شریک ہوگئے، اور اب الحمدللہ فتح کی خوشخبریاں لئے ہوئے اردو قارئین سے مخاطب ہیں، اللہ تعالی ہی ان کو جزائے خیر سے نوازے، اور زبان وقلم کی طاقت میں روز افزوں اضافہ کرے، آمین''۔

مولانا سید سلمان حسینی ندوی

مرد بیمار ترکی کو مدمقابل لانے والا مرد آہن

''رجب طیب اروغان''

مسلمانوں کے خلاف عالمی سطح پر بچھائی گئی سیاسی بساط کو سمجھانے والی ایک اہم کتاب

حنیف خان (شعبہ اردو، اے ایم یو علیگڑھ)

وہی ہوا جس کا اندازہ ڈاکٹر طارق ایوبی نے آج سے تقریبا چھ ماہ قبل لگایا تھا۔اپنی کتاب ''رجب طیب اردوغان'' میں ڈاکٹر طارق ایوبی نے صفحہ نمبر 304 پر پیش گوئی کی تھی اور لکھا تھا کہ ''روشن ماضی کی روشنی میں اور ملک کے اندر داخلی استحکام کی کوششوں نیز خارجی عناصر کی سازشوں کو بے نقاب کرنے اور فوجی بغاوت کو ناکام بنانے کے سبب بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ 2019 کا الیکشن بھی حزب العدالۃ والتنمیہ اور ترکی کے صدر رجب طیب اردوگان کے نام ہوگا'' ترکی میں الیکشن 2019 کے بجائے 2018 میں ہی ہوگئے اور ڈاکٹر طارق ایوبی کی پیش گوئی کے مطابق رجب طیب اردگان اس میں کامیاب بھی ہوگئے۔اس سے ڈاکٹر طارق ایوبی کی سیاسی بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اب اگر انہوں نے کسی سیاسی شخصیت سے متعلق کتاب لکھی ہے تو یقیناً وہ کتاب بہت اہم ہوگی۔

اردو زبان میں ایسی کتابیں بہت کم شائع ہوتی ہیں جن سے مسلم نوجوان دنیا کی حقیقت سے واقف ہوں۔ان کو پتہ چلے کہ دنیا کے کیا حالات ہیں اور اس وقت دنیا کا فکری دھارا کس رخ پر ہے۔ہاں اخبارات میں مضامین ضرور لکھے جاتے ہیں جو ٹھوس حقائق سے بہت دور اور جذباتیت سے بھرپور ہوتے ہیں۔میں ایسے مضامین کو افیم کی گولی سمجھتا ہوں کہ نوجوان ان کو پڑھ کر اس راہ سے دور ہو جاتے ہیں جو ان کا اصل راستہ ہے۔اردو میں ایسی کتابوں کی حد درجہ کمی ہے جو موجودہ دور کیا ہم شخصیات سے نوجوانوں کو واقف کراتی ہوں۔ہاں ایسی کتابیں ضرور ہیں اور بہت وافر مقدار میں ہیں جن کا تعلق محض مذہبیات اور ادبیات سے ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ یہی وہ دو باب ہیں جن سے متعلق اردو زبان میں مواد موجود ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا جبکہ اس کے برعکس دنیا کی دوسری زبانوں میں ہر اس شخص کے بارے میں کتابیں ملیں گی جس نے کچھ نیا کیا ہو اور ملک وقوم کا نام روشن کیا ہو۔ڈاکٹر طارق ایوبی نے اس خلا کو پر کرنے کے لئے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے جس کے چاہنے والے بلاشبہ پوری دنیا میں موجود ہیں۔ترکی کے صدر رجب طیب اردگان کی حیات و خدمات سے متعلق ڈاکٹر راغب السرجانی کی کتاب ''رجب طیب اردوغان'' کا اسی نام سے ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ڈاکٹر طارق ایوبی نے اہل اردو کو ایک ایسی شخصیت سے واقف کرایا ہے جس نے دنیا کی جمہوری تاریخ کا رخ پلٹ دیا ہے۔دنیا کا سب سے پسندیدہ طرز حکومت جمہوریت ہے مگر اس شخص نے جمہوریت کے بھیڑیوں کے چہروں سے نقابیں کھینچ لی ہیں۔رجب طیب اردگان پوری جمہوری دنیا کا واحد حکمراں ہے جو جمہوریت کے اصل معنی نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ اس کو پوری ایمانداری کے ساتھ ترکی میں نافذ بھی کرتا ہے جس کے ثمرات سے نہ صرف ترک شہری بلکہ

پوری دنیا محظوظ ہورہی ہے، اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ پوری دنیا میں اصل جمہوریت کا نفاذ عمل میں آئے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے حکمراں اس کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے ہیں، کیونکہ وہ جمہوریت کے پس پردہ چھپے ہوئے آمر اور ڈکٹیٹر چہرے کو عوام سامنے لے آتا ہے۔ وہ نام نہاد جمہوریت پسندوں کو جب آئینہ دکھاتا ہے تو اپنی ہی شکل دیکھ کر ان کو گھن آنے لگتی ہے اور رجب طیب اردگان سے وہ ناراض ہوجاتے ہیں کہ اس نے آئینہ کیوں دکھایا۔

اس وقت دنیا میں مظلوموں کی آواز بن کر رجب طیب اردگان ابھرے ہیں مگر افسوس اردو جو حقیقت میں اب مسلمانوں کی زبان ہوکر رہ گئی ہے میں کوئی ایسی کتاب نہیں موجود تھی جس سے قارئین ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہوتے۔ یہ لیڈر اگر مسلمانوں کے بجائے عیسائیوں یا دوسرے مذہب یہاں تک کہ اگر کمیونسٹ ہوتا تو اب تک خدا معلوم کتنی کتابیں اور کتنی زبانوں میں آگئی ہوتی مگر افسوس وہ مسلمانوں کا لیڈر ٹھہرا اس لئے اس جانب توجہ نہیں دی گئی۔ یہاں تک کہ عربی زبان میں بھی بہت زیادہ کتابیں رجب طیب اردگان سے متعلق نہیں ہیں۔ دوسری طرف آپ ہندستان کی ہی مثال لے لیجئے آپ کسی بھی بک اسٹال پر چلے جائیے یہاں کے لیڈر ان یوگی، مودی وغیرہ سے متعلق متعدد زبانوں میں کتابیں مل جائیں گی۔

ڈاکٹر طارق ایوبی نے نہ صرف اس خلا کو پر کیا ہے بلکہ انہوں نے ایسی کتاب کا ترجمہ کرکے اپنی بیدار مغزی کا ثبوت دیا ہے۔ مذہبی اور ادبی شخصیات کے ساتھ ہی سیاسی، اسپورٹس اور دوسرے اہم شعبوں کی اہم شخصیات سے متعلق اردو میں بھی کتابیں ہونی چاہیئے۔ کسی بھی زندہ زبان کی یہ علامت ہوتی ہے کہ وہ اپنے سماج کو مکمل روشنی دیتی ہو اور اس کی ضرورت کا ہر مواد اس زبان میں موجود ہو مگر ہماری زبان کتنی زندہ ہے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر طارق ایوبی ایک بالغ نظر عالم دین ہیں، فکری اعتبار سے ان میں کمال کی صلابت ہے۔ کارروان امن وانصاف کے قومی صدر ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب کتاب اور کتاب کی شخصیت دونوں کا نصب العین ایک ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بڑی محنت، لگن اور دلچسپی سے اس کتاب کا ترجمہ اس طرح کیا ہے گویا نقل نہیں اصل ہے۔ ڈاکٹر راغب السرجانی کی کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے انہوں نے اس میں اتنا ضخیم ضمیمہ شامل کردیا جو بذات خود ایک کتابی شکل میں شائع ہوسکتا تھا۔

اس وقت پوری دنیا کے حالات کس قدر خراب ہیں، استعماری ذہنیت کے سبھی حکمراں ایک طرف ہیں اور دنیا کی مجبور ومقہور اقوام ایک طرف ہیں کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہے۔ ایک طرف اگر فلسطینی نہتھے ہیں تو دوسری طرف روہنگیا مسلمان ہیں جن کا اس آسمان کے نیچے کوئی وطن ہی نہیں ہے۔ خدا معلوم وہ کہاں پیدا ہوئے تھے اور کس خاک کے پیوند بنیں گے۔ ایک طرف شامی بچے ہیں اور دوسری طرف اسد رجیم اور سفید ریچھ ہے جو برفیلے جنگل کے بجائے شام کی فضاؤں میں دھواں کی شکل میں قہر بن کر معصوم بچوں کو خون میں نہلا رہا ہے۔ پوری دنیا تماشائی ہے اور اگر کچھ تماشائی نہیں ہیں تو وہ خود اس کھیل میں شریک ہیں اور اپنی جنگیں وہ شامی سرزمین پر لڑ رہے ہیں۔ ایسے میں ایک بندہ خدا اٹھتا ہے اور ایک ساتھ سبھی مظلوموں کی آواز بن جاتا ہے جس کا نام ہے رجب طیب اردگان۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد جب پوری سلطنت کو یہودیوں نے ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور مصطفے کمال اتاترک جیسے شخص کے ہاتھوں میں زمام اقتدار پہنچ گیا تو بھلا کوئی سوچ سکتا تھا کہ ترکی دوبارہ اسلام کی طرف واپس آئے گا؟ مگر دنیا نے دیکھا کہ سلطان عبدالحمید کا وارث آگیا ہے اور وہ لوگوں کو اصل اسلام کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ تقشّف اور رہبانیت سے دور ہوکر اس اسلام کی طرف پوری دنیا کو بلا رہا ہے جو نبی اکرمؐ لے کر آئے

تھے جس میں پورا نظام زندگی ہے۔ وہ صرف نام کا مسلمان نہیں ہے بلکہ اس نے اصل اسلام کو اپنی زندگی میں اتارا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ ہمارے اسلاف نے جہانبانی کی ہے۔ خلفائے راشدین نے زمام اقتدار کے ساتھ اسلامی زندگی گذاری۔ رجب طیب اردگان جہاں ایک طرف خوداللہ کے ان نیک بندوں کی راہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہے وہیں دوسری طرف وہ ایک ایسی نسل کی آبیاری کررہا ہے جس کے سینوں میں قرآن اور اس کی تعلیمات ہوں گی اور اس کے ہاتھوں میں دنیاوی علوم کی ڈگریاں ہوں گی۔ جن کی زندگی میں پوری طرح سے دین ہوگا مگر وہ امور دنیا سے نابلد نہیں ہوں گے ورنہ کئی صدیوں سے مسلمانوں کی یہ تاریخ رہی ہے کہ علوم نبوت کے حاملین کو دنیوی علوم سے دور رکھا گیا۔

ڈاکٹر طارق ایوبی کی 324 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنے مواد کے اعتبار سے بہت ہی شاندار ہے۔ انہوں نے رجب طیب اردگان جیسی شخصیت کو موضوع بنایا ہے جس نے مصر میں جمہوریت کے قتل پر سب سے پہلے آواز بلند کی تھی۔ الاخوان المسلمون کی منتخب حکومت کا جب تختہ پلٹ ہوا اور دنیا دیکھ رہی تھی کہ ایک جمہوری حکومت پر ناجائز قبضہ کیا جارہا ہے اور وہ خاموش تھی تو رجب طیب اردگان سامنے آئے اور انہوں نے اس کی بڑی شدومد کے ساتھ مخالفت کی۔ ڈاکٹر طارق ایوبی نے اپنی اس کتاب میں ایک ایسے شخص کو موضوع بنایا ہے جو استنبول کی سڑکوں پر روٹیاں فروخت کرتا تھا اور وہ اس شہر کا پہلا شہری منتخب ہوا اور آج اس ملک کا پہلا شہری ہے مگر آج تک اس پر بدعنوانی کا کوئی الزام نہیں ثابت ہوسکا ہے۔ جس کی زندگی اس قدر بے داغ ہو یقیناً وہ ہمارے نوجوانوں کا آئیڈیل بن سکتا ہے مگر اس ترک کے بارے میں اردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی لیکن اب موجود ہے۔ یہ ڈاکٹر طارق ایوبی کی بیدار مغزی ہی ہے کہ انہوں نے اس کتاب کا انتخاب فوراً ترجمہ کے لئے کرلیا اور آج یہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

یہ کتاب اس طور پر بھی اہم ہے کہ اس میں صرف ترک کے صدر رجب طیب اردگان کی حیات وخدمات کا ہی جائزہ نہیں لیا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس فکری منہج کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے لئے یہ شخص آج دنیا سے لڑنے کی کوشش کررہا ہے۔

کتاب کا آغاز نئے ترکی سے ہوتا ہے کہ کس طرح خلاف عثمانیہ کا شیرازہ منتشر ہوا اور ترکی میں قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ دراصل جب قومی حکومت کا ذکر ترکی کے تعلق سے ہوتا ہے تو اس کا مفہوم سیدھے طور پر یہ ہوتا ہے کہ عرب، عربی اور عربی طرز زندگی سے اس معاشرے کو کلی طور سے کاٹ دیا گیا ہے۔ دوسرا باب سیکولر حکومت میں اسلامی تحریک'' ہے۔ ان دو ابتدائی ابواب سے وہ پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے اور حالات سمجھ میں آجاتے ہیں جن کی پیداوار رجب طیب اردگان ہیں۔ خلافت عثمانی کے سقوط کے بعد نجم الدین اربکان نے ترکی کی سیکولر حکومت میں اسلامی تحریک کا آغاز کیا اور وہی رجب طیب اردگان کے سیاسی گرو بھی ہیں۔ یہ کتاب نجم الدین اربکان کی شخصیت اور ان کی فکر کا بھی ضمنا احاطہ کرتی ہے کیونکہ اس کے بغیر اردگان کی فکر کو گرفت میں نہیں لایا جاسکتا ہے۔

کتاب کے مطابق رجب طیب اردگان نے اپنا سیاسی کیریئر نجم الدین اربکان کی پارٹی ''حزب الرفاہ الاسلامی'' سے شروع کیا اور انہوں نے کارپوریٹر کے عہدہ سے عہدہ صدارت تک سفر کیا۔ ڈاکٹر طارق ایوبی نے ان کے اس پورے سفر کو بہت سلیس زبان اور خوب صورت بیان کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر طارق ایوبی کی یہ کتاب ترکی کے پورے معاشرے کو اس کی اصل شکل میں قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے، اسی طرح عالمی معاملات کا بھی یہ کتاب احاطہ کرتی ہے مثلاً حجاب کا مسئلہ، یوروپی یونین، بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی پالیسیاں، یورپی یونین کی رکنیت، عراق وامریکہ بحران کے تئیں ترکی کا موقف، صہیونی ریاست سے تعلقات وغیرہ۔ اس

کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ رجب طیب اردگان نے کن حالات میں آنکھیں کھولیں، کس طرح ان کی پرورش ہوئی اور پھر وہ کیسے اور کس سیاسی فکر کے ساتھ میدان میں آئے۔ جب ترکی سیکولر قومی حکمرانوں کی حکمرانی میں تھا تو کیا حالات تھے اور جب سے رجب طیب اردگان نے سیاسی بساط پر اپنے مہرے سجائے اور اسلامی آئیڈیالوجی کے ساتھ سیاست میں قدم رکھ کر کامیابیاں حاصل کی تو اس کے بعد ترکی کے حالات کیسے بدل گئے؟ ان سب کے بارے میں یہ کتاب بہت تفصیل کے ساتھ معلومات مہیا کراتی ہے۔

کتاب میں پوری اسلامی دنیا کے سیاسی منظر نامے کو پیش کیا گیا ہے تیونس، مصر، لیبیا، شام اور یمن وغیرہ کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ترکی کے موقف اور اس کی اسٹرٹیجی کو بتایا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے صرف ایک شخصیت کی سیرت، اس کے حیات و کارنامے کو ہی نہیں پیش کیا ہے بلکہ بین السطور اس فکری دھارے کو قاری کے ساتھ کر دیا ہے جس کے تحت رجب طیب اردگان نے دنیا میں آمن و آشتی اور اخوت و محبت کا خواب دیکھا ہے۔ اردگان کی پارٹی اور اس کی پالیسوں پر گفتگو کرتے ہوئے فاضل مصنف نے اردگان کا نظریہ حکومت ان کے عملی آئینہ میں پیش کیا ہے کیونکہ اردگان صرف کاغذ کے پرزوں کو اہمیت نہیں دیتے ہیں بلکہ وہ عمل کو ہی سب کچھ تصور کرتے ہیں اس لئے مصنف نے ان کی کارکردگی پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔

کتاب کے مترجم ڈاکٹر طارق ایوبی نے دو ضمیمے شامل کتاب کئے ہیں جن میں سے ایک اصل کتاب میں نہیں تھا پہلا ضمیمہ ''شاید یہ ایک نئے دور کا آغاز ہے'' مثالی قیادت اقوام متحدہ پر کھلی تنقید، معاہدہ لوزان کا اختتام ایک نئی صبح کا آغاز'' جیسے نو ذیلی عناوین پر مشتمل ہے۔ چونکہ اصل عربی کتاب 2012 میں شائع ہوئی تھی اس لیے ڈاکٹر طارق ایوبی نے اپنی ان تحریروں سے گزشتہ چند سالوں کا نقشہ پیش کر کے اصل کتاب کے ترجمہ میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ جبکہ دوسرا ضمیمہ بنیادی حقوق اور سیاسی اصول، بنیادی حقوق اور آزادی، سیاسی ساخت، اقتصادیات، سماجی پالیسیاں جیسے دس ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ جو درحقیقت اصل کتاب میں بھی ضمیمہ کے طور پر شامل تھا۔ یہ ضمیمہ اردوغان کی پارٹی کا منشور تھا۔ جو 100 صفحات پر مشتمل تھا مترجم نے مصلحتاً اس کا بہت مختصر خلاصہ پیش کیا ہے۔ مترجم کے ضمیمہ کی وجہ سے عربی زبان میں لکھی گئی اصل کتاب سے کہیں زیادہ اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ امید ہے کہ قارئین کو یہ کتاب پسند آئے گی۔

☆☆☆

ترجمہ کی خوبی

''اصل بات یہ ہے کہ کسی مصنف مولف اور مترجم کو جب موضوع سے مناسبت اور قلبی و ذہنی لگاو ہوتا ہے تو پھر الفاظ جملوں اور عبارتوں میں دلی جذبات بھی شامل ہو جاتے ہیں ڈاکٹر طارق ایوبی اپنے سینے میں دل دردمند رکھتے ہیں جو اسلام اور ملت کے حالات کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ عزت مآب رجب طیب اردگان آج پوری دنیا کے اسلام پسند مسلمانوں اور تمام دبائے کچلے انسانوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے ہیں۔ طارق ایوبی نے نہ صرف یہ کہ ایک کتاب کا ترجمہ کیا ہے جس میں اپنی لسانی ادبی اور علمی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے بلکہ دل دردمند کی دھڑکنوں کو بھی لفظوں میں سمو دیا ہے یہی وہ چیز ہے جس نے اصل کتاب کو ترجمانی کا شاہکار ہونے سے زیادہ حدیث دل بنا دیا ہے۔ میں بھی پر خلوص مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ کتاب کو علمی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوگی''۔

از: شکیل احمد اعظمی ندوی، بحرین

کیا طیب اردوغان کا سفر جاری رہے گا؟

ترکی کے الیکشن میں کامیابی کے بعد اردغان کی زندگی پر تحریر ایک کتاب 'رجب طیب اردوغان' کے حوالے سے ایک تبصرہ

شکیل رشید (ایڈیٹر ممبئی اردو نیوز)

منصوبہ بڑا ہی آسان مگر بے حد خوفناک تھا۔۔۔

رجب طیب اردوغان کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے، عبداللہ اوکلان کو قتل کر دیا جائے۔ اور پھر ترکی میں مذہبی سیکولر طبقے اور کردوں کے درمیان جنگ کی ایسی آگ بھڑکا دی جائے کہ یہ بھی عراق اور شام کی طرح شدید قسم کی خانہ جنگی کی لپیٹ میں آجائے۔ اور نتیجے میں شام کی باقی ماندہ سنّی آبادی اور شامی مہاجرین تباہی و بربادی کی اس کگار پر جا کھڑے ہوں جہاں سے واپسی ناممکن ہو جائے۔ اور ترکی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے! مگر 'جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے' کے مصداق ترکی کی ۱۵ جولائی ۲۰۱۶ء کی فوجی بغاوت ناکام ہوگئی۔ صرف ناکام ہی نہیں ہوئی، اس فوجی بغاوت نے طیب اردوغان کے قدم ترکی کی زمین پر بھی، عالم اسلام میں بھی اور غیر مسلم دنیا میں بھی ایک جدید مگر اسلامی مزاج رکھنے والے قائد کی حیثیت سے کچھ اس قدر مضبوط کر دیئے کہ تازہ ترین صدارتی انتخابات میں ان کے مدّ مقابل آنے والے لیڈروں اور پارٹیوں کو ''اردوغان پسندوں'' نے اس طرح سے ناکام بنایا کہ وہ اپنی شکست کو یاد کر کے برسوں تلملاتے رہیں گے۔ اور صرف وہی کیوں سارا یوروپ، امریکہ اور ترکی بلکہ اردوغان کے سارے مخالفین جو زور لگائے ہوئے تھے کہ اردوغان جس طرح بھی ہو ہار جائیں، اپنے زخموں کو برسہا برس تک چاٹتے رہیں گے۔

آخر ۲۰۰۳ء سے ۲۰۱۴ء تک ترکی کے وزیر اعظم اور ۲۰۱۴ء سے ابتک ترکی کے صدر کی حیثیت سے حکمرانی کرنے والے رجب طیب اردوغان میں وہ کون سی خوبیاں یا وہ کون سی صفات ہیں جو انہیں نہ صرف مقبول بنائے ہوئے ہیں بلکہ انہیں مسلم دنیا میں انتہائی بااثر اور طاقتور لیڈر کی حیثیت دے رکھی ہے؟؟ اس سوال کا جواب چند سطروں میں دینا ممکن نہیں ہے، اس کے لئے پوری ایک کتاب درکار ہے۔ اردو زبان میں ویسے بھی 'حالات حاضرہ' پر کتابوں کا فقدان ہے لیکن یہ اردوغان کی 'کرشماتی شخصیت' کا کمال ہی ہے کہ اردو میں ان پر پوری ایک کتاب ابھی حال میں شائع ہو کر آئی ہے۔ 'رجب طیب اردوغان' نام کی کتاب عربی زبان میں ڈاکٹر راغب السرجانی کی تحریر کردہ ہے، اسے اردو کا جامہ ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی نے پہنایا ہے، بلکہ ترجمے کے ساتھ کتاب میں اضافے بھی کیئے ہیں۔ عربی کتاب چونکہ ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی تھی اس لئے مترجم نے اپنے تحریر کردہ ضمیمے بھی شامل کیے ہیں تا کہ ۲۰۱۲ء کے بعد کے حالات پر روشنی پڑ سکے۔

اردوغان ۲۶ فروری ۱۹۵۴ء میں استنبول میں پیدا ہوئے جو پہلے ترکی کا دارالحکومت تھا، ان کی ولادت ایک پسماندہ ترک خاندان میں ہوئی، ان کے والد ساحلی گارڈ تھے، اردوغان کی تعلیم ایک دینی مدرسے میں ہوئی۔ کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ اس

عہد کا شامل ہے۔''ایک روز دینی تربیت کے استاد نے عملی مشق کے گھنٹے میں مطالبہ کیا کہ کوئی طالب علم نماز کی امامت کرے تو اردوغان نے یہ ذمہ داری قبول کرلی،لیکن جب مدرس نے ان کو ایک اخبار دیا کہ وہ اس پر نماز ادا کریں تو اردوغان نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ اس اخبار پر نماز نہیں پڑھ سکتے کیونکہ اس کے صفحات میں بے پردہ عورتوں کی تصاویر موجود ہیں،ان کے اس عمل سے معلم اس قدر خوش ہوئے کہ ان کو'الشیخ رجب' کا لقب دے ڈالا۔'' جب اردوغان مرحلہ ثانویہ میں 'مدرسہ ایوب' میں منتقل ہوئے تو وطنی مسائل میں دلچسپی لینے لگے،اسی دوران وہ ترک طلبہ کے قومی اتحاد کی مختلف شاخوں میں سرگرم عمل رہے۔استنبول یونیورسٹی کے شعبہ ؟ تجارت واقتصادیات میں داخلہ لیا۔اردوغان اپنی دینی تعلیم سے بے حد متاثر ہوئے،وہ آج بھی کہتے ہیں''میری کامیابی کا اصل سبب ایمان،اسلامی اخلاق، اخلاق نبویؐ اور سنت نبویؐ کی اقتداء ہے۔''

کتاب میں ترکی کی اسلامی تاریخ کے حوالے سے ترکی کے عظیم رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان کی سیاسی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر ہے۔اردوغان قافلہ اربکان کے ایک سرگرم سپاہی تھے،ان کی 'اسلامی ویلفیئر پارٹی' کے ایک رکن اور پارٹی میں رہ کر مختلف ذمے داریوں کو سنبھالتے ہوئے اربکان کے دست وبازو۔

کتاب میں بڑی ہی تفصیل کے ساتھ اردوغان کے سیاسی سفر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔استنبول کے میئر کی حیثیت سے ان کے کارناموں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ڈاکٹر راغب السرجانی کے بقول ''اردوغان کا استنبول کا میئر منتخب ہونا ان کی سیاسی زندگی کا ایک اہم اور امتیازی واقعہ تھا،وہ ترکی کے ایک ایسے میئر ہوگئے جہاں پالیسیاں وضع کی جاتی تھیں،سیاسی پالیسیاں ترکی کے دارالحکومت انقرہ سے صادر ہوتی تھیں،تو اقتصادی پالیسیاں ترکی کی اقتصادی راجدھانی استنبول سے صادر ہوتی تھیں۔'' اربکان اور فوج میں ٹکراؤ،اردوغان کی قیادت میں 'جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی' کا قیام گویا کہ ترکی کے حالات روزانہ ہی اوپر نیچے ہورہے تھے۔ اردوغان اور ان کے ساتھیوں پر اس زمانے میں یہ الزام بھی لگا کہ''یہ سب امریکی اور صہیونی ایجنٹ ہوگئے ہیں۔''اس الزام کی وجہ اربکان کی پارٹی سے اردوغان اور ان کے ساتھیوں کی علیحدگی تھی۔۔۔۔اردوغان مشکلوں میں گھرے مگر ایک بڑی تعداد تھی جس کا یہ کہنا تھا کہ اردوغان کا سیکولرزم کی مخالفت نہ کرنا اور سیکولرزم کی محافظ فوج سے ٹکراؤ سے بچنا 'اسلامی کاز کے لئے تجدیدی عمل' تھا۔اردوغان جب ۲۰۰۳ء میں ترکی کے وزیراعظم بنے تو ترکی شدید ترین اقتصادی مسائل سے دوچار تھا،قرضوں میں اضافہ ہوا تھا،ترکی یوروپین کسٹم یونین کا رکن بن گیا تھا جس کی وجہ سے ترکی کے بازاروں میں یوروپی صنعت کا غلغلہ ہوگیا تھا اور ترکی کی صنعتیں دیوالیہ ہوگئی تھیں،کرپشن زوروں پر تھا،فوج کا بجٹ بے پناہ تھا،حجاب پر شدید اختلافات تھے،کرد مسئلہ بھی گرم تھا،بیرونی ممالک ترکی کو ہڑپنے کے لئے کوشاں تھے اور اسرائیل کے ساتھ ترکی کے سفارتی تعلقات قائم ہوچکے تھے۔۔۔ترک قوم تبدیلی چاہتی تھی،اور اردوغان کی 'کرشماتی شخصیت' نے تبدیلی کا کارنامہ کردکھایا،معیشت کو بہتر بنانے کا اہتمام کیا۔ اردوغان نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات کے باوجود فلسطینیوں کی حمایت کی،انہوں نے اسرائیل سے اسٹراٹیجک شراکت داری ختم کرکے اسے ایک جھٹکہ دیا،حماس کے وفد کا استقبال کیا اور جب اسرائیل نے حماس کے پارلیمانی نمائندوں کو گرفتار کیا تو سرگرم ترک کارکنان ان کی مدد کو پہنچے۔۔۔اس طرح اردوغان حکومت کی کھلی اجازت سے ترکی قوم کا جذبہ قضیہ فلسطین کی نصرت کے لئے کھل کر سامنے آیا۔اردوغان نے حکومت کے دوسرے دور(۲۰۰۷ء) میں بھی معاشی اصلاحات کی پالیسی جاری رکھی۔یہ وہ دور ہے جب وہ عالمی منظرنامے پر

ابھر کر سامنے آئے۔اس دور میں ترکی کی طرف سے قضیۂ فلسطین کے بارے میں بڑی مثبت رائے کا اظہار کیا گیا اور غزہ پر اسرائیلی حملے کے موقع پر ترکی نے سخت اور واضح پیغام جاری کیا اور صہیونی ریاست پر جرائم اور بدترین سلوک کے ارتکاب کا الزام لگایا۔۔۔کتاب میں ''ڈیووس کانفرنس'' میں اسرائیلی رہنما کو اردوغان نے جو سخت سست سنائی اس کی تفصیلات دی گئی ہیں جو دلچسپ ہیں۔ملاحظہ کریں۔

''پھر شمعون پیریز چیخنے لگا،تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ کیا تم لوگ پاگل ہوگئے ہو؟ جناب اردوغان کیا آپ اجازت دیں گے کہ ایک دن میں سو راکٹ داغے جائیں یا کم از کم استنبول پر دس راکٹ گرائے جائیں؟ اس پر مجمع پیریز کے لئے تالیاں بجانے لگا،اردوغان نے گفتگو کا مطالبہ کیا تو ناظم جلسہ نے ان کو یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کی کہ پبلک کو سوالات کرنے کا موقع دینا ہے۔ لیکن اردوغان نے اصرار کیا تو ناظم جلسہ نے صرف ایک منٹ میں اپنی بات کہنے کی اجازت دی،اردوغان نے سب سے پہلے سامعین پر تنقید کی جنہوں نے بچوں کے قاتل کے لئے تالیاں بجائیں اور پھر با آوازِ بلند شمعون پیریز کو جواب دیا،''تم صاحب حق نہیں ہو،تمہاری دلیل کمزور ہے،اسی لئے تم نے غیر سفارتی لہجہ اختیار کیا اور بلند آواز میں بات کی،حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں حماس نے راکٹ داغے مگر وہ سب کھلی جگہوں پر گرے،جبکہ تم لوگوں نے گھروں پر بمباری کی اور چھتوں کو ان گھروں میں موجود عورتوں اور بچوں پر گرادیا،پرامن سمجھوتے کا مکمل امکان موجود تھا مگر تم لوگوں نے جنگ کا راستہ اختیار کیا،جناب صدر تم بچوں کے قاتل ہو'' ناظم جلسہ نے اردوغان کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ اردوغان نے موتمر کے قوانین کی خلاف ورزی کی ہے،تو اردوغان کھڑے ہوگئے اور یہ کہتے ہوئے ہال سے باہر نکل گئے کہ وہ دوبارہ 'ڈیووس کانفرنس' میں نہیں آئیں گے۔۔۔ اللہ اکبر! شاید یہ پہلا موقع ہوگا جب کوئی مسلم رہنما صہیونی صدر سے اس سختی اور شجاعت کے ساتھ پیش آیا ہو۔''

کتاب میں ''اردوغان اور عرب انقلابات'' کے عنوان کے تحت باب میں 'عرب بہاریہ' کے متعلق اردوغان اور ان کی حکومت کے موقف پر تفصیلی بحث کی گئی ہے،انہوں نے 'عرب بہاریہ' کی ہر ممکن حمایت کی۔جون ۲۰۱۱ء کے ترکی کے پارلیمانی انتخابات اور اردوغان کی کامیابی پر پورا باب شامل کتاب ہے۔ اور آگے کی سطروں میں یہ پیشن گوئی بھی کی گئی ہے کہ جلد ہی ترکی اور مغرب کا ٹکراؤ ہوگا۔۔۔ترکی اور اردوغان سے دنیا کو جو توقعات ہیں ان پر بھی صاحب کتاب نے بھرپور بحث کی ہے۔۔۔کتاب کے خاتمے پر مصنف نے اردوغان کو ایک خط لکھ کر دس نصیحتیں کی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ ''کوئی بھی قدم اٹھائیے تو احتساب کیجئے کہ وہ خالص اللہ کے لئے ہو۔'' ایک نصیحت یہ کی ہے کہ ''مغرب اور امریکہ پر اعتماد کرنے والے قافلے میں شامل نہ ہوں۔''''مسلمانوں کے ہر مسئلے میں نمایاں کردار ادا کریں۔''''عرب ممالک سے اغماض نہ برتیں''۔۔۔ وغیرہ

ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی نے جو ضمیمے شامل کئے ہیں وہ اس کتاب کو 'تازگی' عطا کرتے ہیں کہ ان کے مطالعے سے آج کے حالات واضح ہوکر سامنے آجاتے ہیں۔ وہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں۔''مغرب اسلام کو اپنی راہ کا روڑا سمجھتا ہے،وہ اسلام کو اپنے باطل نظریات سے متصادم تصور کرتا ہے،مصر میں اخوانی حکومت کا تختہ پلٹ،سعودیہ و دبئی سے غاصبوں کی حمایت کا اعلان کرانا، دیگر ممالک میں اس جماعت پر پابندی اور اس کے قائدین کو تہہ تیغ کرنا یا پس زنداں ڈال دینا سب اسی پالیسی کا نتیجہ ہے،ڈاینل پائپس نے اپنی تحقیق کے ذریعے امریکی سیاسی اداروں کو اسلامی تنظیموں اور اسلام پسندوں کو ختم کرنے کا یہ طریقہ پیش کیا ہے کہ

مسلم قائدین کا صفایا کردیا جائے۔ اوراب خدامحفوظ رکھے ترکی کے اس 'مرددانا' کو کہ وہ بھی اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لئے کوشاں ہے۔'' وہ ۱۵ جولائی کی بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں ''اس بات کے ثبوت وشواہد منظر عام پر آچکے ہیں کہ یہ ایک منصوبہ بند سازش تھی، اس پر سب متفق ہیں کہ اس کے نتیجے میں ترکی کی طاقت کو توڑنا اور اسلام پسندوں کا قتل عام کرنا مقصود تھا، جولسٹ باغیوں کے پاس سے برآمد کی گئی ہے وہ نو ہزار افراد پر مشتمل ہے جن پر مقدمات چلا کر انہیں تختۂ دار پر چڑھانا تھا جن میں سرفہرست رجب طیب اردوغان تھے، بلکہ انہیں تو ان کے اس ہوٹل میں جہاں وہ چھٹیاں گزارنے کے لئے قیام پذیر تھے قتل کرنا پہلا مقصد تھا۔''

اب اردوغان کی جیت کے بعد کئی سوال سامنے ہیں، معاہدہ لوزان کے اختتام کے بعد کیا ہوگا؟ یہ وہ معاہدہ ہے جس نے ترکی کی طاقت، اس کی شناخت، خودمختاری اور آزادی اور وہاں کے عوام کے اختیارات کو سلب کررکھا ہے۔ یہ معاہدہ ۲۰۲۳ء میں ختم ہورہا ہے۔ امید یہی ہے کہ ترکی میں ایک نئی صبح کا سورج طلوع ہوگا۔۔۔ کتاب بے حد دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔ عالمی سیاست کے اتار چڑھاؤ اور عالم اسلام کے خلاف سازشوں کی تفصیلات پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ 'ہدایت پبلشرز' نے بڑے ہی دلکش انداز میں یہ کتاب شائع کی ہے۔ ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی کا ترجمہ شاندار ہے۔

☆☆☆

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

''رجب طیب اردغان کی سرگذشت حیات پر عربی زبان میں مفصل کتاب آچکی ہے اردو والوں کے لئے اس کا شگفتہ اور سلیس ترجمہ ڈاکٹر محمد طارق ایوبی نے کردیا ہے ذوق سلیم رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے، اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ رجب طیب اردغان نے کمال اتاترک کے بچھائے ہوئے کانٹوں کو چننے کا کام کتنی احتیاط کے ساتھ کررہے ہیں۔ اس وقت عرب دنیا سے کہیں کوئی امیدافزا خبر نہیں آتی ہے، مصر میں عبدالفتاح سیسی نے حسنی مبارک اور جمال عبدالناصر کے ظلم کی یاد تازہ کردی ہے۔ خلیجی ملک، امریکہ اور سرائیل کی گود مین گر گئے ہیں وہاں کا ایک بداطوار شہزادہ دیارحرم کو لندن اور واشنگٹن بنانا چاہتا ہے، اس وقت حرم کی پاسبانی کے لئے دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک ہوجانا چاہئے۔ شیطان کے خلاف جنگ ہر فرد ملت کا دینی فریضہ ہے۔ کچھ امیدیں وابستہ ہیں تو ترکی سے ہی ہیں۔ ترک نادان نے جب سے خلافت کی قبا چاک کی تھی، تب سے سحر کے آثار اب نمودار ہورہے ہیں۔ رجب طیب اردغان امید کا ستارہ اور ملک میں احیائے اسلام کا استعارہ بن گئے ہیں۔ رجب طیب اردغان جب استنبول کے میئر تھے تو انہوں نے ترکی زبان میں یہ اشعار جلسہ میں پڑھے تھے، اس کا اردو ترجمہ یہ ہے ,,مسجدیں ہماری بیرکیں ہیں، گنبد ہمارا ہلمٹ ہے، مینار ہمارے نیزے ہیں، نمازی ہمارے لشکر ہیں یہ وہ مقدس فوج ہے جو اپنے دین کی حفاظت کرتی ہے''۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

اداریہ

عالم اسلام پر نفاق کے گہرے بادل

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

جناب شیخ پر افسوس ہے میں نے تو سمجھا تھا
حرم کے رہنے والے ایسے نامحرم نہیں ہوتے

انبیاء کرام جب بھی دنیا میں تشریف لائے، ان کو دو طبقوں سے سابقہ پیش آیا، ایک وہ جو کھلے ہوئے کافر تھے، خواہ وہ خدا کا انکار کرتے تھے یا شرک میں مبتلا تھے، اور مخلوقات کے سامنے اپنی پیشانی خم کرتے تھے، دوسرے وہ جنہوں نے کھل کر کفر کا راستہ اختیار نہیں کیا، علی الاعلان انبیاء کی دعوت کی مخالفت نہیں کی، لوگ ظاہری حالات کے اعتبار سے ان کو اہل ایمان میں شامل سمجھتے تھے؛ لیکن نہ صرف یہ کہ وہ مسلمان نہیں تھے؛ بلکہ وہ دین حق کے خلاف سازشیں بھی کرتے رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو یہ گروہ تھا ہی؛ لیکن قرآن مجید کے بیان اور تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انبیاء کے ساتھ بھی اس طرح کے واقعات پیش آتے رہے ہیں؛ اسی لئے ہمیں قوم بنی اسرائیل کے تذکرہ میں سامری کا کردار ملتا ہے کہ جوں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے اور حضرت ہارون علیہ السلام کے حلم و بردباری کی وجہ سے اس نے اپنے سازشی منصوبے کے لئے ماحول کو سازگار پایا، تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بنی اسرائیل کی ایک بڑی تعداد کو بچھڑے کی پرستش میں مبتلا کر دیا۔

اسی طرح سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں بھی ہمیں نفاق کا کردار صاف نظر آتا ہے کہ آپ کے ایک نام نہاد حواری نے آپ کے بارے میں جاسوسی کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آپ آسمان پر اٹھا لیے گئے، یہودیوں میں چوں کہ منافقانہ مزاج زیادہ رہا ہے، اور وہ ہمیشہ سے خفیہ سازشیں کرتے آئے ہیں؛ اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی عیسائیت کے سلسلے میں منافقین کی دسیسہ کاری کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ سینٹ پال نے یہودیت کا لبادہ اتار کر اپنے آپ کو ایک راست گو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بے حد محبت کرنے والے عیسائی کی حیثیت سے پیش کیا، اور پھر اس نے عیسائیوں کے درمیان سب سے بڑے مبلغ، مصلح اور مقدس شخصیت کی حیثیت حاصل کر لی، عقیدۂ توحید کو تثلیث سے بدل دیا، ایک خدا کی جگہ تین کے مجموعے کے خدا ہونے کا تصور پیش کیا، اور عیسائیت کو کچھ اس طرح مسخ کیا کہ آج تک عیسائی اس دام سے باہر نہیں آسکے، آج بھی دنیا اسی مسخ شدہ عیسائیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی حقیقی عیسائیت تصور کرتی ہے۔

اسلام میں فتنۂ نفاق کو اتنی اہمیت دی گئی کہ قرآن مجید میں ۹ سورتوں میں اور تقریباً ایک سو انیس آیات میں اس فتنہ کا ذکر ملتا ہے، اسی طرح صرف صحاح ستہ میں ۱۸۵ مقامات پر نفاق اور منافقین کا تذکرہ کیا گیا ہے، (بخاری میں: ۶۶ بار، مسلم میں: ۴۹ بار، ابو داؤد میں: ۱۲ بار، ترمذی میں: ۲۶ بار، نسائی اور ابن ماجہ میں: ۱۶-۱۶ بار) اگر نفاق ایک دائمی اور امت کے لیے نہایت

سنگین فتنہ نہیں ہوتا اور عہد نبوی ہی کے لئے خاص ہوتا تو اس قدر تکرار اور تاکید کے ساتھ اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہوتا۔

شریعت محمدی چوں کہ قیامت تک کے لئے ہے اور اس کائنات کو اپنے آخری انجام تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے زیر سایہ ہی زندگی کا سفر طے کرنا ہے؛ اس لئے اس امت میں مخلصین کی طرح منافقین بھی زیادہ پیدا ہوں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں تو منافقین تھے ہی؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی منافقین کی سازشوں کا سلسلہ جاری رہا، جس کی ایک واضح مثال عبداللہ بن سبا کی شکل میں ملتی ہے، جس نے اپنی سازشوں کے ذریعہ ایسا عظیم فتنہ کھڑا کیا، جس میں تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی، اور اسی سازش کے تسلسل کے نتیجے میں چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ بھی پیش آیا، صحابہ جو اس قدر شیر وشکر تھے کہ خود قرآن مجید نے ان کی باہمی محبت ورواداری کی تصویر.... رحماء بينهم وشهداء على الكفار (فتح:۹۲) کے الفاظ میں کھینچی ہے..... کے درمیان دو دو جنگیں ہوگئیں، اور خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ اور بنو ہاشم بلکہ خود بنو ہاشم میں بنو عباس اور علویین کے درمیان ایسا کارزار برپا ہوا کہ ہزاروں مسلمان شہید ہوگئے، لوگوں نے خود اپنے رشتہ داروں اور قرابت مندوں کو قتل کر کے اپنی تلوار کی پیاس بجھائی، اور جب تک تاتاریوں نے خود ان کو تہہ وبالا نہیں کر دیا، وہ آپس میں ایک دوسرے کی خون ریزی میں مبتلا رہے۔

نفاق ایسا فتنہ نہیں ہے، جو ایک زمانہ میں تھا اور اب ختم ہوگیا، قرآن مجید ابدی کتاب ہدایت ہے، اور جیسا کہ مذکور ہوا قرآن مجید نے فتنہ نفاق کو بہت زیادہ موضوع بحث بنایا ہے، اسی طرح حدیثوں میں بکثرت نفاق کا ذکر آیا ہے، یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ فتنہ ہمیشہ باقی رہے گا، یہ ایسا فتنہ نہیں ہے کہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہو؛ بلکہ ہر دور میں یہ فتنہ رہا ہے اور رہے گا، جب مسلمانوں کی قوت ایمانی پختہ رہی تو یہ فتنہ کمزور رہا اور جب مسلمان ضعف ایمانی کا شکار ہوگئے تو یہ فتنہ طاقت ور ہوگیا؛ اسی لئے بعض علماء نے اس فتنہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، اس سلسلے میں ابوبکر جعفر بن محمد فریابی (متوفی:۳۰۱) کی "كتاب صفة النفاق و ذم المنافقين" بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس پر شیخ ابوعبدالرحمن مصری نے شرح وتحقیق کا کام کیا ہے، اور یہ پہلی بار ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب میں نفاق اور منافقین سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور صحابہ کے آثار کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فتنے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے بعد مجھے تم لوگوں پر سب سے زیادہ اندیشہ چرب زبان منافقین سے ہے" إن أخوف ما أخاف عليكم بعدى كل منافق عليم اللسان" (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر:۵۹۳) یہ بات دیگر صحابہ کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے؛ بلکہ ابو عثمان مہدی نقل کرتے ہیں کہ میں نے اپنی ان انگلیوں کی تعداد سے زیادہ دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بات سنی کہ مجھے اس امت پر سب سے زیادہ خوف صاحب علم اور دانش ور منافق کا ہے " إنى أخوف ما أخاف على هذه الأمة المنافق العليم" (کنز العمال، حدیث نمبر:۸۰۴۹۲) جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ یہ دانش ور منافق کون ہیں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو زبان و بیان سے تو خوب واقف ہوں؛ لیکن معرفت رکھنے والے دل سے اور عمل سے محروم ہوں، عالم اللسان جاهل القلب والعمل (حوالہ سابق)

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نفاق صرف ان لوگوں میں ہوگا جو کتاب و سنت سے بے خبر ہوں؛ بلکہ بڑے سے بڑا قاری بھی ان کی

صف میں شامل ہوسکتا ہے، وہ بڑی سے بڑی مسجدوں کا اور دینی مراکز کا امام وقائد بھی ہوسکتا ہے، اس کی خوش الحانی اور قرأت قرآن پر قدرت کی وجہ سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ بھلا ایسے شخص میں بھی نفاق کی علامت پائی جاسکتی ہے؟ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت میں زیادہ تر منافقین قراء میں سے ہوں گے: أكثر منافق أمتي قراؤها (مسند احمد عن عمرو بن العاص، حدیث نمبر:۶۶۳۷)'' قرّ اء'' میں قاری تو شامل ہیں ہی؛ لیکن قرن اول کی اصطلاح کے مطابق بڑے عالم کو بھی قاری کہا جاتا تھا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خصوصی راز دار بنایا تھا، اور خصوصی طور پر منافقین کے بارے میں مطلع بھی فرمایا تھا، کہتے ہیں کہ لوگوں میں بہت اچھی قرأت کرنے والوں میں بھی منافق موجود ہوتا ہے، جو نہ واؤ کو چھوڑتا ہے، نہ الف کو، اور زبان کو اس طرح دائیں بائیں گھماتا ہے جیسے گائے اپنی زبان کو خلا میں گھماتی ہے:" ان من أقرأ الناس المنافق الذی لا يترك واواً و لا الفاً يلفته كما تلفت البقرة الخلاء بلسانها (صفة النفاق وذم المنافقین للفریابی، حدیث نمبر۱۴، مصنف ابن شیبہ، حدیث نمبر:۶۳۷۸) اسی طرح بعض صحابہ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ منافقین دینداری کا لبادہ اوڑھ کر معاشرہ پر یہاں تک کہ دینی مجامع پر چھا جائیں گے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ اپنی مسجدوں میں جمع ہوں گے اور ان میں ایک بھی صاحب ایمان نہیں ہوگا" يأتي على الناس زمان يجتمعون في مساجدهم ليس فيهم مؤمن" (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر:۵۵۳۰۳)

کچھ تو منافقین کی اخلاقی علامات ہیں، جن کا حدیث میں ذکر آیا ہے، جیسے: دروغ گوئی، وعدہ خلافی اور امانت میں خیانت "إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف وإذا ائتمن خان" (بخاری، حدیث نمبر:۵۹۰۶) لیکن نفاق کی جو اصل حقیقت ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے قول وفعل میں تضاد ہو، وہ نام تو لیتا ہو اسلام کا؛ لیکن اس کے عمل سے کفر کی تائید ہوتی ہو"المنافق يقول بما يعرف و يعمل بما ينكر" (بیہقی، حدیث نمبر:۳۶۴۶) اس کی زبان اور دل کے درمیان، خفیہ عمل اور ظاہری عمل کے درمیان اور اندر اور باہر کے درمیان موافقت نہیں ہو " من النفاق اختلاف اللسان و القلب و اختلاف السر و العلانية و اختلاف الدخول و الخروج" (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر: ۲۴۶۵۳) اگر کوئی ظالم اور اسلام دشمن شخص کسی موقع پر مسلمانوں کے لئے تقویت اور اسلام کے لئے تائید ونصرت کا ذریعہ بن جائے تو اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے؛ اس لئے کہ بعض دفعہ یہ منافقین کی اپنی مصلحت ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے مطابق اس کا عمل مسلمانوں کے لئے تقویت کا باعث بن جاتا ہے، جیسا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:فيؤيد الله المؤمنين بقوة المنافقين (بیہقی، حدیث نمبر:۵۷۸۷۱)

منافقین کے بارے میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے یہ پیشین گوئی منقول ہے کہ قیامت کے قریب ہر قوم کی قیادت اہل نفاق کے ہاتھ میں آجائے گی " لا تقوم الساعة حتیٰ يسود كل قوم منافقوها" (المعجم الاوسط، حدیث نمبر:۵۱۷۷) یہ تو امراء اور قائدین کا حال ہوا، دوسری طرف جو درباری علماء اور منصب دار ہوں گے، وہ بھی ایسے اسلام دشمن قائدین کی ہاں میں ہاں ملائیں گے، ان کی تعریف کریں گے، انہیں یقین دلائیں گے کہ ان کا ہر فیصلہ درست، ہر قدم مبارک اور ہر عمل عدل وانصاف کے مطابق ہے؛ البتہ جب ان کے پاس

سے باہر آئیں گے اور کبھی ضمیر ملامت کرے گا، تو وہ ان حکمرانوں کو... جن کے وہ خود لقمہ خوار ہیں... برا بھلا کہیں گے، اور تنقید وتبصرہ کریں گے " یمدحونه و یسبونه إذا خرجوا من عنده (عن عبداللہ ان عمر، مشیخۃ القاضی المارستان المعروف بمشیخۃ الکبری، حدیث نمبر:۳۰۱)

یوں تو بدقسمتی سے خلافت راشدہ کے بعد ہی اسلام کا نظام طرز حکمرانی عملی طور پر ختم ہوگیا، اس پورے عرصہ میں خال خال ہمیں ایسے خداترس اور انصاف ور حکمراں مل جاتے ہیں کہ گویا لق ودق صحراء کی گرم طوفانی ہواؤں کے درمیان کہیں کہیں بادنسیم کا کوئی جھونکا آجائے؛ لیکن خلافت عثمانیہ کے سقوط تک عالم اسلام کی عمومی کیفیت یہ تھی کہ حکمراں بحیثیت مجموعی اسلام کے معاند نہیں ہوتے تھے، بھلے ہی ایک قبیلہ کی دوسرے قبیلہ سے یا ایک حکمراں کی دوسرے حکمراں سے جنگیں ہوتی تھیں، اور بعض دفعہ فاتحین مفتوحین کے ساتھ بڑی سفاکی کا معاملہ بھی کرتے تھے، یہاں تک کہ باپ کی بیٹے کی، اور بھائی کی جان لے لیتے تھے؛ لیکن یہ قبائلی اور سیاسی عداوت ہوتی تھی، اسلام سے سبھوں کا تعلق ایمان ویقین کا اور محبت کا ہوتا تھا، عمومی طور پر ایسا نہیں ہوتا تھا کہ مسلمان حکمراں یہودی اور نصرانی ایجنڈے کو اپنے ملک میں نافذ کریں، اور وہ اسلام ہی کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار باور کرتے تھے۔

لیکن خلافت عثمانیہ کے سقوط کا واقعہ اس سے بالکل مختلف انداز میں پیش آیا، اس میں یہود ونصاریٰ نے عربوں اور ترکوں کی اندرونی صفوں میں اپنے پروردہ اور تربیت یافتہ منافقین کو داخل کردیا، اس کام کو انہوں نے اتنے بہتر طریقہ پر انجام دیا کہ ''لارنس آف عربیہ'' (جس کا اصل نام ''تھامس ایڈورڈ لارنس'' تھا اور جو ایک بدترین اسلام دشمن سازشی ذہن کا انگریز تھا) عرب اس کو ایسے نجات دہندہ شخص کی طرح دیکھنے لگے، جیسے کوئی مرید اپنے شیخ کو یا کوئی سعادت مند شاگرد اپنے استاذ کو دیکھتا ہے، دوسری طرف اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ درحقیقت یہودی تھا اور جس نے ترکی کا رشتہ عالم اسلام اور ملت اسلامیہ سے کاٹ کر ترکی کے وقار کو سخت نقصان پہنچایا اور جو قوم پوری دنیا کے مسلمانوں کی قیادت کرتی تھی، یہاں تک کہ ہندوستان میں بھی جمعہ کے خطبہ میں عثمانی خلفاء کا نام پڑھا جاتا تھا، اس کی سیاسی اور مذہبی قیادت کو ایک چھوٹے سے خطہ میں محدود کرکے رکھ دیا، ترک اسے اپنا نجات دہندہ اور ہیرو سمجھنے لگے۔

اس کے بعد عالم اسلام پر ایسے لوگوں کے لئے گویا اقتدار کی راہ ہموار ہوگئی، جنہوں نے اپنی اسلام دشمنی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی، اور وہ کھلے عام اعداء اسلام کے وکیل وترجمان بن گئے؛ چنانچہ ترکی میں مصطفیٰ کمال کی حکومت قائم ہوگئی، مصر میں جمال عبدالناصر کی، عراق وشام میں بعث پارٹی کی، یہی حال لیبیا اور تیونس میں ہوا، غرض کہ عالم اسلام کے بڑے حصہ خاص کر مشرق وسطیٰ پر ایسے آمروں کو اقتدار پر فائز کیا گیا، جو صرف نام کے مسلمان تھے، یا کسی خاص مذہبی تہوار کے موقع پر مسجد یا عیدگاہ آجاتے تھے؛ ورنہ اپنے دل ودماغ کے اعتبار سے پوری طرح یہودیوں، عیسائیوں اور کمیونسٹوں کے ساتھ تھے، اور زبان سے مصلحتاً موقع بہ موقع اپنی مسلمانیت کا اظہار کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے مین منافقین کے سلسلے میں ایک بنیادی بات یہ تھی کہ ان کی خصوصی محبت اور رازدارانہ تعلق یہودیوں کے ساتھ تھا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "واذا خلوا إلیٰ شیاطینهم قالوا إنا معکم (بقرہ:۱۴) اس آیت میں مفسرین نے ''شیاطین'' سے اول درجہ پر یہود ہی کو مراد لیا ہے:

"سادتهم و کبراء هم و رؤساء هم من أحبار الیهود" (تفسیر ابن کثیر)

چنانچہ عہد نبوی کی تمام اہم جگہوں میں کہیں نہ کہیں یہود یا ان کے

آلۂ کار منافقین کا ہاتھ ضرور نظر آتا ہے، غزوۂ بدر سے پہلے یہودی مکہ مکرمہ جاتے تھے، اور مشرکین مکہ کو حملہ کے لئے ورغلاتے تھے، غزوہ اُحد میں بھی منافقین عین میدان جنگ سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان چھوڑ کر واپس آ گئے، یہ وہ لوگ تھے جن کا یہودیوں کے ساتھ اندرونی تعلق تھا، اور اس غزوہ میں صحابہ کی شہادت پر یہودیوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا تھا، غزوہ خندق میں تو یہودیوں کا کردار اس قدر معاندانہ رہا اور انہوں نے کھلے طور پر معاہدہ کی خلاف ورزی کی کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نصرت خاص شامل نہیں ہوتی تو پورا مدینہ ویران ہو کر رہ جاتا، پھر ان منافقین نے خود مہاجرین وانصار کو آپس میں لڑانے کی تھوڑی کوشش نہیں کی؛ اس لئے نفاق کو پرکھنے کا پیمانہ نام نہاد مسلمانوں کی اعداء اسلام بالخصوص یہودیوں سے دوستی ہے۔

پورے عالم عرب میں اگر کوئی ایسی حکومت تھی، جس سے مسلمانوں کی تسکین ہوتی تھی، تو وہ تھی مملکت سعودی عرب، اگر چہ اس کا قیام بھی انگریزوں ہی کے تعاون سے ہوا تھا؛ کیوں کہ جب خلافت عثمانیہ کے خلاف مکہ مکرمہ کے والی شریف مکہ حسین بن علی نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تو اس سے برطانیہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس بغاوت کے انعام کے طور پر اس کو نجد وحجاز کے پورے خطہ کا حکمراں بنا دے گا؛ لیکن جب ترک فوجیں شکست سے دوچار ہوئیں اور اس غدار لیڈر نے فتح حاصل کی تو انگریزوں نے دریائے اردن کے کنارے ایک پٹی پر اسے بادشاہ بنا دیا، ''جو مملکت ہاشمیہ اردن'' کے نام سے موسوم ہے؛ لیکن ترکوں کی شکست کا مقصد پورا ہونے کے بعد حکومت برطانیہ کی نظر میں شریف مکہ کی کوئی افادیت نہیں رہی؛ اس لئے جب ملک عبدالعزیز نے حجاز پر حملہ کیا تو برطانیہ نے شریف مکہ کی مدد نہیں کی، اور موجودہ پوری سعودی مملکت آل سعود کے زیر اقتدار آ گئی، اس حکومت کے قائم ہونے میں چوں کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کا بھی ایک رول رہا ہے، اس کی وجہ سے ایک اچھا پہلو یہ پیدا ہوا کہ اگر چہ حکومت نے بعض چیزوں میں غلو اور افراط سے کام لیا؛ لیکن یہ بات طے کر دی کہ یہاں بننے والے تمام قوانین کتاب وسنت پر مبنی ہوں گے؛ اگر چہ سیاسی اور معاشی نظام کو کبھی بھی حکومت نے قانون شریعت کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی؛ پھر بھی زندگی کے دوسرے شعبوں میں یہاں تک کہ حدود وقصاص میں بھی قانون شریعت کو نافذ کیا گیا، یہ دوسرے مسلم ملکوں کے مقابلہ میں ایک غنیمت صورت حال تھی۔

سعودی حکومت نے حجاج اور معتمرین کی بھی دل کھول کر خدمت کی، اور ان کی راحت رسانی میں کوئی کوتاہی نہیں ہونے دی، اسی کا اثر ہے کہ برصغیر بلکہ پورے عالم کے اہل ایمان اس حکومت سے محبت کرتے رہے ہیں، حرمین شریفین کی تولیت کا اعزاز، حجاج و زائرین کی خدمت، دوسرے مسلم ملکوں کی بہ نسبت شریعت اسلامی کے زیادہ حصہ کا نفاذ اور پٹرول کی قدرتی دولت کے حاصل ہونے کے بعد روزگار کے مواقع، ان سب چیزوں نے مل جل کر اس حکومت کو مسلمانوں کے درمیان کافی قبولیت عطا کی ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ فیصل شہید نے مغربی طاقتوں کے بالمقابل جس جرأت اور ایمانی حمیت کا ثبوت دیا، ان کے بعد ان کے جانشینوں میں کوئی بھی اس جرأت ایمانی کا وارث نہیں ہو سکا، پھر بھی شاہ خالد مرحوم ایک نیک صفت بادشاہ تھے، شاہ فہد مرحوم کو مغرب کی طرف مائل حکمراں سمجھا جاتا تھا؛ لیکن بعد کو اندازہ ہوا کہ انہوں نے حکمت کے ساتھ مغرب کے دباؤ کو تھام رکھا تھا، ان کے بعد شاہ عبداللہ مرحوم آئے جو بہت کم تعلیم یافتہ حکمراں تھے، اور لوگوں میں تأثر تھا کہ یہ زیادہ دینی رجحان کی حامل شخصیت ہیں؛ مگر افسوس کہ جب تخت اقتدار پر متمکن ہوئے تو لوگوں کی ساری توقعات خاکستر ہو گئیں، اور ان کے گرد ایسے لوگوں کا ہالہ بن گیا، جو پوری طرح مغرب کے پرستار تھے، اور جن کے عہد حکومت میں

وہ کچھ ہوا جو مغرب نواز سمجھے جانے والے حکمراں شاہ فہد کے دور میں بھی نہیں ہوا۔

شاہ عبداللہ کی وفات کے بعد موجودہ بادشاہ ملک سلمان نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی؛ اگر چہ ان کی دماغی صحت کے بارے میں مغرب کے ایک حلقہ کی طرف سے سوالات کھڑے کئے جا رہے تھے؛ لیکن عمومی طور پر یہ رائے تھی کہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، انہوں نے حکومت میں آتے ہی نہایت تیز رفتاری سے بہت سے فرمان جاری کئے، جن میں بعض بہتر بھی تھے، اور لوگوں کی امید بڑھی کہ اب گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی ہوگی؛ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، بنوامیہ کے دور میں ہر نئے حکمراں کے آنے پر لوگ خوشی مناتے اور پچھلے حکمراں سے نجات پانے کا احساس رکھتے؛ لیکن جب نیا حکمراں آتا تو کہتے کہ اس سے بہتر تو پہلا ہی شخص تھا، وہی صورت حال اس وقت قریب قریب سبھی مسلم ملکوں کی ہوگئی ہے۔

بجا طور پر تمام مسلمان اس وقت سب سے زیادہ تشویش اپنے مقامات مقدسہ کے بارے میں محسوس کرتے ہیں، سعودی عرب میں کم سے کم ظاہری طور پر جو دینی رکھ رکھاؤ تھا، اب وہ بھی بہت تیز رفتاری سے ختم ہو رہا ہے، مخلوط تعلیم کی اجازت کا باب تو سابقہ حکومت کے دور میں کھل گیا تھا، اب مردوں اور عورتوں کے مخلوط تفریحی اجتماعات کی اجازت بھی دے دی گئی ہے، مملکت کی راجدھانی میں بڑے دھوم دھام سے اسلامی اور سعودی روایات کے برخلاف سنیما ہال کا افتتاح کیا گیا ہے، اور حکومت کی طرف سے اعلان ہو چکا ہے کہ پوری مملکت میں سنیما ہال کھولے جائیں گے، محمد بن سلمان نے خود بیان دیا ہے کہ وہابیت کو کسی مذہبی جذبے کے تحت قبول نہیں کیا گیا تھا، امریکہ کے اشارہ پر قبول کیا گیا تھا، اور وہابیت نے سعودی عرب کو بہت نقصان پہنچایا ہے، مملکت کے گزشتہ بادشاہوں نے بڑی غلطیاں کی ہیں، اور سعودی عرب کی تاریخ ایسی تاریخ نہیں ہے جس پر فخر کیا جا سکے؛ بلکہ میرے لئے شرمندگی کا عث ہے، انہوں نے نیویارک ٹائمز کے صحافی تھامسن فریڈسن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ وہ اصل اسلام کی ترویج چاہتے ہیں، اور کہا کہ نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں موسیقی کی محفلیں ہوتی تھیں، مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط کا بھی معمول تھا اور جزیرۃ العرب میں یہود و نصاریٰ کا احترام تھا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ولی عہد کس قسم کے اسلام کی ترویج چاہتے ہیں؟

مملکت میں متعدد تفریحی شہر ریاض کے مضافات اور شامی سرحد کے قریب بنائے جا رہے ہیں، جو ہر طرح کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوں گے، ایک خبر یہ بھی آچکی ہے کہ فرانس کے دورے میں ۲۶ اپریل ۲۰۱۸ء کو انہوں نے پوپ فرانسس کے ساتھ ایک ایسے معاہدہ پر دستخط کیے ہیں، جس کے تحت پورے سعودی عرب میں چرچ کھولنے کی بات طے پائی ہے، یہاں تک کہ اس معاہدہ میں حرمین شریفین کا بھی استثناء نہیں ہے، سعودیہ کی طرف سے تو غالباً اب تک اس کی تردید نہیں کی گئی ہے، مگر ویٹکن سیٹی کی طرف سے (۲۷ اپریل ۲۰۱۸ء) کو ایک وضاحت آئی ہے کہ سعودی ولی عہد سے ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے، خدا کرے یہ وضاحت سچائی پر مبنی ہو، غرض کہ مصر اور بیشتر عرب ممالک تو پہلے ہی سے مغرب کی آغوش شفقت میں بیٹھ چکے ہیں، سعودی عرب نے بھی پہلے ہی سے اپنا پورا دفاعی نظام امریکہ کے حوالہ کر رکھا ہے، اور پٹرول کے کنویں پر کویت، عراق جنگ کے موقع پر ہی امریکہ نے اپنا پنجہ گاڑ دیا تھا، اب فکری اور تہذیبی اعتبار سے بھی مملکت اپنے آپ کو مغرب کے حوالہ کر رہی ہے۔

اس پوری صورت حال میں سب سے نازک مسئلہ بیت المقدس کا ہے، مسجد اقصیٰ یہودیوں کے حوالہ کر دی جائے، اس کے لئے حالیہ برسوں میں مغربی طاقتوں کی شہ پر بہت تیز رفتار قدم

اُٹھائے گئے ہیں، سب سے پہلے ایک ظالم وجابر آمر نے— کہ اگر وہ اپنے ملک میں سچائی کے ساتھ انتخاب کرائے تو دس فیصد ووٹ بھی حاصل نہ کر پائے— مصر میں عوام کی منتخب حکومت جو ''الاخوان المسلمون'' کے زیر انتظام تھی، کو طاقت اور پیسے کے بل پر معزول کیا؛ تاکہ فلسطینیوں کا کوئی پُرسان حال باقی نہیں رہے، اور اسرائیل کے پڑوس میں کوئی ایسا ملک نہیں رہ پائے، جو اسرائیل کے عزائم میں رکاوٹ بن سکے، پھر نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ ''حماس'' کو— جو اسرائیل کے سخت مظالم کا شکار ہے اور جو اپنے ارض وطن کی آزادی کی جدوجہد کر رہا ہے— دہشت گرد قرار دے دیا گیا، پھر ''الاخوان المسلمون'' کو بھی جس نے ہمیشہ قانون وآئین کے دائرے میں رہتے ہوئے اسلامی اصولوں پر حکومت کے قیام کی کوشش کی ہے، دہشت گرد قرار دے دیا گیا، عجیب بات ہے کہ اسرائیل ۱۹۴۸ء سے دہشت گردی کا مسلسل مرتکب ہو رہا ہے، اور اس نے بار بار اقوام متحدہ کے فیصلے کی دھجیاں اڑائی ہیں، وہ تو دہشت گرد نہیں ہے، اور جس تنظیم نے کبھی دہشت گردی کا کوئی عمل نہیں کیا اور جمہوری طریقہ کار کو اختیار کیا، وہ دہشت گرد ہوگئی؛ حالاں کہ اصل مسئلہ اس آمرانہ سرکاری دہشت گردی کا ہے، جس کے زیر سایہ عرب ممالک کے عوام مظلومیت اور مقہوریت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اس وقت ''بیت المقدس'' کا مسئلہ ایک دوراہے پر ہے، بجائے اس کے کہ خلیجی ممالک بالخصوص والی حرمین شریفین مطالبہ کرتے کہ اسرائیل ۱۹۶۷ء کی سرحدوں پر واپس جائے، صورت حال یہ ہے کہ امریکہ کے صدر ٹرمپ نے بیت المقدس میں اپنا سفارت خانہ منتقل کرنے کا اعلان کیا اور باضابطہ مغربی اخبارات میں ٹرمپ کی طرف سے وضاحت کی گئی کہ ہم نے اس مسئلہ پر سعودی عرب، مصر اور بعض دیگر خلیجی ملکوں سے گفتگو کر لی ہے، افسوس کہ ہمارے ان حکمرانوں کو یہ بھی توفیق نہیں ہو سکی کہ وہ اس اعلان کے خلاف سخت ردعمل کا اظہار کرتے اور دوٹوک انداز ٹرمپ کی تردید کرتے، ۱۴ اپریل ۲۰۱۸ء کو سعودی عرب کے ولی عہد نے بیان دیا کہ اسرائیل کو اپنی سرزمین پر قابض رہنے کا حق حاصل ہے، کاش! یہی بیان فلسطینیوں کے بارے میں آتا، یہاں تک کہ اب سعودیہ کی طرف سے فلسطینیوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ ٹرمپ کے فارمولے کو قبول کر لیں؛ ورنہ انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، جب سعودی عرب نے ٹرمپ کی آمد پر مسلم ممالک کے سربراہان کو دعوت دی تو یہ اس طرح گرتے پڑتے ریاض پہنچے کہ گویا نہیں پہنچے تو دنیا وآخرت تباہ ہو جائے گی؛ لیکن ۱۴ دسمبر ۲۰۱۷ء کو جب ترکی نے بیت المقدس کے مسئلہ پر ورلڈ مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا تو سعودی عرب، مصر اور عرب امارات وغیرہ نے اعلیٰ سطحی نمائندگی سے بھی گریز کیا اور کم درجے کے نمائندہ کو بھیجا، گویا ارادی طور پر مسجد اقصیٰ کے مسئلہ کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی گئی، قرآن نے تو یہود کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا ہے، اور اس دشمنی کو آج ہم شب وروز سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، مگر ان ہی سے بعض عرب ملکوں کی دوستی عروج پر ہے، اور اس کے برخلاف اپنے مسلمان ترک بھائیوں سے نفرت ہے، جنہوں نے پانچ سو سال سے زیادہ بیت المقدس کو بچا کر رکھا اور آخری خلیفہ نے یہودیوں کے فلسطین میں آباد ہونے کے مقابلہ اپنی معزولی کو ترجیح دی، محمد بن نائف کو بلا وجہ معزول کرنے کے بعد اخبارات میں خبریں آئیں کہ اسرائیل کے پندرہ جنگی جہاز ریاض میں اتر چکے ہیں، اور سعودیہ کی طرف سے اس کی کوئی تردید نہیں کی گئی، اور اب خبر آئی ہے کہ سعودیہ حج کے سارے انتظامات اسرائیلی کمپنی کے حوالہ کر رہا ہے، افسوس:

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے بیٹے سے دوا لیتے ہیں

حالات بتا رہے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کا مسئلہ اس وقت نہایت نازک

مرحلہ میں داخل ہو چکا ہے، افسوس کہ ان سطور کے لکھے جانے کے دوران ہی ۱۴ مئی ۲۰۱۸ء کو فرعونِ وقت ٹرمپ کے فیصلہ کے مطابق امریکہ کا سفارت خانہ بیت المقدس میں منتقل ہو چکا اور اس کے خلاف احتجاج کے دوران بڑی تعداد میں فلسطینی شہید ہوئے؛ لیکن سوائے ترکی کے کسی مسلم ملک کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ امریکہ کے اس ایک طرفہ اور ظالمانہ اقدام پر امریکہ سے اپنے سفیر کو واپس طلب کرلے، ترکی نے اسرائیل سے تو اپنا سفیر واپس بلایا ہی امریکہ سے بھی اپنے سفیر کو واپس طلب کرلیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ طیب اردگان کو جس قدر خراج محبت پیش کیا جائے کم ہے اور عالم اسلام کی بزدلی، بے حمیتی اور غیرت اسلامی سے محرومی پر جس قدر رویا جائے کم ہے۔

افسوس صد افسوس کہ فلسطین کے پڑوسی مسلم ممالک نہ صرف یہ کہ مسجد اقصیٰ کے تحفظ کے لئے کچھ نہیں چاہتے؛ بلکہ جو فلسطینی مزاحمت کر رہے ہیں، ان پر بھی دباؤ ڈال رہے ہیں؛ بلکہ کچھ عرصہ پہلے ایک خفیہ پلان بھی منظر عام پر آچکا ہے، معلوم نہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ کہ اسرائیل حماس پر حملہ آور ہوگا، اور جب ان کو غزہ چھوڑنا پڑے گا تو مصری فوج ان کو بھگا کر سینا کے بے آب وگیاہ صحراء میں لے جائے گی، وہاں ان کو آباد کیا جائے گا، اور ان کی آبادکاری کے لئے سعودی عرب اور بعض خلیجی ممالک فائنانس کریں گے؛ تاکہ فلسطین کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے، اور اسرائیل پورے خطہ پر قابض ہو جائے، ظاہر ہے اس کے بعد کی منزل مسجد اقصیٰ کا انہدام ہے، جس میں اسرائیل کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی، خدانہ کرے کہ یہ سازش کبھی پایۂ تکمیل کو پہنچے اور ملت اسلامیہ کی آنکھیں ایسا برا وقت دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

اب یہ بات تو ظاہر ہے کہ عالم اسلام میں سوائے ترکی کے، نیز عالم عرب اور خلیج میں سوائے قطر کے اکثر ممالک اس بڑی منافقانہ سازش کو قبول کر چکے ہیں، اور مسلم حکمراں ایک ایسے نفاق میں مبتلا ہیں، جو اَب خفیہ راز نہیں رہا، حکمرانوں کے علاوہ اگر کوئی اس کے خلاف آواز اُٹھا سکتا تھا تو وہ علماء تھے؛ لیکن ان جیسے ممالک میں علماء ربانیین کی ایک بڑی جماعت کو جیل کی کوٹھری میں ڈال دیا گیا ہے، اور وہ ناقابل بیان مظالم کے شکار ہیں، کچھ وہ اہل علم ہیں جو اس صورت حال سے اپنے دل میں ضرور کسک محسوس کرتے ہیں اور ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا ہے؛ لیکن وہ واقعی مجبور ہیں، اس لیے انہوں نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے، بہر حال انہیں معذور سمجھنا چاہئے، لیکن علماء وائمہ مساجد کا ایک گروہ ایسا بھی ہے، جنہیں پیسوں کے ذریعہ حکومتوں نے خرید لیا ہے، اگر وہ سکوت اختیار کرتے تب بھی سمجھا جاتا کہ یہ ان کی مجبوری ہے؛ لیکن اس سے آگے بڑھ کر وہ حکومت کے ہر خلاف شریعت عمل پر مہر تصویب ثبت کرتے جاتے ہیں، مصر کے سابق اور موجودہ مفتی اعظم کا حال پوری دنیا کے مسلمانوں نے دیکھا کہ انہوں نے کس طرح الاخوان المسلمون کے غیرت مند اور با حمیت مسلمانوں کی خون ریزی کو جائز ٹھہرایا، اور مصر کے دستور سے اس دفعہ کے حذف کرنے کو قبول کرلیا، جس کی رو سے دستور کی بنیاد کتاب وسنت کو قرار دیا گیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں علماء اور عام مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے، اور اس سوال کا تعلق مسلمانوں میں سے کچھ افراد سے، کسی خاص جماعت سے، کسی خاص گروہ اور تنظیم سے نیز کسی خاص خطہ اور علاقہ کے رہنے والوں سے نہیں ہے؛ بلکہ پوری ملت اسلامیہ سے ہے، تو آیئے ہم غور کریں کہ موجودہ حالات میں مقامات مقدسہ اور بالخصوص مسجد اقصیٰ کی حرمت کی بقا کی لئے ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں:

۱۔ ہم چوں کہ بیت المقدس اور حرمین شریفین سے بڑے فاصلہ پر ہیں؛ اس لئے ہم براہ راست اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد نہیں کر

سکتے؛ لیکن ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اپنا احتجاج درج کرائیں، اور مسلم ممالک بالخصوص سعودی عرب، مصر، عرب امارات، اردن اور شام کے سفارت خانوں تک اپنا احتجاجی نوٹ پہونچائیں کہ وہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں پر ہرگز اسرائیل کے قبضہ کو تسلیم نہیں کریں اور جب تک اسرائیل اس کو تسلیم نہیں کرے، اس سے ہر طرح کے تعلقات منقطع رکھیں اور اگر ہیں تو منقطع کرلیں۔

۲۔ اختلاف مسلک ومشرب سے بالاتر ہوکر تمام دینی جماعتیں اور اہم ادارے جیسے جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی ہند، جمعیۃ اہل حدیث، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، جامعہ سلفیہ بنارس، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ وغیرہ تمام مسلم ملکوں سے اور خاص کر مذکورہ ملکوں سے مطالبہ کریں کہ وہ امریکہ واسرائیل کے سامنے سر نہ جھکائیں، اور اللہ پر بھروسہ کرکے پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کریں، حماس کو دہشت گرد تنظیم ماننے سے انکار کردیں، اور اسرائیل کو دہشت گرد قرار دیں۔

۳۔ خاص طور پر سعودی عرب کے سامنے یہ بات رکھی جائے کہ موجودہ ولی عہد نے جو راستہ اختیار کیا ہے، یہ صریحاً اسلام مخالف ہے، یہ سعودی روایات کے بھی خلاف ہے، یہ خود اس ملک کے دستور کے بھی مغائر ہے، جس میں کتاب وسنت کو ملک کے لئے دستور کا درجہ دیا گیا ہے، یہ حرمین شریفین کی تولیت کے عظیم منصب کے لئے مطلوبہ اوصاف واقدار کے برعکس ہے اور یہ مغرب نواز پالیسی، دینی، معاشی، اخلاقی اور دفاعی ہر پہلو سے خود مملکت کے لئے نقصاندہ ہے، نیز یہ ملک اور شاہی خاندان کے اندر بھی ایک بڑے انتشار کا سبب ثابت ہوسکتا ہے؛ اس لئے وہ اس نئی پالیسی سے باز آجائیں اور اپنے اُس مقام ومرتبہ کا لحاظ کریں، جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نسبت سے ان کو عطا کیا ہے۔

۴۔ اس وقت مسئلہ فلسطین مخلصین اور منافقین کو پرکھنے کا ایک پیمانہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہود ونصاریٰ کو حرم مکی سے بغض تھا؛ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو قدرت کے باوجود حج نہ کرے تو مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ یہودی ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر، (ترمذی، حدیث نمبر: ۸۱۲) یعنی اس وقت کعبۃ اللہ سے محبت اخلاص کے لئے معیار تھا، موجودہ دور میں یہود ونصاریٰ کو مسلمانوں سے سب سے زیادہ بغض اس بات سے ہے کہ وہ انبیاء [1] بنی اسرائیل کے مرکز بیت المقدس پر کیوں قابض ہیں؛ اس لئے اس وقت جو شخص یا جو حکومت مسئلہ فلسطین کو نظر انداز کرتی ہے، اور یہودیوں کے ہاتھ اس کا سودا کرنے کو تیار ہے، وہ اس دور کے منافقین ہیں؛ اس لئے ایسے ملکوں کے سرکاری عہدہ داروں اور سرکاری مولویوں کو اداروں اور تنظیموں میں مدعو کرنے سے گریز کیا جائے، اسی طرح اگر اعداء اسلام کی ہم نوا ان ظالم حکومتوں کی طرف سے کوئی دعوت آئے تو اسے قبول نہیں کیا جائے، اور صاف طور پر لکھا جائے کہ مسئلہ فلسطین میں آپ کی مسلمان مخالف پالیسی کی وجہ سے ہم لوگ اس دعوت کو رد کررہے ہیں۔

۵۔ فلسطین کا سودا کرنے میں جن ملکوں کا نام سامنے آرہا ہے، دینی کاموں کے لئے نہ ان سے عطیہ مانگا جائے اور نہ ان کا عطیہ قبول کیا جائے؛ کیوں کہ ایسے ممالک مسجدیں اور عمارتیں بنوا کر یا تھوڑی بہت رقمی امداد کرکے اپنے حقیقی مکروہ چہرے کو چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔

۶۔ اسرائیل اور اسرائیل نواز امریکی کمپنیوں کا مستقل طور پر بائیکاٹ کیا جائے، یہ نہ سوچا جائے کہ ہمارے سامان نہ خریدنے سے کمپنی تو بند نہیں ہوگی، پھر اس کا کیا فائدہ؟؛ بلکہ اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ ہمیں یہ کام ایک دینی فریضہ کے طور پر کرنا ہے، بلا سے کہ ہمارے اس عمل سے دشمن کو خاطر خواہ نقصان نہ پہنچے؛ لیکن ہم عند اللہ ظالم کی حمایت کے گناہ سے تو بچیں گے؛

کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ظالموں سے تمہارا تعلق نہیں ہونا چاہئے،(لاترکنوا الی الذین ظلموا ، ھود: ۱۱۳)

۷۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان ۱۹۶۷ء کے پہلے کی طرح زیادہ سے زیادہ مسجد اقصیٰ کی زیارت کا شرف حاصل کریں، اور بیت المقدس کے سفر کا اہتمام کریں؛ تاکہ ظاہر ہو کہ مسلمانوں کو اس مسجد سے اب تک ویسا ہی تعلق ہے، جیسا تعلق پہلے تھا۔

۸۔ مسجد اقصیٰ کے موضوع پر زیادہ سے زیادہ جلسے کئے جائیں، جمعہ کے بیانات میں ، مدارس اسلامیہ کے سالانہ جلسوں میں، مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے پروگراموں میں اس موضوع کو پیش کیا جائے، مضامین کے ذریعہ یہودیوں کی قتل وغارت گری، ظلم وبربریت اور عالمی قوانین کی خلاف ورزی کو خوب واضح کیا جائے، برادران وطن کے ساتھ مل کر مسئلہ فلسطین پر سیمینار رکھے جائیں، اور اس میں زبانی بیانات، تحریری دستاویزات اور تصویروں کے ذریعہ فلسطینیوں کی مظلومیت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے۔

۹۔ اس وقت ہمارے دینی مدارس میں تاریخ کا مضمون گویا پڑھایا ہی نہیں جاتا؛ لیکن کم سے کم سیرت نبویؐ کے ساتھ مقامات مقدسہ کی تاریخ کو شاملِ نصاب کیا جائے؛ تاکہ آنے والی نسل کا اپنے مقدس مقامات سے محبت واعتقاد کا رشتہ بغیر کسی کمی کے قائم رہے۔

۱۰۔ سوشل میڈیا کے ذریعہ مسئلہ فلسطین کی اہمیت، مغرب کی دوہری پالیسی اور اس سلسلے میں موجودہ مسلم حکمرانوں کی کوتاہی کو ہر ہر مسلمان تک پہنچایا جائے، اور اس کو پُرامن اور مہذب احتجاج کا ذریعہ بنایا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی برائی کو دیکھو تو قوت سے بدلنے کی کوشش کرو، قوت صرف ہتھیار ہی کی نہیں ہوتی، قانون کی بھی ہوتی ہے، اور جمہوری معاشرے میں اتحاد واجتماعیت کی بھی ہوتی ہے، اگر قوت کا استعمال ممکن نہ ہو تو زبان سے روکنا ضروری ہے، آج کل پُرامن احتجاج کی جو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں، یا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یہ سب زبان ہی سے روکنے کے زمرہ میں آتے ہیں، اور اگر زبان سے بھی کہنا ممکن نہ ہو تو انسان دل میں کڑھن محسوس کرے، یہ ایمان کا بالکل آخری درجہ ہے،(مسلم، حدیث نمبر:۴۹) اب اگر کوئی شخص حکمرانوں کے روبرو کچھ بول نہ سکے، دل کی کڑھن کے ساتھ خاموشی اختیار کر لے تو وہ ایمان کے آخری درجہ میں ہے، اگر کڑھن محسوس کرنے کے بجائے وہ خوشامد اور چاپلوسی کرنے لگے، جیسا کہ اس وقت عالم اسلام کے بعض علماء وارباب افتاء کا حال ہے تو گویا وہ ایمان کے اس آخری درجہ سے بھی محروم ہے، جہاں تک ہندوستان کی بات ہے تو عالم اسلام اور مقامات مقدسہ کے بارے میں اس کی ایک روشن تاریخ رہی ہے؛ چنانچہ ہندوستان کے علماء اور اکابر نے خلافت عثمانیہ کے سقوط کے وقت خاموشی اختیار نہیں کی اور یہ نہیں سوچا کہ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے، یہ پرایا مسئلہ ہے؛ بلکہ اس وقت کے متحدہ ہندوستان میں اس کے خلاف بھرپور احتجاج کیا گیا، اور خلافت تحریک وجود میں آئی، ملت کے ذمہ داروں کے لئے لمحۂ فکر ہے کہ اگر اسلامی اقدار کے خلاف کھلے ہوئے عناد، یہود ونصاریٰ کی دوستی اور مقامات مقدسہ کے احترام کی پامالی پر بھی ہماری رگ حمیت نہیں پھڑکے اور ہماری دینی غیرت کو جوش نہیں آئے تو پھر کون سا وقت ہوگا جب ہم اللہ سے کئے ہوئے اس وعدہ کو پورا کرسکیں گے کہ ہم نے اپنے پورے وجود کو خدا کے ہاتھوں بیچ دیا ہے،(توبہ:۱۱۱) اور یہ کہ ہمارا کچھ نہیں ہے، ہم اللہ اور صرف اللہ کے لئے ہیں: إن صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین (انعام:۱۶۲)

☆☆☆

❑ شکوہ

یونیورسٹی کے مسلم اساتذہ- مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں سے

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

تعلیم اور ٹیچنگ کے پیشہ کو شریفانہ پیشہ Noble Profesion کہا جاتا ہے۔معلم اور ٹیچر وہ شخص ہوتا ہے جس کا دماغ علم وافکار ونظریات کا خزانہ ہوتا ہے جس طرح سے ٹنکی میں پانی ہوتا ہے اور وہ پانی ٹونٹی سے نکلتا ہے اسی طرح سے ایک ٹیچر یا ادیب یا عالم کی زبان اور قلم سے علم وادب کا چشمہ ابلتا ہے۔اگر کوئی شخص کسی بڑے تعلیمی ادارہ، یونیورسٹی میں استاد ہو تو وہ اپنے علم اور افکار ونظریات کی ترسیل واشاعت کا کام بڑے پیمانہ پر انجام دے سکتا ہے۔اس کا کلاس روم صرف وہ کمرہ نہیں ہوتا ہے جہاں وہ طلبہ کے سامنے لکچر دیتا ہے بلکہ پورا شہر اور پورا ملک اس کے دائرہ تعلیم وتربیت میں داخل ہوتا ہے بلکہ دنیا کا ہر شخص اس کا حلقہ بگوش ہوتا ہے۔اگر یہ حقیقت نہیں ہے تو ہر سال ہر استاد کو یونیورسٹی کے فارم پر یہ صراحت کیوں کرنی پڑتی ہے کہ اس نے اس سال یونیورسٹی کے باہر کتنے لکچر دیئے اور کتنے قومی اور کتنے بین الاقوامی سمینار میں شرکت کی، کتنے رسالوں میں اس کے مقالات اور ریسرچ پیپر شائع ہوئے اور اس نے کتنی کتابیں لکھیں اور علم و ادب کی دنیا میں اس نے کیا اضافہ کیا۔یہ غلط تصور ہے کہ استاد کا دائرہ علم وعمل کلاس روم کی چہار دیواری تک محدود ہے اور اسی غلط تصور کی وجہ سے ان کی صلاحیتوں کا دائرہ محدود ہوکر رہ جاتا ہے۔کسی بے تصنیف اور بے توفیق اور بے فیض استاذ کو دیکھ کر بے ثمر اور خزاں رسیدہ شجر کا خیال آتا ہے یا اس غنچہ کا جو بن کھلے مرجھا گیا ہو۔یا اس عورت کا جو بانجھ ہو چکی ہو۔

تصنیف وتحقیق سے قطع نظر عصری جامعات کے جو مسلم اساتذہ ہیں خواہ وہ کسی شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کے لئے لازم ہے کہ ملک کے اپنے شہر کے غیر مسلم علمی حلقوں میں وہ رول ادا کریں جو ان کے مسلمان ہونے کا اور حالات کا تقاضا ہے۔سب سے پہلے بنیادی طور پر یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ اور سیاسی مشکلات اور حق تلفیوں کی اصلی وجہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہیں جو سماج میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ خلیج ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حائل ہے۔غلط فہمیوں کو ڈائلاگ اور مذاکرات اور سمپوزیم کے ذریعہ اگر ختم کیا جائے اور اگر علمی سطح پر تعصّبات کے خارزار کو ختم کر دیا جائے اور سماج کے غیر مسلم دانشوروں کو اپنا ہم نوا بنالیا جائے تو یہ سب سے بڑا امپاورمنٹ ہوگا جو اس ملک کے مسلمانوں کو حاصل ہوگا۔غیر مسلم دانشور حضرات اپنی محفلوں میں اگر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے خزانہ دماغ میں کانٹے بھرے ہوئے ہیں۔اس خارزار کو ختم کرنا مسلم دانشوروں کا کام ہے۔اس اہم کام کے لئے با مقصد زندگی گذارنے کا منصوبہ بنانا ہوگا ایسا منصوبہ جس میں غیر مسلم اساتذہ اور دانشوروں سے زیادہ سے زیادہ علمی سطح پر اختلاط اور رابطہ ہو اور ان کے ساتھ مسلمانون کے ایشوز زیر بحث آئیں اور ان ایشوز پر انگریزی زبان میں گفتگو Discourse پوری تیاری کے ساتھ ہو۔مسلم ایشوز پر اور مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں کے موضوع پر دلوں کو چھونے والا اور ذہن کو متاثر کرنیوالا انگریزی زبان میں مدلل لٹریچر تیار کیا جائے۔یونیورسیٹی میں پڑھانے والے مسلم اساتذہ کی اولین ذمہ داری

علمی سطح پر ہر ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنی ہے۔ علمی سطح پر کام کا مطلب یہ ہے کہ سمیناروں کے ذریعہ یا انگریزی میں آرٹیکل اور لٹریچر کے ذریعہ۔ یہ اہم کام ہے جو عصری جامعات کے مسلم اساتذہ کو کرنا چاہئے۔ یہ وہ کام ہے جو یونیورسیٹی کے اساتذہ علماء کرام سے زیادہ بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ یہ وہ کام ہے جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ عصری جامعات کے مسلم اساتذہ میں شاید ہی کوئی ہوگا جسے مذکورہ تجویز سے اختلاف ہوگا۔ لیکن تجویز سے اتفاق کرنا اور عملی طور سے کام کا آغاز کرنا الگ چیزیں ہیں۔ عملی کام کا آغاز اس طرح ہونا چاہئے کہ ہم خیال اساتذہ ایک جگہ مل کر بیٹھیں اور کام کا عملی منصوبہ بنائیں ا۔ مشاورتی گفتگو میں پہلے ایک موضوع طے کریں مثال کے طور پر بابری مسجد یا مسلم حکمرانوں کے غیر مسلموں پر ظلم کا افسانہ ۲۔ موضوع سے متعلق انگریزی اور اردو میں لٹریچر کی فراہمی کا انتظام کریں اور ان کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں بالکل اس طرح جس طرح ایک وکیل عدالت میں بحث کی تیاری کرتا ہے ۳۔ اس کے بعد اصل ڈائلاگ سے پہلے موضوع پر انگریزی میں گفتگو کی ریہرسل کرلیں ۴۔ اس کے بعد چند غیر مسلم اساتذہ اور شہر کے چند غیر مسلم دانشوروں کو دوستانہ ماحول میں موضوع پر گفتگو کی دعوت دیں۔ اس پلیٹ فارم کا کوئی بھی نام رکھا جاسکتا ہے اور یہ کام ہر شہر میں ہو اور ہر بار مناقشہ کے لئے کوئی نیا موضوع اختیار کرلیا جائے اور اظہار خیال کے لئے غیر مسلم دانشوروں کو دعوت دی جائے۔

ہندوستان میں مسلمان مختلف نشیب و فراز سے گذرے ہیں انہیں بار بار مختلف نوعیت کے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اب اس زمانہ کا یہ نیا چیلنج ہے کہ ان کو غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے جس کی تہہ برادران وطن کے دماغوں میں بیٹھ چکی ہے اور جن کا وائرس افکار کو زہر آلود کر چکا ہے۔ برادران وطن کی غلط فہمیوں کے خارزار کو وور کرنے کے بعد بڑی حد تک مشکلات کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ اس کام کے لئے تمام عصری جامعات کے مسلم اساتذہ کو اور دانشور حضرات کو اپنا رول ادا کرنا ہوگا جو حضرات با مقصد زندگی گذارتے ہیں وہ اپنے اس مشن کی تکمیل کو اپنے مقصد میں شامل کرلیں اور اس کی منصوبہ بندی کریں۔

ہندو مسلم خلیج کو دور کرنے کے اس درجہ اول کی اہمیت کے کام کے بعد دوسرا کام مسلمانوں کی نئی نسل میں جدید تعلیم کے فروغ کے لئے رہنمائی کرنا ہے۔ دنیا کی تمام قوموں میں مسلمان عصری تعلیم کے میدان میں سب سے زیادہ پسماندہ ہیں جامعات کے مسلم اساتذہ کو اس تعلیمی زبوں حالی کا مداوا کرنا ہے اور زبان و قلم کو اور اپنی قوت عمل کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا ہے۔ یونیورسیٹی کے اساتذہ کو ایک تنظیمی طاقت بنا کر یہ سب کام انجام دینا چاہئے۔ اگر یہ دونوں مذکورہ بالا کام یونیورسیٹی کے اساتذہ نہیں کرتے ہیں اور صرف معیار زندگی کی بلندی کی ریس میں شامل رہتے ہیں اور صرف عیش و آرام کی زندگی گذارنا پسند کرتے ہیں تو ان کی زندگی اس حدیث نبوی کے مصداق ہے جس میں کہا گیا ہے جس نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی فکر نہیں کی وہ مسلمان ہی نہیں ہے من لم یهتم بامر المسلمین فلیس منهم ۔غیر مسلموں کے درمیان مذاکرات کے کاموں کے لئے یونیورسیٹی کے اساتذہ کو انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز سے بھی رہنمائی مل سکتی ہے۔ اس ادارہ کو پورے ملک میں عصری جامعات کے مسلم اساتذہ کے ذریعہ اس کام کا آغاز کرنا چاہئے۔

اب حرفے چند عربی زبان اور ورنکلر لینگوجز کے اساتذہ کے بارے میں، یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے جو اساتذہ ہوتے ہیں ان کی غالب اکثریت کسی دینی مدرسہ کا پس منظر رکھتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے مسائل اور مشکلات کا جو چیلنج ہے اسے دینی جماعتوں نے اور علماء دین نے قبول کیا ہے۔ علماء دین کی قیادت نے آزادی کے بعد سے ان مشکلات کے سامنے سپر انداز ہونے کی نہیں بلکہ سینہ سپر ہونے کی کوشش کی ہے۔ یونیورسٹی کے مدرسہ بیک گراؤنڈ کے اساتذہ نے نہ صرف یہ کہ مسلم قیادت کی کوئی دستگیری، رہبری یا ہمسفری نہیں کی بلکہ ان سے ایک فاصلہ قائم رکھا اور یہ مفروضہ قائم کرلیا کہ مسلمانوں کے مسائل جو لاینحل ہیں ان کو حل کرنے کی ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے، یہ کام دینی جماعتیں کریں تو کریں۔ یہی سوچ اور یہی کج کلاہی اور یہی

ادائے بے نیازی اور بے فکری اور اجتماعی کاموں سے طرز تغافل در اصل یونیورسٹی کا وائرس ہے۔ اور یہ وائرس جب کسی مسلم استاذ کو لگ جاتا ہے تو وہ بے باکی اور بے خوفی کو ختم کر دیتا ہے اور اس کے اندر ''وہن'' بزدلی پیدا کرتا ہے اسے قوم وملت اور دین و مذہب کی متنوع ذمہ داریوں سے کاٹ دیتا ہے۔ اور انہیں خود غرض بنا دیتا ہے۔ پھر انہیں نہ تو مسلمانوں کے آشیانوں کے لٹنے کا کرب رہتا ہے اور نہ نشیمن بنانے کی خواہش اور نہ اجتماعی زندگی میں لگنے والے زخموں کا کوئی افسوس اور غم۔ خود غرضانہ اور بے نیازانہ زندگی گزارنے والے ایسے اساتذہ کے نزدیک تنخواہ قاضی الحاجات اور کاشف البلیات ہوتی ہے اور اسی موٹی تنخواہ کے پرت میں وہ خطرناک وائرس ہوتا ہے جو ان اساتذہ کو لگ جاتا ہے۔ اور ان کو ہر دینی، مذہبی، قومی اور ملی سرگرمی سے کنارہ کشی پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ قوم وملت کی رہبری سے علمی، تحریری اور تقریری سطح پر بھی قاصر رہ جاتے ہیں۔ اگر امت و ملت اسلامیہ، اسلام اور عالم اسلام اور مسلمانوں کے روح فرسا حالات کے لئے ان کے یہاں کوئی آتشِ غم اور سوز دروں نہیں ہے کہ تحریر وتقریر کے ذریعہ اس کا اظہار ہو سکے تو جانے دیجئے کہ یہ رتبہ بلند ہر شخص کو نہیں ملتا ہے، نہ یہ گرد ملال ہر شخص کو نصیب ہوتی ہے۔

ملت اسلامیہ کے مسائل سے عملی وابستگی نہ سہی افسوس اس بات کا ہے کہ خالص علمی اور ادبی سطح پر بھی انہیں جو کام کرنا چاہئے وہ بھی وہ انجام نہیں دیتے، مثال کے طور پر اگر اردو کے مشاہیر شعر وادب سے عرب دنیا ناواقف ہے تو یہ قصور کس کا ہے؟ کیا عربی زبان وادب کے اساتذہ اس کے ذمہ دار نہیں؟ ہندوستان کے دانشور مسلم یا غیر مسلم حضرات ابوالعلاء معری، حافظ اور شوقی اور نجیب محفوظ، طہ حسین اور جبران خلیل جبران سے کم یا زیادہ، انگریزی یا اردو ترجمہ کے ذریعہ واقف ہیں لیکن عرب دنیا کے دانشور میر تقی میر، غالب، ذوق، پریم چند اور قرۃ العین حیدر وغیرہ سے بالکل واقف نہیں ہیں، عرب دنیا صرف اقبال کے نام سے آشنا ہے لیکن اس تعارف میں جامعات کے عربی اساتذہ کا کوئی حصہ نہیں۔ ٹیگور سے بھی عرب دنیا واقف ہے اس میں بھی ہندوستانی جامعات کے شعبۂ عربی کے اساتذہ کا کوئی حصہ نہیں۔ نجیب محفوظ کو نوبل انعام مل گیا کیونکہ اس کے ناول کے ترجمے دوسری زبانوں میں موجود تھے۔ قرۃ العین حیدر کو نہیں مل سکا کیونکہ اس کے ناولوں اور افسانوں کا کسی نے ترجمہ نہیں کیا تھا۔ راقم سطور نے قرۃ العین حیدر کے ناول بھی پڑھے ہیں اور نجیب محفوظ کے عربی ناول بھی، اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کا فنی مقام نجیب محفوظ کے مقابلہ میں بہتر، برتر اور بلند تر ہے اور قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں، افسانوں اور ناولوں میں دانشوری اور علم و ادب سے آگہی کا جو تابناک عنصر ملتا ہے وہ نجیب محفوظ کی تحریروں میں مفقود ہے۔ حال میں معروف ادیب شمس الرحمٰن فارقی نے اپنے شاہکار ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کا بقلم خود انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ جناب رضوان اللہ نے اسی طرح اپنے اردو دیوان ''عکس خیال'' کا بقلم خود انگریزی ترجمہ My Reflections کے نام سے شائع کیا ہے۔ مشہور انگریزی نظموں کا اردو منظوم ترجمہ ''نسیم مغرب'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ خلاصہ تحریر یہ ہے کہ اگر عربی زبان کے اساتذہ نے علمی اور قلمی سطح پر علمی اور ادبی ترجمہ کا کام کیا ہوتا تو اردو زبان وادب کا تعارف عرب دنیا میں بھی ہو جاتا۔ اسی طرح سے جس طرح سے رباعیات عمر خیام کے انگریزی اور عربی ترجمہ سے علم و ادب کی پوری دنیا واقف ہو چکی ہے۔ اردو میں عربی سے مذہبی کتابوں کے ترجمے بہت ہوئے ہیں۔ قرآن وحدیث، تصوف، فقہ، سیر وتاریخ مختلف علوم وفنون کے موضوعات پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں اور کتابوں کے ترجمے کئے گئے ہیں لیکن اس میدان میں بھی عصری جامعات کے عربی اساتذہ کا حصہ تقریباً صفر کے برابر ہے۔

علم وادب کی دنیا میں ترجمہ کا کام کلیدی اہمیت کا حامل ہے، یہ وہ روزن ہے جس سے دوسری زبانوں کی علمی اور تخلیقی سرگرمیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور افکار نو بہ نو کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اور تہذیبی لین دین کا عمل جاری ہوتا ہے۔ تخلیق کی گاڑی ایک پٹری پر چلتی ہے اور ترجمہ کی گاڑی دو پٹریوں پر چلتی ہے۔ تخلیقی کام یا علمی کام کے لئے ایک زبان کا جاننا کافی ہوتا ہے لیکن ترجمہ کے لئے دو زبانوں کا جاننا لازمی ہے۔ ترجمہ کے ذریعہ ہم دوسری زبانوں کے افکار اور اقدار سے آشنا ہوتے ہیں۔ اب جبکہ دنیا کی طنابیں کھینچ دی

گئی ہیں کوئی زبان ترجمہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ترجمہ کی اہمیت کسی طرح تخلیق وتصنیف سے کم نہیں۔ترجمہ کے ذریعہ نئی آگہی کا نور پھیلایا جاتا ہے، نئے چراغ فکر ونظر جلائے جاتے ہیں۔تخلیق کار تاج محل تخلیق کرتا ہے مترجم اس تخلیق کے جلوے ساری دنیا میں پھیلاتا ہے، ترجمہ اگر کامیاب ہوتو وہ تخلیقی ادب کا حصہ بن جاتا ہے۔ترجمہ کی کامیابی کے لئے ضروری ہے زبان شگفتہ ہواور الفاظ کی نشست جملوں کی ساخت اجنبی نہ معلوم ہو۔ترجمہ ہی کے ذیعہ کسی قوم و زبان کی تحقیقات اور ادبی شاہکار پوری انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں۔سونا جب تک کان کے اندر دفن ہوتا ہے اسے قوم کی ملکیت نہیں قرار دیا جاسکتا۔عربی زبان کے اساتذہ کواور دیگر اہل علم کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بوعلی سینا، ابن رشد، ابونصر فارابی وغیرہ کی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا تو سونا علم کی کان سے نکل کر عالم انسانیت کی دولت بن گیا اور اسی سے یورپ میں نشات ثانیہ کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں دارالترجمہ حیدرآباد کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور اردو زبان کی دولت میں اضافہ کیا۔ زبان وادب کے اساتذہ کو ترجمہ کی اہمیت کا احساس ہونا چاہئے اور انہیں ان موضوعات کو اختیار کرنا چاہئے جس سے ہندوستانی اور اسلامی تہذیب کے وقار میں اضافہ ہو ورنہ محض کیریئر کے لئے یا زرکشی، زرگری کے لئے یا انٹرویو میں اپنا پبلیشڈ ورک دکھانے کے لئے کچھ الٹے سیدھے کام کرلینا اور انہیں چھپا کر رکھنا صلاحیتوں کا زیاں ہے اور تعلیم کے مقدس پیشہ کے ساتھ بے وفائی ہے۔ یونیورسٹی کے مسلم استاد کے شایان شان کام کوئی دینی مدرسہ قائم کرنا بھی نہیں ہے اور نہ مسجد میں یا جماعت میں چلہ کشی کرنا ہے بلکہ اس ملک میں دانشورانہ سطح پر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی گرہیں کھولنا ہے یا ٹھوس دانشورانہ علمی کام انجام دینا ہے یا مسلمانوں کی ذہن سازی کرنا ہے۔قرطاس وقلم سے وابستگی جامعہ کے استاذ کی اولین ذمہ داری ہے۔لکھنا ہمیشہ بہت زیادہ پڑھنے سے آتا ہے یونیورسیٹی کے مسلم اساتذہ۔الاماشاءاللہ۔پڑھتے ہی نہیں ہیں۔ان میں سے بیشتر کو معلوم ہی نہیں ہوتا ہے کہ دنیا میں پرنٹ ورلڈ میں مختلف موضوعات پر کیسی انقلاب خیز اور زلزلہ انگیز اور معلومات افزا کتابیں سامنے آرہی ہیں کتابوں کی دکانوں پر جانے کا انہیں کوئی شوق نہیں ہوتا ہے، ان کی تنخواہ کا ایک فی صد حصہ بھی کتابوں کی خریداری پر خرچ نہیں ہوتا ہے۔ان میں بہت سے لوگ اردو اخبار تک خرید کر نہیں پڑھتے اور پوچھنے پر کہتے ہیں کہ وہ آن لائن پڑھ لیا کرتے ہیں۔انہیں یہ بھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ سب لوگ اگر آن لائن اخبارات پڑھ لیا کریں گے تو اخبارت کا چھپنا تو بند ہوجائے گا۔علاوہ ازیں یہ تجربہ ہے کہ آن لائن اخبار پڑھنے میں وقت کی پابندی نہیں ہوتی ہے اور بار بار ناغہ بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے حالات حاضرہ کے بارے میں مطالعہ کا تسلسل ٹوٹتا ہے۔یہ سب باتیں اردو زبان اور ملت کے بارے میں بے حسی کی آئینہ دار ہیں۔پروفیسر حضرات کے یہاں بک کے بجائے چک بک کا اہتمام پایا جاتا ہے بنگلہ اور گملہ موٹر اور نوکر یا شوفر کسی چیز کی ان کے پاس کمی نہیں ہوتی ہے۔معیار بندگی ان کا بلند ہو یا نہ ہو معیار زندگی ان کا ہمیشہ بلند ہوتا رہتا ہے۔ان کی مالی سطح اتنی بلند ہوجاتی ہے کہ ستارے گرد راہ ہوتے ہیں اور علمی سطح اتنی پست ہوتی ہے کہ غبار راہ بھی بلند تر ہوتا ہے۔کئی سال گذر جاتے ہیں ان کی کوئی علمی کتاب سامنے نہیں آتی ہے قرآن کریم نے قحط سالی کے سات سال کو ''سبع عجاف'' کہا ہے کم از کم سات سال کے طویل وقفہ کے بعد تو ذہن کی زرخیزی اور شادابی کا کوئی ثبوت سامنے آنا چاہئے۔ورنہ یہ فیصلہ صادر کرنا ہوگا کہ ان کے فکر کی سطح بالکل بنجر اور روئیدگی کی صلاحیت سے محروم ہوچکی ہے لیکن اساتذہ اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرتے۔ان کے طلسم خیال میں ایوان علم وادب میں ان کے نام کو پھر بھی باقی رہنا چاہئے اور سمیناروں میں ان کے نام دعوت نامہ آنا چاہئے۔ہر استاد پہلے لکچرر سے ریڈر اور ریڈر سے پروفیسر بننے کے لئے بیتاب اور کیریر کی ترقی کیلئے ماہی بے آب ہوتا ہے۔جب تک وہ لکچرر رہتا ہے صرف اس غرض سے کچھ لکھتا پڑھتا ہے کہ ریڈر کے انٹرویو میں اسے ثابت کرنا ہوتا ہے کہ ''ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں'' اور پھر اسی نیت سے وہ کچھ لکھ پڑھ لیتا ہے کہ اچھی پروفیسر بننے کا آخری مرحلہ باقی ہے۔پروفیسر بننے کے بعد لکھنے پڑھنے کی

کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔علم وفکر وادب کی ثروت میں اضافہ کرنا دور دوران اساتذہ کے حاشیہ خیال میں نہیں ہوتا ہے۔نہ عام طور ان کو علمی کاموں کا شوق ہوتا ہے نہ مزاج۔بعض تو ایسے اساتذہ بھی ہوتے ہیں جو اپنا پبلیشڈ ورک بڑھانے کے لئے دوسروں سے کتابیں لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرتے ہیں اور پس پردہ لکھنے والوں کو معاوضہ ادا کرتے ہیں۔قرآن کی آیت ''یریدون أن یحمدوا بما لم یفعلوا'' کی مجسم تصویر۔اگر مسلم اساتذہ کی یہ ساری تصویر درست ہے تو بہت شرمناک ہے۔عربی کے اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ اپنی علمی ذمہ داریوں کو ادا کریں اور ان کی تصویر پر لگے ہوئے سیاہ دھبوں کو مٹائیں۔عام طور پر یونیورسیٹی کے اساتذہ سمینار یا اور کسی موقع پر آپس ملتے ہیں تو ان کی گفتگو کا موضوع کوئی کتاب نہیں ہوتی ہے وہ کسی علمی مسئلہ پر یا کسی تحریر یا نظریہ کے بارے میں تبادلہ خیال نہیں کرتے ہیں وہ نئے آنے والے اسکیل پر یا نئے انکریمنٹ کے بارے میں باتیں کریں گے یا کسی بدعنوانی کی افواہ کو موضوع گفتگو بنائیں گے اس سے ان اساتذہ کی ذہنی سطح کا اندازہ ہوتا ہے۔کیا فرق ہے ان اساتذہ میں اور اس موچی میں جو شام کو پائی پائی کا حساب کرتا ہے پھر مسرور ہوتا ہے یا مغموم ہوجاتا ہے۔دونوں کا ذہن مالیات اور اقتصادیات میں الجھا رہتا ہے۔تنخواہ یا اسکیل کے بارے میں کبھی کبھار گفتگو میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ہمیشہ یہی باتیں ہوں علمی مسائل افکار ونظریات موضوع گفتگو کبھی نہ بنیں یہ قابل اعتراض بات ہے۔ایک اچھا دانشور یا پروفیسر تنخواہ اور اسکیل یا اپنے شعبہ کی سیاست وغیرہ کے بارے میں زیادہ بات چیت کرتے ہوئے ویسے ہی شرماتا ہے جیسے دیندار، پرہیزگار، عبادت گذار مسلمان عشق مجازی یا جنس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے شرماتا ہے اور پسینہ پسینہ ہوجاتا ہے۔انسان کی گفتگو اس بات کی آئینہ دار ہوتی ہے کہ اس کے دماغ میں کیا بھرا ہوا ہے اور اس کی ذہنی سطح کیا ہے۔

عصری جامعات کے اساتذہ میں شوق علم کیوں ختم ہوگیا ہے اور ان کا نشتر تحقیق اب کیوں کند ہوگیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے اب زندہ آئیڈیل باقی نہیں رہ گئے ہیں اور اہل علم اور اہل ادب کی صحبت میسر نہیں۔اچھا اسکالر اور اچھا دانشور بننے کے لئے اچھے اسکالر اور اچھے دانشور کی صحبت ضروری ہے۔علم کی دنیا میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، علم کے ذوق کے لئے زندگی کے ساز کو ایک اچھے اسکالر کے مضراب حیات کی ضرورت ہوتی ہے، ایک باکمال شخص کی حیات بخش شبنم سے بہت سے اساتذہ اور طلبہ کا غنچہ حیات شگفتہ ہوتا ہے۔اگر یونیورسٹی کے اساتذہ ہر وقت اسمارٹ فون پر سوشل میڈیا کے سمندر میں شناوری کرتے رہیں گے تو نہ وہ خود صاحب کمال بن سکتے ہیں نہ اپنے طلبہ کو باکمال بنا سکتے ہیں۔سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے مفاسد بھی بہت ہیں اور ان کی اہمیت بھی اپنی جگہ پر ہے، علم کا کوئی شعبہ ہو اس کے بارے میں ''گوگل ''فوراعلاء الدین کے چراغ کی طرح معلومات لے کر حاضر ہوجاتا ہے لیکن اس چراغ سے استفادہ کتابوں اور کتاب خانوں سے استفادہ کی قیمت پر نہیں ہونا چاہئے اچھے اور مثالی استاد سے رابطہ ہمیشہ قائم رکھنا چاہئے مثالی استاد کے فقدان کی تلافی ایک حد تک صرف کتابوں کے ذریعہ ممکن ہے۔ضروری ہے کہ ہم اپنے قریب کے زمانہ کے محققین اور مفکرین کی کتابیں مسلسل پڑھتے رہیں۔مثال کے طور پر عربی اور اردو اور اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ اگر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتابیں پڑھیں جن کا انتقال چند سال پہلے ۹۴ سال کی عمر میں امریکا میں ہوا تو ان کے سامنے ایک آئیڈیل رہے گا ایک مثالی صورت سامنے رہے گی۔ڈاکٹر حمید اللہ نے قرآن وحدیث فقہ وقانون اسلام وبین الاقوامی قانون سیرت اور تاریخ کو موضوع بحث بنایا تھا۔ڈاکٹر حمید اللہ پر پروفیسر عبدالرحمٰن مؤمن کی کتاب منظر عام پر آچکی ہے اور ان پر راقم الحروف کا مرتب کردہ مجموعہ مضامین انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈیز کی طرف سے زیر اشاعت ہے۔ڈاکٹر حمید اللہ ہی کی طرح ایک بلند معیار کے محقق فؤاد سیزگین کا بھی چند روز پہلے اگست ۲۰۱۸ میں ۹۴ سال کی عمر میں استنبول ترکی میں انتقال ہوا۔وہ بھی بہت بڑے ممتاز مؤرخ اور دانشور تھے، وہ بھی ڈاکٹر حمید اللہ کی طرح کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور مسلسل ۱۷ گھنٹے مطالعہ اور تحقیق میں مصروف رہا کرتے تھے جس طرح ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآباد چھوڑ کر فرانس چلے گئے تھے، اسی طرح ڈاکٹر فؤاد

سیزگین کوفوجی انقلاب کی وجہ سے استنبول چھوڑ کر جرمنی میں قیام کرنا پڑا تھا۔اور وہاں انہوں نے مصادر امام بخاری پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی جو بعد میں دراسات حول مصادر البخاری کے نام سے شائع ہوئی۔دوبارہ انہوں نے جابر بن حیان پر مقالہ لکھ کر نئے سرے سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی جرمنی اور فرانس دونوں جگہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ڈاکٹر فواد سیزگین کی مشہور کتاب تاریخ التراث العربی ۱۲ جلدوں میں ہے اور وہ کتاب خانہ ناقص اور نامکمل سمجھا جاتا ہے جہاں یہ اہم کتاب موجود نہ ہو۔یہ کتاب اسلامی مصادر و مراجع کا سب سے بڑا ماخذ ہے انہوں نے علوم اسلامیہ پر رسرچ اور تحقیق کا سب سے بڑا ادارہ استنبول میں قائم کیا تھا۔اور بھی مصنفین ہیں جن کی کتابیں علم کا ذوق پیدا کرتی ہیں۔اگر اہل علم کی صحبت میسر نہیں تو وقیع اور فکر انگیز کتابیں ان کا بدل بن سکتی ہیں۔

تحریر کا اصل موضوع تھا ہندوستان کے موجودہ حالات اور یونیورسٹی کے مسلم اساتذہ کی ذمہ دریاں اور یہ کہ کشتی جو بھنور میں پھنس گئی ہے اسے کیسے ڈوبنے سے بچایا جائے۔اسی ذیل میں اساتذہ کا ذکر آ گیا جن پر الطاف حسین حالی کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے"پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی"۔یونیورسیٹی کے مسلم اساتذہ کا یہ منظر نامہ جو اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے اگر چہ مایوس کن ہے لیکن شاید یہ تحریر کچھ اساتذہ کے لئے ہمت افزا اور شوق انگیز بن جائے اور ان کے دل میں اپنے مقام و مرتبہ کا احساس پیدا ہو جائے اور ان کے اندر اپنے پیشہ کے ساتھ وفاداری اور پاس داری اور ذمہ داری کا جذبہ ابھر آئے کہ یہی مقصود و مطلوب ہے۔ مضمون میں جس اہم ترین کام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ نہ سہی زیادہ تر اساتذہ اپنے عہدہ کا حق بھی ادا نہیں کرتے ہیں لکھنے پڑھنے سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں وہ اس گائے کے مانند ہیں جو نہ دودھ دیتی ہے نہ بچہ دیتی ہے۔شعبہ عربی کے بھی دو تین ہی ایسے مسلم اساتذہ ہیں جو مستثنی ہیں۔دہلی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر محمد نعمان خان نے قدیم ہندوستانی تاریخ پر ایک کتاب کا انگریزی سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔جے این یو کے پروفیسر احسان الرحمٰن نے بعض ہندوستانی کہانیوں کے عربی ترجمے کئے، پروفیسر ثناء اللہ ندوی نے بلند معیار کے علمی کام کئے ہیں، ڈاکٹر مظفر عالم نے ہندوستان میں غیر مسلموں کی عربی خدمات پر انگریزی میں اچھی کتاب لکھی۔ایک دو نام مشکل سے اور لئے جاسکتے ہیں، لیکن یہ کام اتنے کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔عام طور پر مسلم اساتذہ پر علمی مردنی چھائی رہتی ہے۔شعبہ عربی کو دیکھئے وہاں زندگی سے اور حالات حاضرہ سے کوئی تعلق نظر نہیں آئے گا نہ ان کو اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کا کوئی احساس ہوگا۔ایسا لگتا ہے کہ بستی میں آگ لگ چکی ہے اور یہ حضرات کسی درخت یا دیوار کے سایہ میں آرام کر رہے ہیں۔پی ایچ ڈی کے لئے بھی جو موضوعات اختیار کئے جاتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں، ایسا لگتا ہے کہ فکر کے سوتے خشک ہو چکے ہیں مثلاً کوئی ہندوستان میں بیٹھ کر طہ حسین پر یا نجیب محفوظ پر عربی میں مقالہ لکھے تو اسے حماقت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔اب کسی یونیورسیٹی سے جوئے حیات ابلتی نہیں ہے۔نہ کہیں درد و سوز ہے نہ بحر کی موجوں میں اضطراب ہے، کہیں علم کا ساز نہ ادب کی آواز، نہ کوئی خیال نو، نہ جرآت اندیشہ نہ ترقی و تعمیر کا منصوبہ، نہ عزم و ارادہ نہ کوئی منزل نہ کوئی جادہ۔بعض اساتذہ کی شخصیت حیوان ناطق کے بجائے حیوان کاسب (کمانے والا جانور) کی مصداق بن گئی ہے۔بعض اساتذہ تو معمولی درجہ کے غیر علمی کاروباری نوعیت کے ترجمہ کے کاموں کے لئے زندگی وقف کر دیتے ہیں اور "کون بنتا ہے کروڑ پتی" کی ریس میں شامل ہو جاتے ہیں۔انہیں اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کا جی چاہتا ہے:

کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

حج بیت اللہ- ہم کوچۂ حبیب میں بھی سر کے بل چلے

ابوالفضل عبداللہ

لغوی اور شرعی معنی:

حج ،حَج ،اسی طرح حُجّہ یاحِجّہ حاکے زبر اور زیر کے ساتھ۔ لفظی معنی میں کسی جگہ کا قصد کرنا اور آنا لیکن حج کے شرعی یا اصطلاحی معنی ہیں تعظیم کی نیت سے مخصوص افعال کے ساتھ خانۂ کعبہ کا قصد کرنا اور اس کی طرف آنا۔

فضیلت اور ثواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:إن أول بيت وضع للناس للذى ببكة مباركا وهدى للعالمين، فيه آيات بينٰت مقام ابراهيم ومن دخله كان آمنا، (آل عمران:۹۶،۹۷)

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لئے تعمیر ہوئی، وہ وہی ہے جو مکہ مکرمہ میں ہے، اسے خیر و برکت دی گئی ہے اور دنیا جہان والوں کے لئے اسے مرکزِ ہدایت بنایا گیا ہے، اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوگیا، مامون ہوگیا۔

حج کی فضیلت وعظمت میں متعدد احادیث نبی پاک ﷺ سے ثابت ہیں:

حج افضل ترین اعمال میں سے: آپ ﷺ سے سوال کیا گیا ''سب سے افضل عمل کون سا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا''۔ سوال کیا گیا: ''پھر''۔ فرمایا: ''حج مبرور''۔ (متفق علیہ) علماء فرماتے ہیں: حج مبرور وہ حج ہے جس میں کوئی گناہ نہ کیا جائے، جس میں کوئی ریاکاری، شہرت کا جذبہ شہوانی نفسانی فعل اور بدکاری یا لڑائی جھگڑا نہ ہو، علماء فرماتے ہیں:

حض مبرور کی پہچان یہ ہے کہ اس کے بعد حاجی پہلے کی نسبت بہتر بن کر لوٹے اور گناہ کی کوشش نہ کرے، حضرت حسن بصریؒ فرماتے تھے یہ وہ حج ہے جس کے بعد حاجی دنیا سے بے رغبت ہو جائے اور آخرت کا طلبگار بن جائے۔

حج گناهوں کا کفارہ ہے: بخاری ومسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص حج کرتا ہے اس میں نہ شہوانی فعل کرے اور نہ بدکاری کرے تو وہ (گناہوں سے پاک ہوکر) اس طرح لوٹتا ہے، جیسا کہ وہ اس وقت تھا، جب کہ اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا۔

مسلم شریف میں حضرت عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت بٹھادی تو میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا: ''ہاتھ بڑھایئے میں آپؐ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں''، آپ ﷺ نے اپنا مبارک ہاتھ پھیلا دیا لیکن میں نے اپنا ہاتھ کھینچ

لیا۔آپ ﷺ نے فرمایا:''یہ کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا: ''میں ایک شرط رکھنا چاہتا ہوں''، آپ ﷺ نے فرمایا وہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا:''وہ یہ ہے کہ میرے پچھلے گناہ معاف کردئے جائیں گے''۔آپ ﷺ نے فرمایا:''اے عمرو! کیا تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اسلام پچھلے گناہوں کو ختم کردیتا ہے، ہجرت پچھلے گناہوں کو ختم کردیتی ہے اور حج پچھلے گناہوں کو ختم کردیتا ہے۔

فرضیت واھمیت: حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے، جس کی فرضیت قرآن پاک، سنت مقدسہ اور اجماعِ امت تینوں سے ثابت ہے جس کا منکر کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا ومن كفر فان الله غنى عن العالمين (آل عمران:۹۷)لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے اور جو اس حکم کی پیروی سے انکار کرے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے''۔

ابوداؤد میں حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام میں صیروت نہیں ہے، یعنی استطاعت کے باوجود حج کئے بغیر مرجانا۔حضرت عبدالرحمٰن بن سابطؒ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص حج کئے بغیر مرگیا حالانکہ اس کے راستے میں نہ کوئی مرض، نہ کوئی ظالم حکمراں اور نہ کوئی واضح ضرورت حائل ہوئی، تو وہ چاہے یہودی ہوکر مرے یا عیسائی ہوکر جس طرح چاہے مرجائے۔ مسلمان عاقل بالغ آزاد اور مستطیع پر زندگی بھر میں ایک مرتبہ حج کرنا فرضِ عین ہے۔

اسلام پر استقامت کی دعا: صفا پر آپ ﷺ نے یہ دعا پڑھی تھی اللھم انك قلت، اعدونی استجب لكم وانك لا تخلف الميعاد، وانی اسئلك كما هديتنی للاسلام ان لا تنزعه منی حتی تتوفانی وانا مسلم، اے اللہ بے شک تیرا ارشاد ہے مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا، اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں جیسے تو نے مجھے اسلام کی دولت سے نوازا ہے، اسی طرح مجھے اس سے محروم نہ کرنا، یہاں تک کہ تو مجھے اسلام ہی پر موت دینا۔

حج کے لئے وجوب ادائیگی کی شرطیں:

(۱) صحتِ جسم اپاہج، فالج زدہ اور شیخ فانی پر حج کی ادائیگی واجب نہیں۔

(۲) سفر حج کے لئے کسی رکاوٹ کا نہ ہونا۔قیدی اور حکمراں سے خوف زدہ شخص پر حج کی ادائیگی واجب نہیں۔

(۳) راستہ کا مامون ہونا۔

(۴) عورت کے لئے شوہر یا کسی محرم کا ہونا۔

محرم وہ ہے جس سے نکاح کرنا اس عورت کے لئے جائز نہ ہو، نسب رضاعت یا مصاہرت کی وجہ سے جیسے باپ، دادا، چچا، ماموں، شوہر کا باپ، بیٹا، پوتا، بھائی، بھتیجا، بھانجا اور داماد۔

(۵) عورت کا طلاق یا موت کی عدت سے فارغ ہونا۔

حج کے صحیح ہونے کے شرائط: (۱) احرام کے بغیر حج کی ادائیگی درست نہیں، احرام نام ہے میقات سے تلبیہ کے ساتھ حج کی نیت کرنا، اور مرد کے لئے سلے ہوئے کپڑے نکال کر غیر سلے کپڑے پہننا۔

(۲) وقتِ خاص یعنی شوال ذی قعدہ اور عشرہ ذی الحجہ

میں احرام باندھنا۔

(۳) خاص مقامات یعنی وقوف کے لئے میدانِ عرفات اور طوافِ زیارت کے لئے مسجد حرام کا ہونا۔

ارکان حج:

(۱) وقوفِ عرفات یعنی ۹ ذی الحجۃ کے زوال سے ۱۰ ذی الحجہ عبدالاضحیٰ تک میدانِ عرفات میں ٹھہرنا، ایک گھڑی ٹھہرنے سے بھی فرض ادا ہو جائے گا۔

(۲) طوافِ زیارت/افاضہ یعنی وقوفِ عرفات کے بعد بیت اللہ کا طواف کرنا۔

حج کے واجبات:

(۱) میقات سے احرام باندھنا، (۲) مزدلفہ میں ٹھہرنا خواہ ایک گھڑی کے لئے ۱۰ ذی الحجۃ میں فجر کی نماز کے بعد سے سورج نکلنے تک، (۳) قربانی کے دنوں میں طوافِ زیارت کرنا، (۴) صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا، صفا سے شروع اور مروہ پر ختم کرنا، (۵) مکہ سے باہر والوں کے لئے طوافِ صدر یا طوافِ وداع کرنا، (۶) ہر طواف کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا۔ (۷) قربانی کے دنوں میں جمرۂ اولیٰ مسجدِ خیف کے پاس، جمرۂ وسطیٰ اور جمرۂ عقبہ/کبریٰ پر شیطان کو کنکری مارنا، (۸) قربانی کے دنوں میں حدودِ حرم کے اندر حلق سر منڈانا یا تقصیر بال کٹوانا، (۹) طواف اور سعی کے دوران چھوٹی بڑی ناپاکی سے پاک ہونا، (۱۰) سلے ہوئے کپڑے نہ پہننا، چہرہ نہ ڈھانکنا سر نہ ڈھانکنا، شکار نہ کرنا، شہوانی فعل، بدکلامی لڑائی جھگڑا نہ کرنا۔

حج کی سنتیں: (۱) احرام کے وقت غسل یا وضو کرنا، (۲) سفید نئی یا دھلی ہوئی تہبند اور چادر اوڑھنا، (۳) احرام کی نیت کے بعد دو رکعت پڑھنا، (۴) تلبیہ کثرت سے پڑھنا، (۵) طوافِ قدوم مکہ سے باہر والوں کے لئے، (۶) مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران کثرت سے طواف کرنا، (۷) اضطباع یعنی طواف شروع کرنے سے پہلے اپنی چادر کا گوشہ دائیں بغل کے بیچ سے نکال کر اپنے بائیں کندھے پر ڈالنا، (۸) طواف میں رمل کرنا یعنی طوف کے پہلے تین چکروں میں چھوٹے چھوٹے قدم کے ساتھ کندھے ہلا ہلا کر چلنا، (۹) میلین اخضرین کے درمیان ہر چکر میں سعی میں تیز قدموں سے چلنا، (۱۰) حجر اسود کا چھونا اور بوسہ دینا ہر چکر کے آخر میں، (۱۱) قربانی کے دنوں میں منیٰ میں رات گزارنا، (۱۲) حجِ افراد کرنے والے کے لئے قربانی کا جانور ساتھ لانا۔

حج میں ناجائز امور: (۱) جماع اور اس کے اسباب، (۲) کوئی حرام کام کرنا، (۳) آپس میں گالی گلوچ یا جھگڑا کرنا، (۴) خوشبو استعمال کرنا، (۵) ناخن تراشنا، (۶) مرد کے لئے پائجامہ قمیص جبہ اور موزے یا سلے ہوئے کپڑے پہننا، (۷) سر یا چہرے کو ڈھانکنا، (۸) عورت کا اپنے چہرے اور ہاتھوں کو چھپانا، (۹) سر، ڈاڑھی، بغل یا زیر ناف بال صاف کرنا، (۱۰) بالوں میں یا جسم پر تیل لگانا، (۱۱) حرم کا کوئی درخت کاٹنا یا گھاس اکھاڑنا، (۱۲) خشکی کا کوئی جانور شکار کرنا وہ حلال ہو یا نہ ہو۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

رشتے داروں کے ساتھ تعلقات:

بچہ سب سے زیادہ مضبوط وخوشگوار تعلقات اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ قائم کرتا ہے، لیکن عام طور پر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ دیگر افراد خانہ کے ساتھ بھی وہ حسن سلوک کرے اور ان کے ساتھ بھی اچھی طرح تعلقات نبھائے، بالخصوص ان کی تمنا ہوتی ہے کہ وہ دادا دادی اور نانا نانی کے ساتھ اچھی طرح پیش آئے جیسے یہ لوگ بچے سے بے پناہ تعلق خاطر رکھتے ہیں، لیکن در اصل غلطی یہ ہوتی ہے کہ والدین بچے پر ایک متعین سلوک تھوپتے (فرض کردیتے) ہیں کہ وہ اسی انداز میں دادا دادی کے ساتھ پیش آئے، وہ اس کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں کہ چونکہ یہی انداز ان کے شایان شان ہے اس لیے وہ ان سے اسی طرح پیش آئے، مثلا بچے سے کہا جاتا ہے ''دیکھ دادی کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آنا''، ''دادا کو اپنی حرکتوں سے عاجز نہ کرنا اور نہ غصہ دلانا''، ''کسی بھی معاملہ میں دادا سے مت جھگڑنا، اگر وہ تم سے کسی کام کا مطالبہ کریں تو فورا بجا لانا''، ''اگر تم دادا کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کروگے تو دادا تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے''، ظاہر ہے کہ یہ جملے حسن نیت پر مبنی ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر اس طرح کی پابندی عائد کردی گئی تو پھر بچہ دادا دادی اور نانا نانی کے پاس جانے سے گریز کرے گا، ان کی زیارت کا اسے اشتیاق نہیں ہوگا، اس میں یہ احساس پیدا ہوجائے گا کہ ان حضرات کے سامنے اسے اپنے مزاج کے خلاف عمل کرنا پڑے گا تاکہ ان کی توجہ اور خوشنودی حاصل ہوسکے، وہ اپنے آپ کو مجبور و محروم اور بندھا بندھایا محسوس کرے گا، کیوں کہ وہ اپنے مزاج کے مطابق عمل کرنے کے لئے آزاد نہیں ہوگا، ظاہر ہے کہ ہر آدمی کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بچہ اپنے دادا دادی اور نانا نانی اور عمر میں بڑے سبھی لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرے اور اچھی طرح پیش آئے، اس خواہش کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ دادا دادی اور نانا نانی اور دیگر بڑے بچے سے خوشگوار تعلقات استوار کریں نہ کہ والدین ترغیب وترہیب کے ذریعہ یہ تعلقات استوار کریں۔

ایک دوسری مشکل یہ پیش آتی ہے کہ بسا اوقات بچہ رشتے داروں میں سے کسی ایک سے بہت قریب ہوتا ہے اور اس سے بہت محبت کرتا ہے، کوئی بچہ چچا، ماموں، پھوپھی یا خالہ وغیرہ میں سے کسی ایک سے بے پناہ قریب ہوجاتا ہے، پھر وہ چاہتا ہے کہ زیادہ وقت اسی کے پاس گزارے، اس موقع پر بسا اوقات والدین کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا بچہ ان پر ان کے عزیز کو ترجیح دے رہا ہے، یہ فطری بات ہے کہ والدین کو ایسے موقع پر غیرت آئے اور وہ کچھ سوچیں، کیوں کہ بچہ فلاں رشتہ دار کے ساتھ بہت خوش خرم رہتا ہے، بڑے آرام سے اس کے پاس وقت گزارتا ہے جبکہ وہ اس کی روزمرہ کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں اٹھاتا، اسے والدین ہی کھلاتے پلاتے اور نہلاتے دھلاتے ہیں، اس کی صفائی ستھرائی کا خیال وہ کرتے ہیں، جبکہ اس کے ساتھ ہنستا کھیلتا کوئی اور ہے، ظاہر ہے کہ اس موضوع پر والدین اگر اس رشتہ دار سے گفتگو کرنا چاہیں تو انھیں حجاب ہوگا، جب وہ اس رشتہ دار سے بات نہیں کرسکیں گے تو پھر بچے پر کچھ غصہ اتارنا چاہیں گے، ساتھ

ہی انھیں یہ بھی احساس ہوگا کہ شاید ان سے کچھ غلطی ہورہی ہے، کوئی کمی تو ہے جس کے سبب بچے کا میلان دوسرے کی طرف زیادہ ہے، جبکہ اس سلسلہ میں اصل بات یہ ہے کہ اگر بچہ کسی قریبی رشتہ دار کے ساتھ خوش رہتا ہے اور خوشی خوشی اس کا وقت گزرتا ہے تو والدین کو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ در حقیقت ہم میں سے کوئی بھی کمال کا دعوی نہیں کرسکتا، اسی لیے جب والدین کو اس طرح کا احساس ہوتا ہے تو وہ کچھ متاثر ہوتے ہیں، ان کے اس احساس کو ان کا وہ عزیز بھی بھانپ لیتا ہے مگر وہ اس کے ازالے کے لئے کوئی اقدام نہیں کرتا۔

اس طرح کے مسئلہ میں مفید طریقہ یہ ہے کہ والدین اتہام و الزام تراشی کے اسلوب سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے عزیز سے گفتگو کریں اور اس کے سامنے اپنے احساسات وجذبات کی وضاحت کریں، قرآن مجید میں قصہ یوسف میں حضرت یعقوب کا یہ قول نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے اپنے جذبات کی تشریح کرتے ہوئے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ مجھے یہ بات غمزدہ کرتی ہے کہ تم لوگ اس کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ انه ليحزنني أن تذهبوا به ..... (یوسف:۱۳)

ایسا کرنے سے غالب گمان یہی ہے کہ وہ عزیز مثبت جواب دے گا، اور بات کو سمجھے گا، اس کی ذمہ داری بھی یہی ہے کہ وہ بات کو سمجھے اور آپسی تعاون مفاہمت سے کام لے، پھر بھی اگر سامنے والا بات نہ سمجھے تو اس عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ والدین بچہ کو اس سے اچھے تعلقات رکھنے پر حوصلہ افزائی نہیں کریں گے، یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ رشتہ دار جو موقف بھی اختیار کرے مگر والدین کو بچے کو یہ نہیں محسوس ہونے دینا چاہیے کہ گویا وہ اس رشتے دار سے بچے سے محبت وتعلق میں مقابلہ آرائی یا منافست کر رہے ہیں، کیوں کہ اس سے بچہ الجھن میں مبتلا ہوگا اور یوں سوچے گا کہ والدین اس پر اور اس کی زندگی پر اپنے آپ کو تھوپ رہے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ایک باپ اور ایک ماں کی حیثیت سے بچے کے نزدیک ان کا ایک خاص مقام ومرتبہ ہوتا ہے، اگر چہ بچہ عام طور پر صراحت کے ساتھ اس کا اظہار نہیں کرتا، اس لیے والدین کو گریز کرنا چاہیے کہ بچہ دوسروں سے تعلقات رکھنے کے سبب اپنے آپ کو گنہگار سمجھنے لگے، اس سے بھی بچنا چاہیے کہ والدین بچے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس طرح کوشش نہ کریں کہ بچہ سمجھ جائے کہ والدین ہمیں اپنی طرف مائل کرنے کے لے کوشاں ہیں، بلکہ والد کو چاہیے کہ وہ بچے کے ساتھ کچھ کھیل کود یا سیر وتفریح کا پروگرام رکھیں، کسی وقت والد بچہ سے اس طرح کی بات بھی ہنستے ہوئے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''ابا تو بوڑھے ہوگئے ہیں، آج کل بچوں کے پاس اپنے ابا کے لیے وقت ہی نہیں ہے''۔

دوستوں کے ساتھ تعلقات:

عمر کے اس مرحلہ میں دوستوں کے ساتھ بچے کے تعلقات امتیازی نوعیت کے ہوتے ہیں، کیوں کہ ان تعلقات کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، بسا اوقات یہ شروع ہوتے ہیں اور ختم ہوجاتے ہیں، ایک دوست کی جگہ دوسرا دوست تلاش کرلیا جاتا ہے، کبھی بچہ والدین سے بتاتا ہے کہ اس کا سب سے اچھا دوست ''عمر'' ہے، لیکن والدین کے لیے یہ بات باعث تعجب ہوگی کہ چند ہی دنوں بعد وہ کہتا ہے کہ اس کا سب سے اچھا دوست ''حسن'' ہے، عمر اب اس کی توجہ کا مرکز نہیں رہا، والدین کے لیے یہ بات بالکل بے فائدہ ہے کہ وہ بچے کو کسی ایک متعین بچے سے تعلقات رکھنے کا پابند کریں، اس کے برخلاف بچے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو برتنا ان کے ساتھ معاملات کرنا سیکھے، وہ سوچنا اور پھر اپنے ارادے پر جمنا سیکھے، والدین کو چاہیے کہ بچے کو دوسرے بچوں سے تعلقات رکھنے کی اجازت دیں اور ترجیح واختیار اس پر چھوڑ دیں۔

سات سال سے چھوٹے بچے عام طور پر چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور وہ بہت زیادہ اس کی تمیز نہیں کرتے کہ لڑکوں کے ساتھ کھیلیں یا لڑکیوں کے ساتھ، معاشرتی معیار واقدار کے اثر انداز ہونے سے پہلے ہی بچوں کو یہ احساس ہوجاتا ہے کہ لڑکے کو لڑکوں کے ساتھ اور لڑکی کو لڑکیوں کے ساتھ کھیلنا چاہیے،

عام طور پر سات سال کی عمر کے بعد بچے بچوں کے ساتھ بچیاں بچیوں کے ساتھ ہی کھیلنا پسند کرتی ہیں، بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ابتدائی سالوں میں بچے بچیوں کے ایک ساتھ کھیلنے کے سبب وہ توازن واعتدال کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں، اس لیے کہ جو (لڑکا/لڑکی) ضرورت سے زیادہ شرمیلے ہوتے ہیں وہ اگر ابتدائی سالوں میں ساتھ نہیں ہوتے تو وہ اس حال میں بڑے ہوتے ہیں کہ یا تو جنس مخالف سے یکسر کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں یا جب کبھی پہلی مرتبہ سابقہ پڑتا ہے تو شدید طور پر گھبراہٹ میں مبتلا ہوتے ہیں۔

جب بچہ اسکول جاتا ہے تو ابتدائی مرحلہ میں وہ ایسے بچوں سے دیرپا تعلقات بنانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کی عادات واطوار اور مزاج، اس کے پسند وناپسند میں قریب قریب اسی کی طرح ہوتے ہیں، عام طور پر بچے ان بچوں سے دوستی کرتے ہیں جو ان کے پڑوس میں رہتے ہیں، کیوں کہ وہ مسلسل ان کو دیکھتے رہتے ہیں، دونوں ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں، دونوں کے والدین کا معیار تقریبا یکساں ہوتا ہے، اس لیے اس مسئلہ میں دیگر کوششوں سے زیادہ موثر یہ ہے کہ والدین رہائش کے انتخاب میں ماحول اور پڑوسیوں کا خاص خیال رکھیں، کیوں کہ ماحول اور پڑوسی بچوں کے انتخاب دوست میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ اپنے سے بڑے بچے سے دوستی کرتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بچہ اپنی عمر حقیقی سے زیادہ پختہ ہو چکا ہے، وہ آگے بڑھ رہا ہے، لیکن اس طرح کی دوستیوں میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں، چنانچہ اگر دوستی بڑے بچوں سے ہے تو وہ اس کی کم عمری اور معصومیت کو غنیمت جان کر اسے بے سلوکی کی طرف لے جاتے ہیں، یا ان کے بڑے ہونے کے سبب بڑھے ہوئے امکانات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ ان کے سامنے اپنے اندر نقص کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے، عام طور پر احساس کمتری یا اپنے اندر نقص کا احساس تبھی پیدا ہوتا ہے جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ دوسرے لوگ جو کام کر رہے ہیں وہ اس کو انجام دینے سے قاصر ہے، یا دوسرے لوگ اس سے اس کام کی توقع کرتے ہیں جسے کرنے کی اس کے اندر صلاحیت وطاقت نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ احساس نقص پختہ اور ذہین بچے میں بھی اس وقت پیدا ہو جاتا ہے جبکہ وہ نامناسب ماحول میں ہوتا ہے، گھر میں سب سے چھوٹے بچے کے اندر بھی نقص کا احساس پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے، ایسے بچے میں بھی یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ اس کو اپنے سے زیادہ صلاحیت والے یا اپنے سے بڑے بچے سے منافست یا مقابلہ آرائی کے لیے ہمیشہ دوگنی محنت کرنی پڑے گی۔

اس کے برخلاف جو بچہ اپنے سے چھوٹے بچوں سے دوستی کرتا ہے، تو وہ اس طریقہ سے اپنے اندر پیدا ہو جانے والے نقص کے احساس سے نجات پاتا ہے، بلکہ اس طریقہ سے وہ اپنی کمی کے احساس سے راہ فرار اختیار کرتا ہے، اسی لیے وہ اپنے سے چھوٹے اور کم صلاحیت والے بچوں سے دوستی کرنے کی کوشش کرتا ہے، کیوں کہ اس کو اپنے ہم عمروں کے ساتھ چلنے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنی عمر کے مطابق نشو ونما سے محروم رہ جاتا ہے، پھر وہ اپنے ہم جولیوں سے دوری بناتا ہے اور ان سے ملنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔

اس طرح کے مسائل اور صورت حال میں ہم دوبارہ یہ وضاحت کریں گے کہ والدین کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ بچے کے لئے دوستوں کا انتخاب کریں، بلکہ ان کا کردار یہ ہے کہ وہ ایسے حالات میں بچے کی صحیح رہنمائی اور نشونما کے لئے وہ طریقہ اختیار کریں جو اس کا بدل بن سکتا ہو، مثلا اگر بچہ اپنے سے بڑے بچوں کے ساتھ رہتا ہے تو نظر رکھنا چاہیے کہ وہ بڑے بچے اس کا ستحصال واستعمال نہ کر سکیں اور اس کو کسی برائی میں نہ مبتلا کر سکیں، والدین کا بچے سے جو تعلق ہوتا ہے اس کی بنیاد پر وہ اس کی ذہنی نشونما اور آس پاس کے ماحول واقعات کو سمجھنے میں اس کا تعاون کر سکتے ہیں۔

اس کے برخلاف اگر بچہ اپنے سے کم عمر بچوں سے دوستی کرتا

ہے تو والدین کو چاہیے کہ اس کو مختلف ایسے کاموں کی رغبت دلائیں اور مختلف چیزوں میں مشغول کریں کہ جس سے اس کی توجہ اس جانب زیادہ ہو اور وہ ان چھوٹے بچوں کے پاس جانے سے بچ جائے، والدین کو اس کی بھی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ بچے کو یقین دلائیں کہ وہ اپنی عمر حقیقی کے مطابق چھوٹا نہیں ہے، اس کے لیے اس کے کھیل کود، اس کی کتابیں اور خالی اوقات کو گزارنے کے اس کے مختلف طریقوں کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ وہ اس کی حقیقی عمر اور اس کے نمو کے مناسب و موافق ہوں، چنانچہ وہ جس عمر میں ہے اس عمر کے مطابق اس کو ذمہ داریاں اور حقوق دینا چاہیے۔

جب بچہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھر آئے تو اہل خانہ کو چاہیے کہ ان کا استقبال کریں ان کی طرف اچھی طرح متوجہ ہوں، یہ طریقہ بچے کو ان کے ساتھ گھلنے ملنے میں مدد کرے گا، اگر ان بچوں میں سے کوئی بچہ گھر کے سامان سے کھلواڑ کرنے لگے یا شور شرابہ کرنے لگے، یا ہلڑ بازی کرنے لگے، یعنی وہ اس طرح کھیلے جو پریشان کن ہو، ظاہر ہے یہ چیز اہل خانہ کے لئے پریشان کن ہوگی، وہ اس سلوک کو اس لیے برداشت نہ کرسکیں گے کہ کہیں انھیں دیکھ کر ان کا بچہ ہمیشہ ہی گھر میں یہی رویہ نہ اپنانے لگے، اور اسی کا عادی بن کر رہ جائے، ایسے موقع پر ان بچوں کو بہت نرمی سے سمجھایا جاسکتا ہے اور اس طرح کے ہلر اور شور وشغب سے باز رہنے کی نصیحت کی جاسکتی ہے، مگر اس طرح کے جملے استعمال کرنے سے کلی طور پر گریز کرنا چاہیے کہ ''تم کو تمہارے گھر میں تمہاری ماں اس کی اجازت دیتی ہوں گی مگر ہم یہاں اس کی اجازت نہیں دے سکتے'' یا یہ کہ ''ہم نہیں چاہتے کہ تم اپنا برا رویہ لے کر ہمارے گھر آیا کرو''، ایسے جملوں کے بجائے انتہائی سکون و اطمینان سے اس کے سامنے اپنی منشا ظاہر کر دینا چاہیے، ساتھ ہی اپنی منشا اور پسند کے اسباب بھی واضح کر دینا چاہیے، مثلاً: ''اگر بیٹا آپ اس طرح کی آوازیں نکال کر شور مچائیں گے تو ہم اپنا کام نہیں کرسکیں گے''، یا یہ کہیں کہ ''ٹھیک ہے! یہ کھیل آپ کے لیے پر لطف ہیں، لیکن یہ پریشان کن ہونے کے سبب گھر کے باہر کھیلے جاسکتے ہیں جہاں آپ کی آوازوں سے کسی کو تکلیف نہ ہو''، یا ''اگر آپ چاہتے ہیں یکہ ہم آپ دوست بن جائیں تو پھر ہمارے ساتھ اس انداز میں گفتگو نہ کریں''، یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عام طور پر جب بچہ گھر میں ہوتا ہے تو خاموش اور مطمئن رہتا ہے مگر دوستوں کے ساتھ ہونے کے سبب ذرا رویہ بدل جاتا ہے، اپنی ذمہ داری کا احساس کم ہوجاتا ہے، اس لیے جس سکون کے ساتھ اس کے دوستوں کو تنبیہ کی جائے اسی طرح اپنے بچوں کو بھی، حتی الامکان بچے کے دوستوں کے سامنے اس کی سرزنش یا اس پر سختی سے بچنا چاہیے، بالکل اس طرح سوچنا چاہیے کہ جب ہم خود اپنے بے تکلف دوستوں میں ہوتے ہیں تو بہت سے اصول اور معمولات طاق پر رکھ دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا وضاحت کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ نا قابل قبول سلوک کو برداشت کریں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ والدین بچے کے اس طرح کے تصرفات اور حرکتوں سے زیادہ پریشان نہ ہوں اور اس طرح کے رویہ کو برداشت کرنے کے لئے اپنی قوت برداشت میں اضافہ کریں، مقصد یہ ہے کہ کہیں اپنے بچے کے سلوک کے سبب اس کے دوستوں کی سرزنش نہ کی جائے، ظاہر ہے کہ جس طرح اس کے دوستوں کے اثرات اس پر پڑ رہے ہیں ٹھیک اسی طرح اس کا اثر ان پر ہوگا، چنانچہ اگر ان کے سامنے بچے کی سرزنش کی گئی تو اس سے وہ ان دوستوں کی نظر میں اس کا قد رچھوٹا ہو جائے گا، پھر اس صورت حال کے ازالے کے لئے اور دوستوں کی نظر میں اس کی سابقہ قدر و منزلت کی بحالی کے لیے کافی دقت درکار ہوگا، اس لیے اگر مداخلت کرنا ناگزیر ہو اور بچے کو کچھ کہنا ہی پڑے تو بہر حال اس کے دوستوں کی نظر میں اس کے اچھے مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے ہی کچھ کہا جائے، مثلاً اس سے کہا جائے: ''کیا پہلے آپ ہم سے وعدہ نہیں کر چکے کہ ہم لوگ اس طرح کا کام نہیں کریں گے''، یہ اس سے زیادہ اچھا ہے کہ اس سے کہیں'' ہم نے تم سے کہا نہیں کہ اس طرح کی غیر مناسب حرکتیں نہ کیا کرو''، درحقیقت جملوں کا انتخاب بہت اہمیت کا حامل

ہے، مثلاً صندوق پر کوئی بچہ چڑھ جائے تو اس طرح منع کرنا زیادہ بہتر ہے ''ارے بھائی صندوق پر کون ہے، بہتر ہے کہ اس سے اتر جائے، یہ تمہارا بوجھ نہیں برداشت کر سکتا''، بجائے اس کے کہ ''فوراً صندوق سے نیچے اتر واحمق کہیں کے، تم واقعی بہت پریشان کرتے ہو''، بچے کو غلط انداز میں بات کرتے دیکھا جائے تو اس طرح تنبیہ کی جائے ''آپ اس انداز گفتگو کے بجائے اس سے بہتر اور مناسب طریقہ گفتگو سے واقف ہیں'' بجائے اس کے کہ اس سے کہا جائے ''جب ہم تمہاری اس طرح سے گفتگو سنتے ہیں تو بڑا غصہ آتا ہے، پتہ نہیں تم کب سیکھو گے؟''

ممکن ہے کہ کبھی بچے سے اس سے زیادہ بات کرنی پڑے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ بچے کو الگ بلایا جائے اور اس کے دوستوں سے ہٹ کر تنہائی میں اسے سمجھایا جائے، ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی جائے کہ دیکھو تمہارے دوست نہ محسوس کر سکیں کہ کیا مشکل پیش آئی ہے، اس کو بتایا جائے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم اپنے دوستوں کے تئیں جذباتی ہو اور اپنے دوستوں سے ملاقات کو خوش نصیبی سمجھتے ہو، اس لیے ہم نہیں چاہتے ہیں کہ تمہارے دوستوں کے سامنے تمہاری سرزنش کی جائے، ظاہر ہے کہ اس طرح وہ اس بات کو سمجھ جائے گا کہ اگر وہ اس طرح کا پریشان کن رویہ اپنائے گا تو پھر اس کے دوستوں کو گھر سے جانا پڑے گا، والدین کو چاہیے کہ اس طرح تنہائی میں بچے سے بات کرنے کے بعد اس سے کہیں کہ جاؤ اپنے دوستوں کو باورچی خانے میں بلا لاؤ اور انھیں کچھ کھلاؤ پلاؤ (ہلکا پھلکا جو بھی میسر ہو) اس عمل سے فوری طور پر وہ سب کے سب پرسکون ہو جائیں گے اور اس شور شغب اور ہیجانی قسم کے چیخ پکار والے کھیل سے باز آجائیں گے، ساتھ ہی والدین کے پاس سے بچے کا دوستوں کے پاس واپس جانا بھی آسان ہوگا، کیوں کہ وہ جائے گا اور کہے گا مثلاً ''اماں آپ لوگوں کو جوس پینے یا شربت پینے کے لئے بلا رہی ہیں''۔

کوشش کرنا چاہیے کہ اس طرح کے جملوں سے اس کے دوستوں کی تادیب و تنبیہ نہ کی جائے مثلاً ''میں اپنے بچے کو اس طرح کے کھیل کی اجازت نہیں دے سکتا''، اس کے دوست ایسے جملوں پر سوچیں گے کہ اس کی آزادی محدود اور اس کی نشاط مقید ہے، پھر وہ بعد میں اس کا مذاق بنائیں گے، اسے چھیڑیں گے اور اس کی چڑ بنائیں گے۔

اگر اس کے دوست شام ڈھلے اس کو گھر سے باہر کھیلنے بلائیں تو ان سے یہ کہنے کے بجائے کہ ''میں بچے کو اس وقت کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا'' اس طرح کہا جائے ''اب دیر ہو چکی ہے، اس وقت آپ لوگوں کا گھر سے باہر کھیلنا مناسب نہیں'' یا ''شام ڈھلنے کے بعد بچوں کا باہر کھیلنا مناسب نہیں''، اس طرح صرف اپنے بچے کو نہیں منع کیا جائے گا بلکہ اس کے تمام ہم عمر دوستوں کو منع کر دیا جائے گا، اس طرز سے یہ تو ممکن ہے کہ اس کے دوست یہ رائے قائم کریں کہ آپ تربیت میں ذرا سخت ہیں مگر وہ یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ یہ ممانعت محض آپ کے بچے کے لیے خاص ہے۔

عام طور پر بچے مسلسل تعلقات بنائے رکھنے اور دوستیاں نبھانے پر حریص ہوتے ہیں، مگر اس کے باوجود ان کی دوستی وقتاً فوقتاً ختم ہوتی رہتی ہے، تعلقات منقطع ہوتے رہتے ہیں، عمر کے ابتدائی دس سالوں میں دیکھا گیا ہے کہ بچیاں بچوں کے مقابلے میں دوستی کے انقطاع سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں، بلکہ بسا اوقات تو وہ کسی تکلیف اور بخار وغیرہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں، لیکن بالآخر وہ اس کی عادی ہو جاتی ہیں، اس کے بالمقابل بچوں کی طرف سے کسی دوست سے تعلقات ختم ہونے پر ری ایکشن اور شدید تاثر کا اظہار ہوتا ہے، والدین کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسے موقع پر بچہ جلدی غصہ ہوتا ہے اور کبھی روتا بھی ہے، اس طرح کی صورت حال میں بسا اوقات اہل خانہ زندگی کے اونچ نیچ اور تجربات کی روشنی میں بچے سے کچھ ایسی گفتگو کر بیٹھتے ہیں جس سے اظہار ہوتا ہے کہ گویا نہ تو وہ اس کے پریشان ہونے کو اہمیت دے رہے ہیں اور نہ ہی اس کے حقیقی جذبات کو سمجھ رہے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں:

''ارے بھائی تم کو اس طرح متاثر نہیں ہونا چاہیے، کوئی یہی لڑکا تو دوستی کے لیے ہے نہیں، چھوڑو اسکو! اس کے علاوہ دسیوں

لڑکے ملیں گے تم کو دوستی کے لئے ،تم ان سے دوستی کر لینا''۔

اس طرح کی گفتگو بچے کو تردد میں مبتلا کر دے گی کہ اس کے والدین اس کے تعلقات اور اس کی دوستی سے کس قدر لاتعلق اور بے پرواہ ہیں، اس کی مشکلات پر کیسی بے پروائی سے جواب دے رہے ہیں، اسی لیے ایسے موقع پر بہتر ہے کہ اس سے اپنے کسی خاص تجربہ کی روشنی میں گفتگو کی جائے مثلا اس کے سامنے اپنے کسی دوست کی جدائی اور فراق سے ہوئی تکلیف وغم کو بیان کیا جائے''۔

والدین کو کوشش کرنا چاہیے کہ بچہ دوستی اور تعلقات کی جن مشکلات کا ذکر کرے اس کو سنیں اور اس سے واقف ہوں، اگر اس دوران وہ اپنے دوست کے سلوک پر نقد کرے تو اس کو نقد کرنے دینا چاہیے، کیوں کہ اگر والدین نے یہی کام کیا تو ان کے لئے سخت حیرت کی بات ہوگی کہ جیسے ہی وہ دوست کے رویہ پر نقد کریں گے بچہ اس کے دفاع پر آمادہ ہوجائے گا، بچے کا موقف کبھی بھی واضح نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے احساسات بہت گہرے ہوں گے، بلکہ دراصل وہ اپنے دوست کی محبت اور اس سے لڑائی کی درمیانی کیفیت سے دو چار ہوگا، چنانچہ اس کو اس مرحلہ سے گزر جانے کے لئے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ وہ اپنے احساس وموقف کی حقیقت سے واقف ہو سکے، اور اسے ادراک ہو سکے کہ تعلقات کے انقطاع کی کتنی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اور کتنی اس کے دوست پر، جبکہ اکثر و بیشتر خطا دونوں کی ہی ہوتی ہے۔

اس کی ضرورت نہیں کہ بچے کو نئی دوستی قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے تاکہ وہ منقطع ہوئے تعلق کو بھول سکے، کیوں کہ وہ خود جب اس افتراق وجدائی کے غم سے چھٹکارا پائے گا تو مناسب وقت میں اپنے موافق دوست تلاش لے گا، کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ اسی دوست سے انقطاع کے بعد دوبارہ دوستی کر لیتا ہے، اور دوبارہ تعلقات پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں، بہر حال اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ والدین بچے کے ان تعلقات ومفید تجربات کو قطعا ہلکا پھلکا نہ سمجھیں اور نہ ہی اس کی اہمیت کو کم سمجھیں، کیوں کہ یہی تعلقات وتجربات اس کو مستقبل میں ایسے تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار کرتے ہیں جو زیادہ مضبوط اور دائمی ہوں۔

دو جنسوں کے درمیان تعلقات:

سِنِ تمیز کو پہنچنے سے قبل جو کہ عام طور پر ۹ سال کی عمر سمجھی جاتی ہے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ فطری طور پر بغیر کسی احساس کے کھیلتے ہیں، لیکن پھر سن بڑھنے کے ساتھ ہی معاشرتی پابندیاں عائد ہونے لگتی ہیں اور لڑکے لڑکی ہر ایک کو جنس مخالف سے تعلقات کی نوعیت سے آگاہ کیا جاتا ہے، سن تمیز کو پہنچنے کے بعد فطری طور پر بچے ان بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں جو ان کے ہم عمر ہوں، ان کے ہم جنس ہوں اور ان کی دلچسپیوں سے موافقت رکھتے ہوں، اور اکثر و بیشتر لڑکے لڑکوں کے ساتھ اور لڑکیاں لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی ہیں، بہتر یہ ہے کہ ہم بچے کے سامنے جنس مخالف سے تعلقات کو ایک پیچیدہ امر اور مشکل بنا کر نہ پیش کریں، کیوں کہ عام طور پر خاندانی، معاشرتی اور اسکولی ماحول میں ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے اور بچہ بچی سے بولتا اور بات کرتا ہے، اور بچی بچے سے بغیر کسی جذبہ اور بغیر کسی پیچیدگی کے بات چیت کرتی ہے، بشرطیکہ اخلاقی قواعد وضوابط کا گھر خاندان میں پہلے سے ہی چلن ہو اور بچوں کے سامنے انھیں واضح کر دیا گیا ہو۔

بچے اور بچی کی نشو نما کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ دونوں کے سامنے انسانی زندگی میں ان کے کردار کی وضاحت کر دی جائے اور انھیں ان کی اخلاقی اور عملی ذمہ داریاں ازبر کرادی جائیں، دونوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے معاشرے میں رائج جن اخلاقیات سے واقف ہوں ان پر عمل کریں۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

نام کتاب:عصر حاضر اور نظریہ جہاد

مرتب: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

صفحات: ۱۴۴، قیمت:۸۰

ناشر: نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

عہد حاضر کے سلگتے ہوئے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع ''جہاد'' ہے، جب سے دہشت گردی کو مغرب نے اپنی ناپاک کوکھ سے جنم دیا تب سے ہی یہ موضوع بھی اپنوں اور غیروں کی کرم فرمائی سے خلط مبحث کا شکار ہوگیا۔ عالم اسلام کی سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور عسکری پستی اور ذہنی وفکری غلامی نے نہ صرف اس موضوع پر سوچنے اور لکھنے کو ہی دہشت گردی کے مرادف قرار دے دیا بلکہ مغرب سے مرعوبیت یا ناقل فہم مصالح نے جہاد کی ایسی تاویلات کرنے پر مجبور کردیا جو کبھی کمزور، کبھی فاسد، کبھی بے بنیاد اور کبھی علمی و فکری خطا پر مبنی ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ جس طرح دہشت گردانہ کارروائیوں کو جہاد کا نام دینا ظلم ہے اسی طرح فریضہ جہاد کی بے سروپا تاویلات کرنا بھی ظلم ہے، اسی طرح جہاد کی کوشش کو خارج از امکان قرار دینا، یا ہر کوشش کو غیر شرعی ثابت کرنا اور فریضۂ جہاد کے لیے ایسی شرطیں وضع کرنا جو قرآن وسنت وسیرت سے بعد از جد و جہد بھی مستنبط نہ کی جا سکیں، یہ بھی جہاد اور اسلام پر ایک ظلم ہے۔

جہاد دفاعی بھی ہوتا ہے اور اقدامی بھی، جہاد مظالم اور فتنوں کے خلاف بھی ہوتا ہے اور اصلاحی نقطۂ نظر سے بھی، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جہاد کا مقصد اصلی غلبۂ اسلام ہے، وہ اصلاح کا آخری طریقہ اور اصلاحی جد جہد اور اتمام حجت کی انتہاء ہے، اتمام حجت اور تبلیغ ودعوت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد آخری ہتھیار جہاد ہوتا ہے، قرآن وسنت کی بے شمار نصوص اس پر شاہد اور غزوات نبوی اس کے گواہ ہیں، جب جہاد کے مسلّم الثبوت معنی ومفہوم سے گریز واحتراز کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر لچر تاویلات کا سہارا لینا پڑتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر لوگ قرآن وسنت کو اپنے عقلی معیار سے دیکھنے لگتے ہیں، صریح نصوص سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، جو حدیث ان کے معیار عقل اور ان کے فہم قرآن کے معیار پر پوری نہیں اترتی اسے رد کر دیتے ہیں، یہی نہیں استخفاف حدیث ان کی تحریروں کا حصہ بن جاتا ہے، وہ ایک آیت یا ایک حدیث پر گفتگو کرتے ہیں مگر دانستہ (یا نادانستہ) طور پر اسی موضوع کی شارح دیگر آیات وروایات سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔

جہاد کو محض دفاعی کہنا یا محض ظلم کے خلاف ہی جہاد کی مشروعیت سمجھنا قرآن وسنت سے متعارض ہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے بیشتر حصے کو فراموش کرنے کے مرادف ہے، دنیا جانتی ہے کہ اسلام کی پہلی جنگ اقدامی تھی اور بے

سروسامانی کے عالم میں لڑی گئی تھی، اسلامی تاریخ کی اکثر جنگیں اقدامی جہاد پر مبنی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غزوات نبوی اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، جہاد کو محض دفاعی قرار دینا، محض ظلم کے خلاف قرار دینا، اس کے لیے یہ شرط لگانا کہ جہاد تب ہی ہوگا جب ظالم حملہ آور ہو جائے، عہد مکی کے حکم کو ہر صورت حال پر چسپاں کرنا، عہد مدنی کے احکام کو یکسر فراموش کر دینا، احکام جہاد کے بیان میں قرآن مجید کی صراحت و مرحلہ واریت سے اعراض کرنا بڑی جرأت کی بات ہے، مگر یہ جرأت لوگوں نے کی ہے اور بڑے دھڑلے سے کی ہے، اہل مغرب کرتے تو کرتے، مگر اس مذہب کے پیروکاروں نے کی ہے جس کے نبیؐ ہمہ وقت شوق شہادت میں سرشار رہتے اور اسی کی تلقین کرتے:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کسائی

اسلامی تاریخ میں پیش آنے والی جنگوں کو خوں ریزی کی مہم قرار دینے کا کام مستشرقین نے شروع کیا، مسلمانوں کو خوں خوار ثابت کیا، اسلام کے نظریہ جنگ و جہاد کو موضوع بنایا اور جم کر اس کی تنقید کی، جھوٹ کو اس کثرت سے بولا کہ لوگ اسے سچ سمجھنے لگے، خود مسلمان اپنی تاریخ پر افسوس کا اظہار کرنے لگے، تجدد کے مارے تو ماتم کرنے لگے، ان بے چاروں کو عین حالت جنگ میں بھی مسلمانوں کی مذہبی رواداری کی روشن تاریخ کے واقعات سے بھی کوئی راحت و رہنمائی نہ ملی، مسلمانوں کی جنگوں کا یہ امتیازی پہلو ہے کہ انھوں نے ہمیشہ جنگیں فوجی ٹولوں یا نیم فوجی دستوں سے کیں، عوام پر نشہ فتح و تسلط میں کبھی ظلم نہ ڈھایا، اگر اس کے برخلاف کچھ واقعات ہیں تو اس سے اسلام کے نظریہ جہاد پر سوالیہ نشان نہیں لگایا جاسکتا، کیوں کہ ان کی حیثیت لا قانونیت اور ظلم و جور کی ہے، پھر ایسے واقعات دال میں نمک کے برابر ہیں، اور اگر ان کا تقابل دیگر قوموں کی جنگی تاریخ سے کیا جائے تو ان کے مظالم کے سامنے یہ واقعات بے حیثیت نظر آئیں گے۔ عیسائیت کے نظریہ جنگ کو پڑھیے اور پھر کلیسا کے مظالم کا مطالعہ کیجئے، بدھ مت کے پیام امن و آشتی پر سر دھنیے اور پھر ان کی طرف سے کی جانے والی نسل کشی کے واقعات کو دیکھیے، یہودیوں کا کیا کہنا کہ وہ ظلم کے رسیا اور خوگر جبر و جور ٹھہرے، بہرحال جو مہم مستشرقین نے چھیڑی تھی اس میں مسلم دانشوروں نے بھی شرکت کی، موٹی موٹی کتابیں وجود میں آئیں، سرسید و محمد عبدہ سے مہم کا آغاز ہوا اور تا حال جاری ہے، کسی نے کلی طور پر جہاد کو دفاعی قرار دیا تو کسی نے جزئی مسائل میں اختلاف کیا، کسی نے کلی طور پر روح جہاد کو ہی نابود کر دینے کی ٹھان لی تو کسی نے جہاد کی تعبیر و تشریح میں ایسی شرطیں وضع کر ڈالیں جن کا قرآن وسنت سے نہ صرف یہ کہ رشتہ نہیں بلکہ دور دور تک نہ ان کی تکمیل کی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں اور نہ مستقبل میں امید، ان حضرات کے جواب میں صحیح موقف کو واضح کرنے والی کتابیں بھی وجود میں آئیں، عربی کا دامن اس سے خوب، مالا مال ہے اور اردو میں بھی ایسی تحریریں خوب موجود ہیں، زیر نظر کتاب بھی اس سلسلہ زریں کی ایک کڑی ہے، اس موضوع پر لکھنے والوں نے خوب لکھا ہے اور احقاق حق کا واقعی حق ادا کیا ہے، یہ کتاب بھی نقد و استدراک پر مبنی مقالات پر مشتمل ہے، اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے صحیح موقف پیش کرتی ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل جہاد کی بے سروپا تاویل اور روح جہاد کو مغلوب کرنے نیز اسلام کے نظریہ جہاد بلکہ محکم حکم پر

آزادانہ گفتگو اور خود ساختہ دلائل کا انبار لگانے والوں کی خدمت میں ایک موٹی سی بات عرض ہے، ظاہر ہے کہ جہاد کی اصل علت غلبہ کفر وشرک کو مغلوب کرنا ہے، اور یہی وہ علت ہے جو غزوات نبوی کی روح، صحابہ کرام کی قربانیوں کی بنیاد اور تاریخ اسلامی کی بیشتر جنگوں کا سبب ہے، یہی وہ علت ہے جس کو اچھی طرح سمجھ کر مستشرقین نے اسلام کے نظریہ جہاد کو موضوع بنایا اور اسلام کے ماننے والوں اور ماضی کے مجاہدین کو خونخوار قرار دیا، دعوے کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر اسلام میں صرف ''دفاعی جہاد'' کی تعبیر ہوتی تو مستشرقین کو اتنی محنت نہ کرنی پڑتی، جہاد کے خلاف اس قدر پروپیگنڈہ نہ کرنا پڑتا، کیوں کہ تصور جنگ کون سا مذہب ہے جس میں موجود نہیں؟ اگر یہی تصور اسلام میں بھی تھا تو اس پر اعتراض کیسا، مگر اسلام میں جہاد اقدامی بھی ہے اور وہ غلبۂ اسلام کے لیے مشروع ہے، اسلام قیامت تک کے لیے اور سارے عالم کے لیے ہدایت اور آخری ہدایت ہے، اس کا تصور جنگ بھی ہدایت کو عام کرنے کا آخری ذریعہ ہے، اسی لیے اس کی ایک خوفناک وخطرناک تصویر کشی کی گئی، نہیں کہا جاسکتا کہ جن لوگوں کا تصور جہاد ایسا مریض ہے وہ تاریخ اسلام کی بیشتر جنگوں کو خوں ریزی سمجھتے ہیں یا فساد فی الارض سے تعبیر کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اغیار تو ان جنگوں کو بلکہ فتح بیت المقدس اور صلاح الدین ایوبی کی جنگوں کو بھی خونخوار مہم ہی شمار کرتے ہیں، احکام کا ثبوت ، ان کا وجود، ان کی مشروعیت اور ان پر عمل اور بات ہے، جو احکام محکم اور مسلم الثبوت ہوں گے ان کا نفاذ ہوکر رہے گا، یہ اور بات ہے کہ ہر ایک حکم کے نفاذ کے مراحل ہیں، آداب ہیں، شرائط ہیں اور قرآن وسنت میں کھول کھول کر بیان کیے گئے ہیں، مرعوبیت یا عصری مصلحت کی بنا پر کسی حکم شرعی کی ایسی تاویل نہیں جاسکتی جس سے وہ حکم ہی کالعدم قرار پائے یا اس کی اصل روح ہی ختم ہوجائے، جہاد کے مقصد اصلی کا انکار اور اس کے معنی ومفہوم کی نئی نئی توضیح کرنے والوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام کے اصل تصور جہاد کو اکثر مفسرین وشارحین حدیث اور اکثر فقہاء نے ویسے ہی پیش کیا ہے جس کی عملی مثال سیرت نبوی میں ملتی ہے، لہذا عصری مصالح کے پیش نظر تحفظات اختیار کرنا اور بات ہوگی مگر حکم اور روحِ حکم کی تاویل فاسد قابل احتساب جرأت قرار پائے گی، اور اس ''تصور جدید'' سے نہ صرف جہاد اور روح جہاد پر زد پڑے گی بلکہ اکثر علماء اسلام کے فہمِ قرآن وفہمِ حدیث اور فقہاء کی فقاہت بھی زد میں آئے گی۔

زیر نظر کتاب بڑے نازک وقت میں منظر عام پر آئی ہے، اس کو ترتیب دینے کا کارنامہ پروفیسر محسن عثمانی نے انجام دیا ہے، وہ قابل مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں مگر ان سے زیادہ شکریہ کے مستحق وہ اہل قلم ہیں جن کے مضامین اس کتاب کی زینت ہیں، جنہوں نے بہ نظر غائر مختلف شخصیات کے افکار کا مطالعہ کیا اور بھرپور استدراک کیا، مضبوط دلائل جمع کیے، اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کا حجم کم ہونے کے باوجود اس کا علمی وزن بہت زیادہ ہے، اس موضوع کے بیشتر دلائل اس کتاب میں آگئے ہیں، شخصیات کے تعدد اور موضوعات کے تنوع کی بنا پر اس فکر کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو اس میں جمع ہوگئی ہے، بہت شدت سے کسی ایسی کتاب کی آمد کا انتظار تھا جو روحِ جہاد پر غبار ڈالنے کی کوششوں کا طاقتور رد کرسکے، خوشی کی بات ہے کہ اس کتاب نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کردیا، اس میں موجود مختصر مقالات نے فریقِ آخر کی ضخیم تصنیفات کے ہلکے پن اور ان

کے دلائل کے کھوکھلے پن کو واضح کر دیا، اس میں دس مقالات ہیں جو الگ الگ شخصیات کی تصنیفات، تحریروں اور افکار ورجحانات کے نقد واستدراک پر مشتمل ہیں، جس طرح بعض مقالات کے لہجے پر کلام کی گنجائش ہے، اسی طرح بعض اصحاب مقالات کے استدلال یا طرز استدلال پر بھی گفتگو ہوسکتی ہے مگر نفس موضوع اور اصل فکر وخیال تو مسلم ومستند ہے جس پر گفتگو بے سود و بے جان ہے، ہاں کسی خاص واقعہ، مقام، ملک اور حالات کے پس منظر میں اس طرح کی علمی بحثوں کی بہرحال گنجائش باقی رہتی ہے، لیکن دور سے تماشائی رہ کر کسی ملک کے حالات سے یکسر بے خبر ہوکر یا ثانوی ذرائع معلومات کے سے کسی خطہ میں ہونے والی کارروائی یا کسی تنظیم پر حکم لگانے کے لئے تصور جہاد پر ہی حکم لگا دینا دانشمندانہ عمل نہیں کہا جا سکتا، بہرحال ضرورت ہے کہ اس کتاب کا علمی حلقوں میں استقبال کیا جائے اور اس کے مطالعہ سے صحیح تصور کو عام کیا جائے۔

☆☆☆

نام کتاب: آسان ترجمہ وتفسیر قرآن مجید (دوجلدیں)

ترجمہ وتفسیر: محترمہ محمود النسا بیگم مرحومہ

تحقیق وتعلیق: مفتی محمد سراج الہدی ندوی

صفحات: جلد واول ۶۸۸، جلد دوم ۹۹۶

ناشر: محترمہ خیر النساء بیگم صاحبہ مع آل اولاد

رابطہ: 9849085328

زیر نظر ترجمہ وتفسیر اس حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ کسی خاتون کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے، فقہ وحدیث اور ادب وتاریخ میں تو بے شمار خواتین کے نام ماضی وحال کی تاریخ میں نمایاں طور پر ملتے ہیں، مگر عام طور پر لوگوں کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا مکمل ترجمہ اور مکمل تفسیر تو مردوں کا ہی کارنامہ رہا ہے، اور عورتیں اس سے قاصر رہی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں بھی خواتین مردوں سے پیچھے نہیں ہیں، ''آسان ترجمہ وتفسیر قرآن'' ایک خاتون اسلام کے قلم سے نکلا ہے، جس کی اپنی خصوصیات ہیں، محترمہ محمود النساء بیگم (۱۸۹۸ء-۱۹۶۵ء) نے اپنے عہد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آسان اسلوب میں تفہیم قرآن کے لیے یہ خدمت انجام دی، یہ ترجمہ عرصہ سے ناپید تھا، ہندوستان کے مشہور کتب خانوں میں بھی نہ تھا، البتہ ایک تحقیق کے مطابق اس کا ایک نسخہ کراچی یونیورسٹی کی لائبریری میں تھا، بہرحال اس ترجمہ کو مزید قابل استفادہ بنا کر عصری معیار کے مطابق منظر عام پر لانے کی سعی مشکور جواں سال فاضل مفتی سراج الہدی ازہری نے کی ہے جو ہر طرح لائق مبارکباد اور اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔

محترمہ محمود النساء ان معدود خواتین میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کو ادا کرنے کی توفیق دی بقول محقق ''ایک علمی وتحقیقی جائزے کے بعد راقم سطور یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہے کہ ابھی تک مکمل قرآن کریم کے جتنے بھی ترجمے وتفاسیر کسی بھی زبان میں منظر عام پر آئے ہیں، وہ مرد حضرات کے قلم سے ہیں، ہاں! علمی دنیا میں ابھی تک تین خواتین کے نام آئے ہیں جنہوں نے پورے قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر پیش کیا ہے، جن ہیں سب سے پہلا نام محمود النساء بیگم کا ہے، دوسرا نام زینب الغزالی کا ہے، اور تیسرا نام ثریا شحنہ کا ہے'' (کتاب ہذا ج ۱ ص ۹)

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس کے علاوہ بھی خواتین ہیں

جنھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے، تلاش وجستجو اور علم وتحقیق کی حیثیت بحر ناپیدا کنار کی ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں، چنانچہ ابھی ایک تازہ تحقیق ہوئی ہے، جو ہنوز منظر عام پر آنے کی منتظر ہے، البتہ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی صاحب نے اس کا تعارف ضرور کرایا ہے، یہ تحقیق پیش کرنے والی بھی ایک خاتون ڈاکٹر ندیم سحر عنبریں ہیں، جنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامیات سے ''تفسیر وعلوم قرآنی میں خواتین کی خدمات'' پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے، ان کی تحقیق کے مطابق مذکورہ بالا تین خواتین کے علاوہ نائلہ ہشام صبری کی تفسیر المبصر لنور القرآن اردو سے ۱۶ جلدوں میں شائع ہوئی، ماجدہ فارس الشمری کی تفسیر التوضیح والبیان فی تفسیر أی من القرآن ۸ جلدوں میں شائع ہوئی، فوقیہ ابراہیم الشربینی کی تفسیر تیسیر التفسیر ۴ جلدوں میں قاہرہ سے چھپی، ترکی زبان میں سمرا کورون نے تفسیر القاری ۱۳ جلدوں میں تحریر کی، اس کے علاوہ اس تحقیق کے مطابق ایسی بھی متعدد خواتین ہیں جنھوں نے پورے قرآن کا ترجمہ کسی زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام کیا ہے اور بعض کرایا بھی ہے، ابھی حال ہی میں ۱۱۲ صفحات پر مشتمل خاتون مذکور کی ایک کتاب ''قرآنیات میں خواتین کے تحقیقی مقالات'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، جو اس موضوع پر معلومات کا خزینہ ہے اور جس کی حیثیت ایک علمی فہرست کی ہے، اس میں خواتین کے ۷۰۰ تحقیقی مقالات اور قرآن کی جزئی خدمات کا تذکرہ ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآن مجید دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو اپنی اصل حالت پر باقی اور محفوظ ہے، اس پر تحقیقات کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ ہے، ایک طرف معاندین اس کو موضوع بناتے نہیں تھکتے، عہد نبوی سے ہی وہ اس کی سحر بیانی اور اعجاز کو چیلنج کرنے لگے تھے، لیکن کل بھی انھوں نے منہ کی کھائی تھی اور آج بھی منہ کی کھاتے ہیں، عہد نبوی کے مشرکین تو اس کی اثر آفرینی اور ناقابل تسخیر اور عقلوں کو مسحور کرنے والے، دلوں پر تسلط جما لینے والے لفظی ومعنوی لسانی و بلاغی اعجاز سے واقف تھے، اسی لیے وہ آخری حربہ کے طور پر یہ کہتے تھے وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون (فصلت:۲۶) (ترجمہ: اور کافروں نے (اپنے لوگوں، اپنے چیلوں اور اپنے عوام سے) کہا: اس قرآن کو مت سننا، اور اس کے باب میں غل مچاؤ، (اس کے خلاف مہم چلاؤ) تاکہ تم غالب آسکو)، بالکل ایسے ہی جیسے یہود دین اسلام اور نبی اسلام کی حقانیت سے اپنی کتاب کی بنا پر واقف تھے جس کو قرآن نے بیان کیا ہے الذین آتینٰھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون أبناء ھم، وإن فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون (سورہ بقرہ:۱۴۶) (ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی، وہ اس کو (قبلہ کو اور رسول کو بھی) اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح یہ اپنے بیٹوں کو جانتے پہچانتے ہیں، لیکن ان کا ایک گروہ جاننے بوجھنے کے باوجود حق کو چھپاتا ہے)، مگر بغض وعناد، احساس شکست اور احساس برتری کے پیش نظر وہ تورات کی واضح بشارتوں کی فاسد و لچر توجیہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خبر تو ہماری کتاب میں دی گئی ہے مگر اس سے اس دین کا اتباع لازم نہیں بلکہ وہ کہتے تھے "ملحمة کتبت علینا" ہمارے لیے ایک جنگ مقدر کردی گئی ہے اور یہ خبریں ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لئے دی گئی ہے، عرب کے ایک بڑے فصیح و بلیغ نکتہ داں ونکتہ سنج کی قرآن مجید کے بالمقابل بے بسی و بے کسی کو خود قرآن مجید نے اس طرح بیان

کیا ہے کہ جب اس سے کچھ نہ بن پڑا تو اس نے کہا کہ یہ قرآن مجید تو جادو ہے انہ فکر وقدر فقتل کیف قدر، ثم قتل کیف قدرثم نظر، ثم عبس وبسر، ثم أدبر واستکبر فقال إن هذا إلا سحر یوثر، إن هذا إلا قول البشر (مدثر:۱۸تا۲۵)(ترجمہ:سوچ میں پڑا اور منصوبے بنائے، اس پر خدا کی مار پڑے، کیسے اندازے لگاتا رہا، پھر غور میں ڈوب گیا، اور منہ بسور لیا، اس کا چہرہ فق ہوگیا، پھر پیچھے پلٹا، اور تکبر کا رویہ اختیار کرتے ہوئے کہنے لگا: یہ ایک جادو ہے، جو کہیں سے نقل کیا جا رہا ہے، یہ تو انسان کا کلام ہے۔

ان ہی معاندین کی وراثت مستشرقین کے حصے میں آئی، ان سے جب کچھ نہ بن پڑا تو انھوں نے معنوی تحریف کی ایک مہم چھیڑی جس کے نتیجے میں خود مسلمانوں میں ایک جماعت وجود میں آئی جس نے قرآن مجید کے معانی و مفاہیم کی خود ساختہ اور بے بنیاد تاویلات وتوجیہات کا بیڑا اٹھا لیا، لیکن قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، اور اس کے بیان کے لئے جو تعبیر اختیار کی ہے، انا نحن نزلنا الذکر وانه له لحافظوں اس میں ''الذکر'' کی تعبیر بہت وسیع، مختلف جہتوں پر حاوی ومحیط ہے، چنانچہ قرآن مجید اس طرح لفظی ومعنوی ہر طرح کی تحریفات سے محفوظ کر دیا گیا ہے، اس کے محافظین، شارحین، حفاظ اور اس کی نشر واشاعت کا کام کرنے والے سب اسی ارشاد الٰہی کا بیان ہیں، بشارت ہے محترمہ مرحومہ اور ان کے ان اقرباء کے لیے جنہوں نے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کی اشاعت کا دوبارہ فیصلہ کیا، بشارت ہے مفتی سراج الہدیٰ کے لئے جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود قرآن مجید کی یہ گراں قدر خدمت انجام دی۔

ایک خاتون کے قلم سے یہ تفسیر یا دیگر خواتین کی تفسیریں اور ان کی قرآنی خدمات اسلام میں خواتین کی تعلیمی تحریک اور ان کے علمی وتصنیفی ودعوتی ذوق کی غماز ہی نہیں بلکہ مسلمان عورت کو تعلیم وتصنیف ودعوت اور تعمیر سماج سے بہت دور قرار دینے والوں کے لیے ایک طاقتور جواب ہے، جو مدلل بھی ہے، عملی بھی ہے اور مکمل بھی، مجھے نہیں معلوم کہ اس موضوع پر کام ہوا ہے یا نہیں مگر ذہن میں آتا ہے کہ یہ بھی تحقیق کا اہم موضوع ہے، ممکن ہے کہ کوئی محقق ''مذہبی کتابوں کی تفہیم وتعبیر وتشریح میں خواتین کی خدمات۔ ایک تقابلی مطالعہ'' پر قلم اٹھائے اور آئینہ دکھائے کہ دیگر مذاہب میں خواتین نے اس ضمن میں کیا خدمات انجام دی ہیں اور خواتین اسلام نے قرآنیات اور احادیث نبویہ کی کس قدر خدمت کی ہے، بالیقین یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ قرآن وسنت کی تعبیر وتفہیم وتشریح میں مسلمان عورت مرد سے پیچھے نہیں ہے اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ دیگر مذاہب میں اس کی حیثیت وہ نہ نظر آئے گی جو خاتون اسلام کی ہے، اس طرح اسلام میں خواتین کی تعلیمی تحریک اور ان کے علمی کام ومقام سے ہر طرح کا غبار صاف ہو جائے گا۔

جہاں تک اس ترجمہ وتفسیر کا تعلق ہے تو اس کا محرک محترمہ مرحومہ کے الفاظ میں یوں تھا:

''عربی نہ سمجھنے والوں کے لیے باترجمہ قرآن شریف بہت ہیں، مگر عربی کے احترام کی وجہ سے ہر کس وناکس کا ان کو چھونا یا پڑھنا، یا بے محل حمل ونقل، بے ادبی سے خالی نہیں، بے تکلفی سے ہر شخص پڑھ نہیں سکتا، دنیوی امور میں سینکڑوں دشوار گزار راستے انسان چلتا ہے، لیکن مذہبی امور میں ذرا سی مشکل مل جائے تو حیلہ جوئی کرتا ہے؛ اس لیے آسان سے آسان تر طریقہ سے مسلمانوں کی سمجھ میں اپنا مذہب آجائے، بس یہی گنہگار کا مقصد ہے، محض ان سہولتوں کا لحاظ کرنے اور نہ پڑھنے

کے عذرات کو دور کرنے کی غرض سے یہ ترجمہ لکھا گیا ہے، چنانچہ اس کی اشاعت کے جواز کا فتوی دار القضاء و دار الافتاء دار العلوم قادریہ عالیہ بدایوں سے حاصل کیا گیا۔ (مقدمہ مؤلفہ، بعنوان ''تمہید'')''

یہ ترجمہ جس دور میں کیا گیا اس دور کے اعتبار سے اس کی زبان اور اس کا اسلوب نہایت شاندار ہے، ترجمہ بامحاورہ ہے، محترمہ نے ترجمہ کے دوران بین القوسین میں مفید وضاحتیں بھی کی ہیں، جگہ جگہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ترجمہ کی زبان ایسی ہے کہ اگر قوسین کو حذف کر دیا جائے تو ان کی مختصر توضیحات کے سبب یہ ترجمہ بہترین ترجمانی قرار پائے گا اور تفہیم کے لیے مزید مفید ہو جائے گا، اس کے مختصر تفسیری حواشی حشو زوائد سے پاک اور عام انسان کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیے گئے ہیں، ترجمہ کی اپنی مسلّم حیثیت ہونے کے باوجود وضاحت کی گئی ہے اور مطالعہ سے بخوبی اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں شیخ الہند کے ترجمہ کو اور اس پر موجود حواشی کو پیش نظر رکھا گیا ہے، گویا اس طرح اس کو شیخ الہند کے ترجمہ کی تسہیل قرار دیا جائے تو کوئی حرج نہیں، جبکہ خود شیخ الہند کا ترجمہ شاہ عبد القادرؒ کے ترجمہ کی تسہیل قرار دیا گیا ہے، اس طرح یہ ترجمہ شاہ عبد القادر کے سلسلہ زریں کا تسلسل قرار پاتا ہے، اس ترجمہ کو خواتین کے تراجم و تفسیر میں صاحب تحقیق و تعلیق کے مطابق اولیت کا درجہ حاصل ہے، اس ترجمہ و تفسیر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا انداز عام فہم ہے، ترجمہ بہت آسان اور قریب الفہم ہے، تفسیر نہایت مختصر اور ضروری سمجھ کر ہی کی گئی ہے، غیر ضروری باتوں سے عوام کو دور رکھنے کا رویہ اپنایا گیا ہے، ہر جگہ تفہیم کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے، معتبر روایات سے استفادہ کیا گیا ہے، طوالت کا خوف نہ ہوتا تو بعض اقتباسات کے ذریعہ بات کو اور واضح کیا جاتا۔

اس اہم خدمت کو منظر عام پر لانے کے لئے تحقیق و تعلیق میں مفتی سراج الہدی نے کن پہلوؤں سے کوشش کی ہے، ضروری ہے کہ اختصار کے ساتھ یہاں ان کی کدو کاوش اور جدو جہد کو بشکل نکات پیش کر دیا جائے:

۱۔ تفسیری حواشی میں حوالہ جات کا فقدان تھا، محقق نے حوالہ جات لکھنے کا اہتمام کیا ہے۔

۲۔ بغرض ضرورت حواشی میں (ابو تکیی) کی صراحت کے ساتھ مفید اضافے کیے گئے ہیں۔

۳۔ مؤلفہ کے حواشی میں وارد لفظیات کی ضرورت کے مطابق علحدہ وضاحت کی گئی ہے۔

۴۔ سورتوں کا جامع اور مختصر تعارف پیش کیا ہے۔

۵۔ اس کے طبع اول میں نہ متن قرآن شامل تھا اور نہ آیات کے نشانات پر نمبرات تھے، محقق نے جمہور کے مطابق متن شامل کیا اور متن و ترجمہ دونوں جگہ نمبرات درج کیے۔

۶۔ کہیں کہیں عبارت میں کچھ ردو بدل اور اضافے بھی کیے ہیں، جو عبارت میں مزید حسن پیدا کرنے کی غرض سے کیے گئے۔

۷۔ غیر مانوس الفاظ کو تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔

۸۔ طویل حواشی کو آیات کے اعتبار سے الگ الگ کیا گیا ہے۔

۹۔ بعض ناقص حواشی کی تکمیل کی گئی۔

۱۰۔ بعض الفاظ کے قدیم رسم الخط کو اس عہد کے اعتبار سے تبدیل کیا گیا۔

۱۱۔ طبع اول کے برخلاف رموز کتابت کا اہتمام کیا گیا۔

اس طرح یہ خدمت فاضل گرامی نے انجام دی، البتہ اس میں سب سے اہم کام حواشی و تشریحات میں حوالہ جات

رقم کرنے کا کیا ہے، جس سے اس کے استناد و اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے، باقی جن پہلوؤں سے بھی انھوں نے محنت کی ہے وہ سب اہم ہیں، امید ہے کہ یہ ترجمہ عام ہوگا اور اب دوبارہ گمنامی کی دنیا میں نہیں جائے گا بلکہ اس کے دیگر ایڈیشن بھی نکلیں گے، یہ ترجمہ وتفسیر دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں ۶۸۸ صفحات ہیں، سورہ فاتحہ تا سورہ کہف اسی جلد اول میں ہے، جبکہ دوسری جلد ۹۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں سورہ مریم سے سورۃ الناس تک کا ترجمہ وتفسیر ہے، ابتدا میں تقریبا ۶۰ صفحات ایسے ہیں جن میں محقق کا مقدمہ، مولفہ کا تعارف اور پھر ان کا مقدمہ ہے، اس کے علاوہ اس پر نامور شخصیات کے مقدمات، تاثرات اور تقریظات ہیں، ابتدا میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا علمی وموضوعی مقدمہ ہے اور پھر ایک طویل سلسلہ ہے، تقریباً دس شخصیات کی تحریریں اور تقریظات وتاثرات ہیں، ممکن ہے کہ یہ طریقہ مفید و مستحسن ہو مگر راقم سطور اس کو علمی ذوق وعلمی منہج کے عین مطابق نہیں سمجھتا، بالخصوص کتاب کی ابتدا میں شامل تحریریں اگر علمی اور موضوعی نہ ہوں تو محض تبریک وتقدیس اور اعتماد واستناد کے لیے اس قدر کثرت و تعدد نہ قدیم کتب میں دیکھا گیا ہے اور نہ دور جدید کے علمی منہج ومزاج کے مطابق ہے، ہونا یہ چاہیے کہ ضروری تعارف و تمہید کے علاوہ خود صاحب کتاب وصاحب تعلیق وحواشی کا تفصیلی وعلمی مقدمہ ہو، پھر بھی ضرورت ہو تو کسی ایک دو علمی شخصیت کا موضوعی وعلمی مقدمہ مزید شامل کرلیا جائے، بقیہ اگر ضرورت ہو تو تاثرات وتقریظات اور تعارفی مضامین و تبصروں کو علحدہ ایک رسالے میں شائع کردیا جائے۔

☆☆☆

نام کتاب: ختم نبوت کا قرآنی تصور
مصنف: پروفیسر سید مسعود احمد
صفحات: ۱۴۴
سن اشاعت: مارچ ۲۰۱۷ء
قیمت: ۸۲ روپے
ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی
مبصر: محمد فرید حبیب ندوی

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ہی واضح ہے، عقیدۂ ختم نبوت سے بحث کرتی ہے، اور اسے قرآن کی روشنی میں ثابت کرتی ہے، اس کے مصنف پروفیسر سید مسعود احمد صاحب ہیں، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ کیمسٹری میں پروفیسر تھے اور اب ریٹائرڈ ہوکر علی گڑھ میں ہی مقیم ہیں سنا ہے کہ محترم کا درس قرآن بڑا موثر ودل نشین ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا خاتم النبیین ہونا قرآن واحادیث کے بہت سے دلائل سے ثابت ہے۔ پوری امت کا اس پر اجماع رہا ہے۔ اس طرح یہ مسئلہ جیسا کہ خود مصنف کتاب نے لکھا ہے ''یہ بنیادی اور اساسی نوعیت کا ہے، کسی مذہبی، مسلکی اور فقہی فکر کا نہیں جس میں اختلاف کرنے کی گنجائش اور اجازت ہو''۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی اس حیثیت پر دشمنان اسلام نے اول روز سے ہی حملے شروع کردیے تھے۔ خود آپ کی حیات طیبہ میں مسیلمہ کذاب اور سفاح نے نبوت کے جھوٹے دعوے کیے۔ اس کے بعد بھی مختلف ادوار میں دشمنوں نے آپ ﷺ کے اس منصب پر شب خون مارنے کی کوشش کیں؛ لیکن یہ سب کوششیں جلدی ٹھنڈی بستے میں چلی گئیں۔ مگر آخری دور میں مرزا غلام احمد قادیانی نے جو دعوائے نبوت کیا، اس نے انگریزوں کی پشت پناہی حاصل ہونے کی وجہ سے، ایک بڑے

طبقے کو اپنے جال میں پھنسالیا۔ اور ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد بھی یہ فتنہ نہ صرف زندہ؛ بلکہ پہلے سے زیادہ مستعد وسرگرم ہے۔

مسلم علماء ودانشوران شروع سے ہی اس فتنے کی بیخ کنی کی کوشش کرتے رہے ہیں، انھوں نے دسیوں تحریکیں قائم کیں، سیکڑوں تصنیفات لکھیں اور ہزاروں مقالات ومضامین تحریر کیے۔ ابھی کچھ سال پہلے جب فتنۂ قادنیت نے اپنا صد سالہ جشن منایا، تو ایک طرح سے اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی سنگین کا احساس دلایا۔ اس سے متاثر ہوکر اور خاتم النبیین علیہ السلام کی محبت سے سرشار ہوکر سید مسعود احمد صاحب نے بھی اس موضوع کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی اور ختم نبوت کا قرآنی تصور کے نام سے یہ بیش قیمت کتاب پیش کی۔ اللہ تعالیٰ ان کے جذبے کو قبول فرمائے۔

کتاب فی نفسہ عمدہ ہے اور مضمون پر پوری طرح حاوی ہے۔ البتہ اس عقیدے کے ضمن میں چند ایسے ضمنی مباحث بھی آگئے ہیں، جن کا موضوع سے براہ راست تعلق نہیں ہے؛ ایسے مضامین سے کتاب کی قدر وقیمت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ شروع میں عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں قرآن کے کلام الٰہی ہونے کو ثابت کیا گیا ہے اور اس کے لیے منطقی، نفسیاتی اور اور سائنسی پہلوؤں سے دلائل دیے گئے ہیں، پھر قرآن کی ربانی حفاظت کو ختم نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس میں ہدایت اور انسان کے مقصد وجود جیسے بعض پہلوؤں کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ اس کے بعد اصل موضوع کا بیان ہے جو تقریباً کتاب کے ۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ختم نبوت کو قرآنی وضاحتوں اور اشاروں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں اتنا عرض ہے کہ پیش کردہ اکثر آیات یقیناً تو اس موضوع کی دلیل بن سکتی ہیں؛ مگر کچھ ایسی آیات بھی پیش کر دی گئی ہیں، جو رسالت محمدی کی تو دلیل ہیں، لیکن ختم نبوت کی طرف ان میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ ایسی آیات کو بھی گھما پھرا کر اس عقیدے کے اثبات کے مقصد سے داخل کتاب کر دیا گیا ہے۔ بہرحال، یہ بحث کتاب کا جوہر اور مغز ہے۔ اس کے بعد ختم نبوت کے علمی، فکری اور حکیمانہ پہلوؤں کا تذکرہ ہے۔ پھر اس بحث سے متعلق چند سوالات وجوابات ہیں، آخر میں مسیح موعود اور تحریک قادیانیت نیز خروج دجال اور نزول عیسی ابن مریم پر گفتگو کی ہے، پھر آخر میں اس سوال کے ساتھ کتاب کو ختم کیا ہے کہ ''بانی قادیانیت اپنے کس دعوے کو قرآن سے ثابت کر سکے؟''۔ سب سے آخر میں خلاصۂ کتاب ہے۔

کتاب بہت سی خوبیوں کے باوجود زبان و بیان کی بعض فروگذاشتوں سے محفوظ نہ رہ سکی ہے اور غلطی وخطا سے کون مبرا ہے۔ ص ۵ پر اپنے و بیگانوں'' لکھا ہے، یہاں ''اپنوں اور بیگانوں''۔ ص ۱۰ پر ''قرآن کو دنیوی مسائل کا نجات دہندہ'' لکھا ہے۔ اس جگہ ''مسائل کا حل کرنے والا'' یا اس طرح کا کوئی جملہ ہونا چاہیے تھا۔ ص ۲۰ پر ''اہتمامی تنزیل'' کی تعبیر استعمال کی ہے جو عجیب لگی۔ اسی طرح کے کچھ اور بھی جملے یا الفاظ محل نظر ہیں۔ اسی طرح بعض جگہ املا کی بھی غلطیاں ہیں، ایک جگہ ''دعوی محض'' لکھا ہے، جبکہ صحیح املا ''دعوائے محض'' ہوگا۔ ایک جگہ ''کم زور'' لکھا ہے۔ درست املا ''کمزور'' ہوگا۔ رموز وعلامات میں بھی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔

ان تمام چیزوں کے باوجود کتاب قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی لینے والوں کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ کتاب کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مرکزی مکتبہ اسلامی سے چھپی ہے۔

☆☆☆